گنجینۂ گوہر

(خاکے)

شاہد احمد دہلوی

مکتبۂ نیا دَور کراچی ۵

بار اوّل ——— ۱۱۰۰
سنہ ۱۹۶۲ء
قیمت ——— چھ روپے
ناشر ——— مکتبۂ نیا دور کراچی ۵
طابع ——— مطبع سعیدی کراچی

فہرست

مقدمہ جمیل جالبی ۷
مولوی نذیر احمد دہلوی ۱۷
میر ناصر علی ۳۰
اُستاد بیخود دہلوی ۴۸
خواجہ حسن نظامی ۶۴
بشیر الدین احمد دہلوی ۸۰
مولانا عنایت اللہ ۹۹
مرزا عظیم بیگ چغتائی ۱۱۱
میراجی ۱۳۰
منٹو ۱۴۴

جگرؔ مراد آبادی ۱۵۵
حکیم کیفؔ دہلوی ۱۶۷
پروفیسر مرزا محمد سعید ۱۷۱
اُستاد بندو خاں ۱۷۸
ایم اسلم ۱۸۸
جوشؔ ملیح آبادی ۲۱۰
جمیل جالبی ۲۳۳
شاہد احمد دہلوی ۲۶۱

گنجینۂ
گوہر

مقدّمہ

یہ سطور لکھتے وقت میں سوچ رہا ہوں کہ "گنجینۂ گوہر" جیسی اچھی کتاب کو آخر مقدمہ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مقدمہ کی ضرورت تو وہاں پڑتی ہے جہاں مصنف نیا ہو اور اپنے فن اور شخصیت کے تعارف کا محتاج ہو۔ یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مقدمہ نگار تو ایک گمنام شخص ہے جسے خود تعارف کی ضرورت ہے اور صاحبِ کتاب ایک نامور ادیب ہے، جسے نہ کسی تعارف کی ضرورت ہے اور نہ تعریف و توصیف کی خواہش۔ وہ اپنی ادبی زندگی کے اس عروج پر پہنچ چکا ہے جہاں انسان شہرت اور ناموری کی خواہش سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ سوچتے سوچتے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ شاہد صاحب نے ساری عمر چھوٹوں کو بڑا اور بڑوں کو اور بڑا بنانے کا کام انجام دیا ہے۔ وہ جو کل گمنام تھے آج انہی کی بدولت نامور ہیں۔ غالباً مقدمہ کے لئے اس برصغیر کے سارے سقراط بقراط چھوڑ کر میرا انتخاب بھی انہوں نے اسی لئے کیا کہ میرا نام بھی اس بلند پایہ کتاب کی بیساکھیوں کے سہارے شہرت کے پَروں پر اُڑنے لگے گا۔ اسے میں ان کی خاندانی شرافت، ذاتی محبت اور پُرخلوص وضعداری

کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ شاہد صاحب سے میری ملاقات کو اب خیر سے پندرہ سولہ سال ہو گئے ہیں۔ اس عرصہ میں میں نے اُنہیں اور انہوں نے مجھے بہت قریب سے ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ ہر خوشی اور ہر غم میں ہم ایک دوسرے کے شریک رہے ہیں۔ لکھنا پڑھنا بھی میں نے ساقی سے شروع کیا۔ ساقی کے ادارہ میں بھی کئی سال تک شامل رہا۔ چار پانچ سال تک "باتیں" کے عنوان سے ہر ماہ ادبی کالم لکھتا رہا۔ اور یہ نام آج بھی ساقی کے ادارہ میں شامل رہتا اگر سرکاری ملازمت کا طوق میں اپنے گلے میں نہ ڈال لیتا۔ شروع ہی سے میری یہ خواہش تھی کہ شاہد صاحب ان تمام لوگوں کے حالات قلمبند کر دیں جن سے ان کی ملاقات ہوئی ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ شاہد صاحب کی حیثیت ادب میں اس سنگم کی سی ہے جہاں پُرانی اور نئی نسلیں آ کر ملتی ہیں۔ جب میرا اصرار بڑھا تو وہ راضی ہو گئے۔ کہنے لگے سب سے پہلے میں ان ناموں کی فہرست مرتب کر لیتا ہوں تاکہ لکھنے میں آسانی رہے اور کوئی نام ذہن سے محو نہ ہونے پائے۔ فہرست بنانے بیٹھے تو فہرست بنتی چلی گئی اور مکمل ہونے پر نہ آئی۔ جب تھک گئے تو نام گنے۔ معلوم ہوا کہ تین سو بہتر نام ہیں اور ابھی بہت سے باقی ہیں۔ کہنے لگے بتاؤ جمیل صاحب اتنے سارے لوگوں کے تاثرات میں کیسے لکھ سکتا ہوں۔ اگر لکھوں تو بھوکا مر جاؤں۔ اس لئے میں نے ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ اطلاعاً عرض ہے۔ میں نے فہرست دیکھی اور دلیل سنی تو قدری کر لی۔ آخر یہ کام اس افراتفری کے عالم میں ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ اس کے لئے تو وقت چاہئے۔ فراغت چاہئے اور شاہد صاحب ہیں کہ بے چارے صبح سے شام تک اپنے بھرے پُرے کُنبے کا پیٹ پالنے میں لگے رہتے ہیں۔ کبھی ترجمے کر رہے ہیں۔ کبھی فرمائشی مضامین لکھ رہے ہیں۔ کبھی فیچر لکھ رہے ہیں اور کبھی ریڈیو پر پکّے گانے گا رہے ہیں۔ پیٹ کا دوزخ تو

کسی نہ کسی طرح بھرنا ہی ہے۔ کئی ماہ بعد مجھ پر پھر دورہ پڑا میں نے پھر اصرار کیا۔ وہ راضی ہوگئے اور کہا کہ ان تین سو بہتر ناموں میں سے صرف بارہ شخصیتوں پر لکھ دوں گا اور باقی تین سو ساٹھ پر اس وقت لکھوں گا جب حالات سازگار ہوں گے۔ آج اس بات کو بھی آٹھ دس سال ہوگئے ہیں۔ ان کے حالات ویسے ہی ہیں جیسے کہ تھے۔ مملکتِ ادب میں ساری عمر گزار کر اب گا بجا کر پیٹ پالتے ہیں اور ہر وقت اس فکر میں گھلتے ہیں کہ کل کیا ہوگا۔ دلی میں تھے تو خوش حال تھے۔ جائداد بھی تھی اور چلتا ہوا کاروبار بھی۔ مزے سے کھا پی کر اور آرام سے گرمیاں مسوری، شملہ، کشمیر اور نینی تال میں گزار کر دس پندرہ ہزار خود بخود بچ جاتے تھے۔ یہ ذاتی باتیں میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ آپ بھی واقف ہو جائیں کہ ہمارے معاشرہ میں ادیب کا کیا انجام ہوتا ہے اور ساری زندگی ستم پیشہ معاشرہ اس پر کیسے کیسے مصائب اور ظلم ڈھاتا رہتا ہے اور یہ بے چارہ ادب کا دامن تھامے ان سب آفات و بلیات کو سہتا رہتا ہے۔ بہر حال میرے مسلسل تقاضوں کے بعد شاہد صاحب نے خاکے لکھنے شروع کئے۔ کبھی سال میں ایک اور کبھی دو سال میں ایک۔ ۵۰ء سے ۶۲ء تک بارہ سال کے عرصہ میں انہوں نے جتنے خاکے لکھے وہ اس کتاب میں یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر "نیا دور" میں شائع ہوئے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں۔

(۲)

اردو ادب میں خاکہ، مختصر افسانہ کی طرح، ایک نئی صنف ہے۔ اس سے پہلے ہمیں طویل سوانح عمریاں تو ملتی ہیں لیکن اُن کی حیثیت عام طور پر ادبی کم اور تاریخی زیادہ ہے۔ غالب کے فوراً بعد کے دور میں سوانح نگاری نے ایک خاص اہمیت حاصل کرلی اور حالی کی یادگارِ غالب، حیاتِ سعدی، حیاتِ جاوید، شبلی کی حیاتِ ابو حنیفہ، المامون اور الفاروق وغیرہ سامنے آئیں۔ یہ چیزیں مستقل تصانیف ہیں اور ان میں کسی ایک شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو ہر زاویۂ نظر سے دیکھا اور دکھایا گیا ہے۔ ان میں تاریخی اہمیت زیادہ اور کردار نگاری کا عنصر کم ہے۔ انگریزی ادب کے روز افزوں اثرات کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں کچھ ایسی مختصر سوانح عمریاں لکھی گئیں جن میں کسی ایک کردار کو صرف اس اعتبار سے دیکھا گیا کہ وہ انسان کی حیثیت سے کیسا تھا۔ اس میں ذاتی زاویۂ نظر اور ذاتی تاثرات کو دلچسپ واقعات کے ساتھ اس طور پر پیش کیا کہ اس شخصیت کے خدوخال اور کردار نمایاں ہو جائیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا خاکہ "ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی" اس سلسلے میں پیش رو کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ اتنا مقبول ہوا کہ اکثر اہلِ قلم نے اس کی طرف توجہ دی۔ مولوی عبدالحق نے "چند ہم عصر" لکھ کر فنِ خاکہ نگاری میں ایک بیش بہا اضافہ کیا۔ اس مجموعہ میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو نہ تو ادیب و شاعر ہیں اور نہ سیاسی اور سماجی اعتبار سے اعلیٰ مرتبہ۔ کوئی مالی ہے اور کوئی گمنام سا شخص۔ لیکن لکھنے والے نے جس طور پر اس کی شخصیت کے بانکپن کو دیکھا اور پڑھنے والے کو دکھایا تو نام دیو مالی کے کردار کی عظمت کے نقوش بھی دلوں پر ثبت ہو گئے۔ رشید احمد صدیقی نے "گنج ہائے گرانمایہ" لکھ کر مختلف ادبی و علمی شخصیتوں کو روشناس کرایا جس میں انہوں نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں واقعات جمع کرکے ایسی سنجیدہ چیزیں پیش کیں کہ ان کے پڑھنے سے جیتا جاگتا انسان (جو ہر وقت انسان رہتا ہے) سامنے آجاتا ہے اور وہ کام جو مصور اپنے موقلم سے نہیں کر سکتا تھا۔ صاحبِ قلم نے قلم سے کر دکھایا۔ اشرف صبوحی کی "دلی کی عجیب ہستیاں

بھی اسی سلسلہ کی اہم کڑی ہے۔ معمولی لوگ لیکن اپنے فن اور ہنر کے بادشاہ۔ اپنی وضع داری اور خصائل پر جان دینے والے اور اس پر اشرف صبوحی کی ٹکسالی اور نکھری ستھری زبان۔ اس مجموعہ کے پڑھنے سے قاری ایسی جیتی جاگتی ہستیوں سے متعارف ہوتا ہے کہ جنہیں مخصوص اوصاف کی وجہ سے فن کار کا نام دیا جاسکتا ہے۔ چراغ حسن حسرت نے "مردم دیدہ" میں اپنے جادو بیان قلم سے مزاح کے ساتھ ساتھ زندہ انسان پیش کئے ہیں۔ "دوزخی" لکھ کر عصمت چغتائی نے اس صنفِ ادب کو ایسی فنکارانہ چابکدستی سے استعمال کیا کہ یہ چیز افسانے سے قریب آکر افسانے سے زیادہ دلچسپ بن گئی۔ اس خاکہ کی تکنیک، اندازِ بیان اور زاویۂ نگاہ تیکھا اور غیر معمولی تھا۔ بہن نے بھائی پر لکھا۔ وہ چاہتی تو اسے فرشتہ بنا دیتی۔ اسنے بھیا کو دوزخی بتایا۔ لیکن پڑھنے والے کو اس دوزخی سے اتنا پیار ہو جاتا ہے کہ اس کی شخصیت کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے۔ اس خاکہ نے فن خاکہ نگاری کو حد درجہ متاثر کیا۔ اسکے بعد تو گویا یہ صنف ایسی مقبول ہوئی کہ رسالوں میں عام طور پر نظر آنے لگی۔ آج جب بھی کسی ادیب یا شاعر کا خاص نمبر نکالا جاتا ہے تو اسکے فنی پہلوؤں سے زیادہ اس کی شخصیت پر زور دیا جاتا ہے۔ "نقوش" نے دو ضخیم جلدوں میں اردو ادب کی ادبی و علمی شخصیتوں کے خاکے مرتب کر کے شائع کئے ہیں۔

یہاں یہ بات بے محل نہ ہوگی کہ خاکہ نگاری اور افسانہ کے بین بین مختصر افسانہ میں کردار نگاری کا سلسلہ شروع ہوا۔ افسانہ نگار عام زندگی میں کسی عام آدمی سے متاثر ہوا اور اسنے اس تاثر میں تخیل کی سحر کاریوں کا اضافہ کر کے ایک انسانی کردار پیش کر دیا۔ منٹو نے اس قسم کے بہت سے کردار مثلاً بابو گوپی ناتھ موبل

اور کالی شلوار کا شنکر وغیرہ اردو ادب کو دیئے۔ عصمت کرشن چندر اور دوسرے افسانہ نگاروں نے اسی قسم کے خاکہ نما افسانے لکھے۔ انتظار حسین کی اَن لکھی زرینہ" کا کردار بھی اسی صنفِ ادب سے تعلق رکھتا ہے۔ گویا خاکہ ایک ایسی صنفِ ادب قرار پائی جس میں کسی ایسے انسان کے خدوخال پیش کئے جائیں، کسی ایسی شخصیت کے نقوش ابھارے جائیں جس سے لکھنے والا خلوت اور جلوت میں ملا ہو۔ اس کی عظمتوں اور لغزشوں سے واقف ہو اور تمام تاثرات کو ایسے شگفتہ انداز میں پیش کرے کہ پڑھنے والا بھی اس شخصیت کی عظمت سے واقف ہو کر اسے ایک کردار کے طور پر قبول کرے جو ان تمام انسانوں سے ذرا سا مختلف ہو جن سے ہم اور آپ اپنی اپنی زندگیوں میں دو چار ہوتے ہیں۔ خاکہ نگاری میں قوتِ مشاہدہ، ماضی کے واقعات کو یاد کر کے پیش کرنے کا ڈھنگ اور ان سب واقعات کو اپنے زاویۂ نظر کی لڑی میں پرو کر خوبصورت ہار یا گلدستہ بنانے کا سلیقہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے خاکہ نگاری سیرت نگاری کے فن سے بالکل ایک الگ صنفِ ادب بن جاتی ہے۔ دراصل جدید خاکہ نگاری مختصر افسانہ سے بہت قریب ہے۔ اس نے مختصر افسانہ ہی سے واقعات و تاثرات کی ترتیب سیکھی ہے اور اپنے مزاج اور اندازِ نظر سے خود افسانہ کو متاثر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج مختصر افسانہ کی طرح خاکہ بھی ادب کی مقبول ترین صنف ہے۔

(۳)

آج کے خاکہ نگاروں میں جن لوگوں نے اچھے اور کامیاب خاکے لکھے ہیں ان میں شاہد احمد دہلوی کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی، عظیم بیگ چغتائی،

بیخود دہلوی، میر ناصر علی، جوشؔ ملیح آبادی، جگرؔ مراد آبادی اور استاد بندو خاں وغیرہ ایسے خاکے ہیں جو زمانے کی سرد گرم ہواؤں سے بے نیاز ہو کر ہمیشہ دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔ شاہد صاحب کا اپنا لب و لہجہ ہے۔ ان کا اپنا طرزِ بیان ہے۔ ان کی زبان ٹکسالی اور بامحاورہ ہے اور وہ واقعات کو اس طور پر ترتیب دیتے ہیں کہ بھرپور تاثر قاری کے ذہن کے نہاں خانوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ شاہد صاحب کے خاکوں کا ایک وصف، جو اردو میں خال خال نظر آتا ہے، یہ ہے کہ وہ انسان کو انسان سمجھتے ہیں۔ اسے فرشتہ نہیں سمجھتے۔ وہ اس کی کمزوریوں کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں جتنی اسکی خوبیوں کو۔ اسی لئے ان کے خاکوں میں ایک خاص قسم کی بے تکلفی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ بے تکلفی واقعات میں بھی ملتی ہے اور اندازِ بیان میں بھی۔ یہی وہ فنی خلوص ہے جو ان کے خاکوں میں اثر و تاثر کا جادو جگا دیتا ہے۔ بہت سے لوگ اس بے تکلفی پر ناک بھوؤں چڑھاتے ہیں لیکن اصل میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ پورا خاکہ پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن پر اس شخصیت کا کیا اور کیسا اثر قائم ہوتا ہے۔ کیا وہ انسان بتاشہ کی طرح بیٹھ جاتا ہے یا منارہ کی طرح بلند و بالا نظر آنے لگتا ہے۔ اگر تاثر بتاشہ کا ہے تو خاکہ نگار اپنے فن میں ناکام ہے۔ اگر اثر آفرینی منارہ کی ہے تو وہ کامیاب ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ان خاکوں کو پڑھئے تو آپ کو ان ساری شخصیتوں پر پیار آئے گا۔ یہ چھوٹے بڑے لوگ آپ کو اچھے لگیں گے اور دوسرے لوگوں سے ذرا مختلف بھی۔

شاہد صاحب کے خاکوں کی اثر آفرینی، مقبولیت اور دلکشی کا ایک سبب انکا اندازِ بیان اور طرزِ ادا ہے۔ ان کی نثر اس سایہ دار درخت کی سی ہے جس کے نیچے بیٹھ کر تھکا ماندہ مسافر تھوڑی دیر آرام کر سکے۔ جس کے میٹھے پھلوں کا ذائقہ ایک

طرف اس کی بھوک مٹا سکے اور دوسری طرف زبان کے چٹخاروں سے روحانی کیف حاصل کر سکے۔ میں شاہد صاحب کی نثر کو اسی ذائقہ اور چٹخارہ کے لئے پڑھتا ہوں تاکہ جدید نثر کے صحرائے اعظم کی تپش اور جھلسا دینے والی کڑی دھوپ سے کچھ دیر کے لئے عافیت پا سکوں۔ ان کی نثر میں مجھے خوشبو کا احساس ہوتا ہے۔ وہ خوشبو جو جدید نثر میں کہیں کہیں اور کبھی کبھی محسوس ہوتی ہے۔ ان کی نثر نہ صرف شگفتہ ہے بلکہ واقعات کے موتیوں کو بھی دل کے تار میں پروتی چلی جاتی ہے۔ ان کی عبارت میں نہ تو انگریزی کے الفاظ آتے ہیں اور نہ فارسی و عربی کے الفاظ شان و شوکت اور گھن گرج پیدا کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ محاوروں کا برمحل استعمال، روزمرہ کا صحیح تصرف اس طور پر ہوتا ہے کہ ہر لفظ زندہ اور جیتا جاگتا محسوس ہوتا ہے۔ جو آپ سے بات کرتا ہے۔ آپ کو تھپکتا اور جھنجھوڑتا ہے اور الفاظ کے ذریعہ خیال و احساس کی پوری تصویر پڑھنے والے کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔

زبان کا صحیح استعمال اور محاوروں کو برتنے کا سلیقہ ان کا خاندانی وصف ہے۔ شاہد احمد دہلوی کی نثر میں 'دلی اسکول' کا وہ سارا بانکپن موجود ہے جو ہمیں الگ الگ ڈپٹی نذیر احمد اور محمد حسین آزادؔ کے ہاں نظر آتا ہے۔ آزادؔ کی نثر میں استعاروں کی کثرت ہے۔ وہ ایک بات کو کئی کئی استعاروں کے ذریعہ خوبصورت توازن کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ ان کی عبارت رنگین اور تخیل کے زور سے شگفتہ ہو جاتی ہے۔ نذیر احمد محاوروں کو کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ ان کی نثر صاف، طرزِ بیان رواں اور بے ساختہ ہے۔ شاہد احمد دہلوی کے ہاں نہ استعاروں کی کثرت ہے اور نہ محاوروں کی۔ ان کی عبارت میں نہ وہ شوخی ہے جو آزادؔ کے ہاں نظر آتی ہے اور نہ وہ ظرافت جو نذیر احمد کے ہاں ملتی ہے۔ لیکن ان دونوں صاحب طرز ادیبوں کی نثر

کے امکانات جس نقطہ پر ملتے ہیں وہاں سے شاہد احمد دہلوی کی نثر پیدا ہوتی ہے۔ جس میں استعارے، محاورے، روزمرہ اور رچی ہوئی زبان، مزاج کی سنجیدگی اور شگفتگی کے ساتھ مل کر ایک نئے لب ولہجہ کو جنم دیتی ہے۔ ان کی نثر میں محاورے ایسے ٹھاٹ باٹ اور ٹھسّے سے استعمال میں آتے ہیں کہ انہیں کسی دوسرے لفظ یا محاورے سے نہیں بدلا جا سکتا۔ نہ وہ بہت دُور تک نذیر احمد کے ساتھ چلتے ہیں اور نہ محمد حسین آزاد کے ساتھ۔ لیکن دونوں کو اپنے ساتھ لئے، دونوں کے مزاجوں کو اپنے مزاج کے خمیر میں گوندھ کر ایک نیا مرکب تیار کرتے ہیں۔ آپ کو ان کے ہاں ان دونوں کی گونج تو ضرور سُنائی دے گی لیکن ساتھ ساتھ یہ احساس بھی ہوگا کہ یہ ان دونوں سے مختلف ہے۔ شاہد احمد کی نثر میں نذیر احمد اور محمد حسین آزاد موجود ہیں بھی اور نہیں بھی۔ ان کی نثر نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کی نثر کا ایک نیا امکان ہے۔

یہ بات لکھ کر میں نے سوچا کیوں نہ دو چار مثالوں سے اپنی بات کی وضاحت کر دوں۔ لیکن مسودہ کی ورق گردانی کر کے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان کے انداز بیان اور لب ولہجہ کی چھاپ ہر ہر سطر میں نمایاں ہے اس لئے پوری کتاب نقل کر دینے سے بہتر یہی ہے کہ آپ میرے اس خیال کی تائید میں سارے خاکے خود ہی پڑھ ڈالئے اور پڑھنے کے بعد انہیں اس بات کی مثال سمجھ لیجئے۔ شکریہ۔

جمیل جالبی

۵؍ جولائی ۶۲ء

مولوی نذیر احمد دہلوی

میں نے مولوی نذیر احمد صاحب کو پانچ برس کی عمر میں آخری بار دیکھا اس سے پہلے دیکھا تو ضرور ہوگا مگر مجھے بالکل یاد نہیں۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ ہم تین بھائی ابا کے ساتھ حیدرآباد دکن سے دلی آئے تھے تو کھاری باؤلی کے مکان میں گئے تھے۔ ڈیوڑھی کے آگے صحن میں سے گزر کر پیش دالان میں گئے یہاں دو تین آدمی بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ پچھلے دالان کے دروں میں کیواڑوں کی جوڑیاں چڑھی ہوئی تھیں جن کے اوپر رنگ برنگ شیشوں کے لبتے بنے ہوئے تھے۔ یہ تین دروازے تھے جن میں سے دو کھلے ہوئے تھے اور ایک دائیں جانب کا بند تھا۔ اس کمرے نما دالان میں ہم ابا کے ساتھ داخل ہوئے تو سامنے ایک پلنگ پر ایک بڑے میاں دکھائی دیئے۔ ان کی سفید ڈاڑھی اور کنٹوپ صرف یاد ہے۔ ابا جلدی سے آگے بڑھ کر اُن سے لپٹ کر رونے لگے اور ہم حیران کھڑے رہے۔ جب اُن کے دل کی بھڑاس نکل گئی تو ہمیں حکم ہوا کہ دادا ابا کو سلام کرو۔ ہم نے سلام کیا، انہوں نے پیار کیا۔ ایک ایک اشرفی سب کو دی اور ہم کمرے کے اندھیرے سے گھبرا کر باہر نکل آئے اور کھیل کُود میں لگ گئے۔ اس کے بعد انہیں پھر دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔

سر سالار جنگ نے جب انہیں حیدر آباد بلایا تو انہوں نے یہ کہہ کر آنے سے انکار کر دیا کہ میں انگریزی گورنمنٹ کو چھوڑ کر دیسی گورنمنٹ میں نہیں آتا۔ جب انہوں نے اصرار کیا تو تنخواہ

اتنی زیادہ طلب کی کہ وہ کسی قاعدے سے اتنی رقم نہیں دے سکتے تھے۔ اس دشواری کو یوں حل کیا گیا کہ مولوی صاحب کے ساتھ ان کے دو دامادوں کو بھی اچھی تنخواہوں پر رکھ لیا گیا۔

مولوی نذیر احمد کو زمانہ سازی بالکل نہیں آتی تھی۔ سچی بات کہنے میں انہیں باک نہ ہوتا تھا۔ حیدرآباد دکن میں بڑے بڑے عُہدوں پر مامور ہوئے مگر خوش کسی کو نہ کر سکے۔ اسی وجہ سے زیادہ عرصے تک وہاں نہ رہ سکے اور پنشن لے کر دلی چلے آئے۔ ان کے لئے "غیور جنگ" کا خطاب تجویز ہوا تھا۔ مگر انہوں نے اسے قبول نہیں کیا۔

نواب افتخار علی خاں والئ ریاست جاورہ کے بھائی نواب سرفراز علی خاں مرحوم بہت بیمار تھے۔ ان کے لئے طبیبوں کی کیا کمی تھی؟ دُنیا بھر کے علاج کرائے مگر شفا نہ ہوئی۔ ایک دن انہوں نے مولوی نذیر احمد کو خواب میں دیکھا کہ ان سے کہہ رہے ہیں "ہمارے قرآن کا ترجمہ چھپوالو۔ اچھے ہو جاؤ گے۔" نواب صاحب نے میرے والد کو دلی خط لکھا اور اس خواب کی رُوداد بیان کر کے ترجمہ شائع کرنے کی اجازت مانگی۔ والد صاحب نے اجازت دے دی اور صرف ترجمہ قرآن دو بڑی خوبصورت جلدوں میں ریاست جاورہ کے چھاپہ خانے سے شائع ہوا۔ خدا کی شان کہ نواب صاحب بالکل تندرست ہو گئے اور جب اس واقعہ کے کوئی بیس سال بعد میں اُن سے ملا تو ستر سے بہتر ہو چکے تھے۔ مگر وہ ایک بڑا خوب صورت نیا محل بنوا رہے تھے۔ کیونکہ انہوں نے ایک اور نئی شادی کر لی تھی۔

مولوی احمد حسن صاحب، احسن التفاسیر، مولوی نذیر احمد کے خویش تھے۔ ایک دن مولوی نذیر احمد کے ہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ مولوی احمد حسن نے دیکھا کہ ڈپٹی صاحب کی کہنیاں بہت میلی ہو رہی ہیں۔ اور اُن پر میل کی ایک تہ چڑھی ہوئی ہے۔ مولوی صاحب سے نہ رہا گیا، بولے "اگر آپ اجازت دیں تو جھانوے سے آپ کی کہنیاں ذرا صاف کر دوں۔" ڈپٹی صاحب نے اپنی کہنیوں کی طرف دیکھا اور ہنس کر کہنے لگے "میاں احمد حسن یہ میل نہیں ہے۔ میں جب بجنور سے آ کر پنجابی کٹرے کی مسجد میں طالب علم بنا تھا تو رات رات بھر مسجد کے فرش پر کہنیاں ٹکائے پڑھا کرتا تھا۔ پہلے ان کہنیوں میں زخم پڑے اور پھر گٹے پڑ گئے۔ لو دیکھو، اگر تم انہیں صاف کر سکتے ہو تو صاف کر دو۔" اس کے بعد اپنا وہ زمانہ یاد کر کے آبدیدہ ہو گئے۔ اور مولوی احمد حسن بھی رونے لگے۔

مولوی صاحب بڑے فخر سے اپنے بچپن کے مصائب بیان کرتے تھے۔ جس مسجد میں ٹھہرے تھے اس کا ملا بڑا بد مزاج اور بے رحم تھا۔ کڑکڑاتے جاڑوں میں ایک ٹاٹ کی صف میں یہ لپٹ جاتے اور ایک میں ان کے بھائی۔ سات آٹھ سال کے بچے کی بساط ہی کیا! علی الصباح اگر آنکھ نہ کھلتی تو مسجد کا ملا ایک لات رسید کرتا اور یہ لُڑھکتے چلے جاتے اور صف بھی بچھ جاتی۔ اس زمانے کے طالب علموں کی طرح انہیں بھی محلّے کے گھروں سے روٹی مانگ کر لانی پڑتی تھی۔ دن اور گھر بندھے ہوئے تھے۔ انہی گھروں میں سے ایک گھر مولوی عبدالقادر صاحب کا بھی تھا۔ روٹی کے سلسلے میں جب اُن کے ہاں آنا جانا ہو گیا تو نذیر احمد سے اُوپر کے کام بھی لئے جانے لگے۔ مثلاً بازار سے سودا سُلف لانا۔ مسالہ پیسنا۔ لڑکی کو بہلانا۔ لڑکی بڑی ضدن تھی۔ ان کا کولھا توڑتی اور انہیں مارتی پیٹتی رہتی۔ ایک دفعہ مسالہ پیستے میں مرچوں کا بھرا ہوا ڈبہ چھین کر ان کے ہاتھ کچل ڈالے۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ یہی لڑکی آگے چل کر مولانا کی بیوی بنی۔

مولوی نذیر احمد بڑے غیور آدمی تھے۔ سسرال والے خاصے مُرفّہ الحال تھے۔ مگر انہوں نے اسے گوارا نہ کیا کہ سسرال والوں کے ٹکڑوں پر پڑے رہیں۔ جب ان کی شادی ہوئی تو غالباً پندرہ روپے کے ملازم تھے۔ اسی میں الگ ایک کھنڈلا لے کر رہتے تھے۔ میں نے بڑی بُوڑھیوں سے سُنا ہے کہ ان کے گھر میں صرف ایک ٹوٹی ہوئی جوتی تھی۔ کبھی بیوی ان لیتڑوں کو بجا لیتیں کبھی میاں۔

دلی کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد انہیں کوئی سرکاری ملازمت نہیں ملی تو سخت برہم ہوئے۔ پرنسپل سے جاکر ایک دن بولے کہ "مجھے سرکاری ملازمت اگر نہیں دی گئی تو کلچوں کی ڈنڈی کھوروں گا اور اس پر دلی کالج کی سند لگا دوں گا۔" مگر اس کی نوبت نہیں آئی اور انہیں ملازمت مل گئی۔

مولوی عنایت اللہ مرحوم منشی ذکاء اللہ دہلوی کے بڑے صاحب زادے تھے۔ یہ وہی مولوی عنایت اللہ ہیں جو علی گڑھ کالج کے ابتدائی زمانے کے گریجویٹ تھے اور اردو میں ترجمہ ایسا کرتے کہ اس میں طبع زاد تصنیف کا مزہ آتا۔ اخیر میں حیدرآباد دکن میں ناظم الترجمہ بھی رہے۔ کچھ تو منشی ذکاء اللہ کی نسبت سے اور کچھ اپنی غیر معمولی قابلیت کی بنا پر مولوی صاحب سر سیّد احمد خاں کے مُقربین میں شامل تھے اور ان کے سکریٹری کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ مولوی صاحب نے بتایا کہ ایک دفعہ سر سید احمد خاں کالج کے لئے چندہ جمع کرنے لاہور گئے۔ ان کے سب رفیق ہمرکاب تھے۔ سیّد صاحب کو توقع تھی کہ زندہ دلانِ پنجاب سے بہت روپیہ ملے گا۔ سو دوست، سو دشمن۔ سیّد صاحب کے مخالفین میں مولویوں کی ایک بااثر جماعت بھی تھی جس نے سیّد صاحب اور ان کے ہم خیال لوگوں کو "نیچری" موسوم کرکے خوب مخالفانہ پروپیگنڈا کیا تھا۔ سیّد صاحب لاہور پہنچے اور شہر کے اخباروں اور پوسٹروں کے ذریعے اُن کے آنے اور خطاب کرنے کی خبر مُشتہر کی گئی کہ بعد نماز جمعہ شاہی مسجد میں سیّد صاحب لکچر دیں گے۔ انہیں اُمید تھی کہ خلقت کا خوب ہجوم ہوگا مگر مولویوں کی مخالف جماعت کا زہر پھیل چکا تھا۔ نماز جمعہ کے بعد جب سیّد صاحب کھڑے ہوئے تو سارے نمازی انہیں نیچری اور کافر کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔ صرف مٹھی بھر آدمی بیٹھے رہ گئے۔ سیّد صاحب اس ماجرے کے لئے بالکل تیار نہیں تھے۔ ایسے روٹھے اور شکستہ دل ہوئے کہ ہمت ہی ہار بیٹھے۔ جائے قیام پر بے حد مایوس لوٹے اور اپنی ناکامی پر ماتم کرنے لگے۔ اُن کے رفقاء نے ان کی ڈھارس بندھائی مگر کوئی صورت حالات کو سنبھالنے کی

سمجھ میں نہ آئی۔ بالآخر سیّد صاحب نے فرمایا "نذیر احمد کو دلّی سے لاؤ تو شاید کچھ کام بن سکے۔" منشی ذکاء اللہ انہیں لانے کے لئے بھیجے گئے کیونکہ ڈپٹی صاحب خود بڑے ضدی اور ہٹیلی طبیعت کے آدمی تھے اور سوائے منشی ذکاء اللہ کے اور کوئی انہیں رام نہیں کرسکتا تھا۔ سیّد صاحب سے بعض امور میں انہیں اختلاف ضرور تھا لیکن مسلمانوں کی تعلیم و ترقی کے باب میں وہ سیّد احمد خاں کے حامی و مددگار تھے۔ نذیر احمد کا اس زمانے میں طوطی بول رہا تھا۔ اور وہ ہر طبقے میں ایک بہت بڑے عالم دین سمجھے جاتے تھے اور لوگوں کو یہ گمان بھی تھا کہ ڈپٹی صاحب نیچریوں کے خلاف ہونے کی وجہ سے سیّد صاحب کے مخالفین میں سے ہیں اور غالباً وہ اسی وجہ سے اس سفر میں سیّد صاحب کے ساتھ گئے بھی نہیں تھے۔ لیکن جب ڈپٹی صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ سر سیّد کی لاہور میں یہ درگت بنی تو جھٹ منشی ذکاء اللہ کے ساتھ ہو لئے۔ لاہور پہنچتے ہی ایک بڑا پوسٹر شائع کیا گیا کہ نیچریوں سے مقابلہ و مناظرہ کرنے کے لئے دلّی سے ایک بہت بڑے جغادری مولوی کو بلایا گیا ہے اور بعد نماز جمعہ شاہی مسجد میں یہ معرکہ ہوگا۔ شہر میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی اور ہر مسلمان کو شوق و تجسس ہوا کہ ان مولوی صاحب کو دیکھئے کہ کس کس طرح نیچریوں کو پٹخنیاں دیتے ہیں۔ لوگ جوق در جوق آنے لگے اور شاہی مسجد میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ نماز کے بعد مولوی نذیر احمد کھڑے ہوئے اور نیچریوں کی بُرائی سے اُن کا لکچر شروع ہوا۔ سننے والوں میں بڑا جوش و خروش تھا۔ نذیر احمد کا لکچر خدا جانے کیسے کیسے پہلو بدلتا ہوا کہاں پہنچا۔ جب لکچر ختم ہوا تو علی گڑھ کے لئے روپیہ برس رہا تھا اور وہی نیچریوں کے ہاتھ چومے جا رہے تھے، اور لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہ جغادری مولوی نذیر احمد ہیں۔

مولوی عنایت اللہ مرحوم فرماتے تھے کہ جب ہم لاہور سے دلّی واپس آ رہے تھے تو ایک ہی ڈبے میں سب سوار تھے۔ سر سیّد احمد خاں نے کسی بات کے سلسلے میں کہا "مولوی صاحب! میں اس لائق بھی نہیں ہوں کہ آپ کے جوتے کے تسمے باندھوں۔" مولوی نذیر احمد کھڑے ہوئے اور تعظیماً تین آداب بجا لائے۔

سر سید احمد خاں عمر میں مولوی نذیر احمد سے بائیس سال بڑے تھے اور عوام کے علاوہ انگریزی حکام میں بھی بہت معزز تھے۔ مولوی نذیر احمد بھی ان کی بڑی عزت کرتے اور دامے درمے، قدمے سخنے ان کی مدد کرتے۔ ایک دفعہ علی گڑھ کالج میں ایک ہندو محاسب نے لاکھوں روپے کا غبن کیا اور کالج جاری رکھنا محال ہو گیا۔ اس خبر کو سنکر مولوی نذیر احمد دلّی سے علی گڑھ پہونچے اور ہر طرح کی ڈھارس بندھائی۔ بولے "اگر روپے کی ضرورت ہو تو یہ روپیہ اس وقت موجود ہے، لے لو اور بھی دوں گا۔ اور اگر کسی خدمت کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔" سر سید اس خلوص سے بے حد متاثر ہوئے۔

اسی زمانے میں مولوی نذیر احمد کے دو نواسے مشرف الحق اور اشرف الحق علی گڑھ میں پڑھتے تھے۔ (ڈاکٹر) اشرف الحق نے بتایا کہ "نانا ابّا نے ہمیں سید صاحب کے کمرے میں بھجوایا تو ہم نے دیکھا کہ ان کے پاؤں میں بوٹ ہیں اور وہ ٹانگیں میز پر سر سید کی طرف کئے نہایت بدتمیزی سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ (ڈاکٹر) اشرف نے چُپکے سے ان سے کہا "نانا ابّا پاؤں نیچے کر لیجئے۔" بولے "یہ انہی کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔" سر سید ہنس پڑے۔

ٹامسن صاحب (جو غالباً شمال مغربی صوبے کے لفٹنٹ گورنر تھے) مولوی نذیر احمد کے بڑے قدرداں دوست تھے۔ اُن کی آمد کی اطلاع پا کر مولوی صاحب اُن سے ملنے گئے۔ چپراسی نے ایک مُلّا شکل کے کالے آدمی کو دیکھا تو کوٹھی کے دروازے ہی پر روک لیا۔ مولوی صاحب نے لاکھ چاہا کہ کسی طرح تعارفی کارڈ صاحب تک پہنچا دے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اُسے یہ بھی بتایا کہ میرے پُرانے ملنے والے ہیں مگر وہ بھلا انہیں کیوں گردانتا؟ آخر ہار کر مولوی صاحب نے دو روپے بٹوے میں سے نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھے اور کہا "بھائی اب تو للہ پہنچا دے۔" یہی تو وہ چاہتا تھا۔ جھٹ کارڈ لے کر اندر چلا گیا اور فوراً ہی مولوی صاحب کی طلبی ہو گئی۔ مولوی صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو ٹامسن صاحب سروقد کھڑے ہو گئے اور بولے "مولوی صاحب مزاج شریف؟" یہ کہہ کر انہوں نے ہاتھ ملانے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ مولوی صاحب نے کہا۔

"مزاج میرا اس وقت ٹھیک نہیں ہے اور میں آپ سے ہاتھ بھی نہیں ملا سکتا۔" ٹامسن نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کیا ہوا مولوی صاحب آپ کو؟" بولے "آپ کا چپراسی دو روپے مجھ سے لینے کے بعد آپ تک مجھے لایا ہے۔" صاحب تو یہ سنتے ہی آگ بگولا ہو گئے۔ اس چپراسی کو آواز دے کر بلایا اور پوچھا "تم نے مولوی صاحب سے دو روپے لئے؟" روپے اس کی جیب میں موجود تھے انکار کیسے کرتا؟ کہنے لگا "جی ہاں!" صاحب نے خفگی سے کہا "تم برخاست۔" اور مولوی صاحب سے بولے۔ "لائیے اب ہاتھ ملائیے۔" مولوی صاحب نے ہاتھ نہیں بڑھایا اور کہا "مگر وہ میرے دو روپے تو مجھے واپس نہیں ملے۔" صاحب نے پھر اس چپراسی کو آواز دی اور اس سے مولوی صاحب کے دو روپے واپس دلوائے۔ بولے "اب ہاتھ ملائیے۔" مولوی صاحب نے اب بھی ہاتھ نہیں بڑھایا۔ صاحب نے متعجب ہو کر پوچھا "اب کیا بات ہے؟" مولوی صاحب نے کہا "میرے دو روپے مجھے مل گئے اس کا قصور معاف کیجئے اور اسے بحال کر دیجئے۔" صاحب چیں بجبیں ہوئے مگر مولوی صاحب کی بات بھی نہیں ٹال سکتے تھے۔ آخر بولے "جاؤ مولوی صاحب کے کہنے سے ہم نے تمہیں بحال کیا۔" یہ کہہ کر پھر ہاتھ بڑھایا اور اب کے مولوی صاحب نے بھی ہاتھ بڑھا دیا۔

مولوی نذیر احمد صاحب علی گڑھ کے لئے چندہ اگانے کے سلسلے میں بہت کارآمد آدمی تھے۔ اس لئے جہاں تک ممکن ہوتا سر سید انہیں اپنے دوروں میں ساتھ رکھتے اور ان سے تقریریں کراتے۔ نذیر احمد کی قوتِ تقریر کے متعلق کہا جاتا تھا کہ انگلستان کا مشہور مقرر برک بھی اُن سے زیادہ موثر تقریر نہیں کر سکتا تھا۔ اب بھی اگلے وقتوں کے لوگ جنہوں نے مولوی صاحب کے لکچر سُنے ہیں کہتے ہیں کہ یا تو ہم نے ڈپٹی صاحب کو دیکھا یا اب اخیر میں بہادر یار جنگ مرحوم کو دیکھا کہ سامعین پر جادو سا کر دیتے اور جو کام ان سے چاہتے لے لیتے۔ جب چاہا انہیں ہنسا دیا اور جب چاہا، ان کی جیبیں خالی کرا لیں۔ اور عورتوں کے زیور تک اُتروا لیا کرتے تھے۔ مولوی نذیر احمد میں شوخی و ظرافت کا عنصر زیادہ تھا۔ پھبتی کہنے اور چوٹ کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ خود مولوی صاحب

کہا کرتے تھے کہ چندہ اگانے کے لئے سرسید نے ہمارا ایک طائفہ تیار کیا ہے۔ حالی روں روں روں روں سارنگی بجا رہے ہیں۔ شبلی مجیرے کھڑکھڑا رہے ہیں۔ ہم طبلہ بجا رہے ہیں اور سید صاحب ہاتھ پھیلا پھیلا کر کہہ رہے ہیں" لاچندہ! لاچندہ! غور سے دیکھئے یہ کس قدر مکمل تشبیہ ہے۔ کارکردگی کے اعتبار سے کس قدر مکمل!

مولوی نذیر احمد بہت سخت گیر آدمی تھے اور بہت نرم دل بھی۔ مسلمانوں میں تجارت کا شوق عام کرنے کے لئے روپیہ قرض دیا کرتے اور منافع میں اپنا حصہ بھی رکھتے۔ اس شوقِ تجارت میں انہوں نے بڑے بڑے نقصان اُٹھائے۔ پکا کاغذ لکھوا کر روپیہ دے دیتے۔ اور روپیہ لینے والا خوب نفع کماتا اور اخیر میں دیوالیہ ہونے کی درخواست دے دیتا۔ خوشامد در آمد سے مولوی صاحب کو راضی کر کے رقم کا بیشتر حصہ ہضم کر جاتا۔ اگر مولوی صاحب سے کوئی کہتا بھی کہ آپ کیوں ایسے جھوٹے اور مکار لوگوں کے فریب میں آتے ہیں تو وہ ناراض ہوتے اور جب غصہ دُور ہو جاتا تو کہتے "میں اپنے روپے سے اُن کا ایمان خریدتا ہوں۔" ایک دفعہ کسی کو روپیہ اُدھار دیا۔ اُسنے خوب روپیہ کمایا اور کچھ مولوی صاحب کو بھی دیا۔ ایک دن مولوی صاحب بازار میں سے گزر رہے تھے۔ سامنے سے ایک اعلیٰ درجے کی فٹن آئی اور ان کے قریب آ کر رک گئی۔ اس میں سے وہ صاحب شراب کے نشے میں جھومتے ہوئے اُترے اور جو رنڈی ساتھ تھی اس سے ٹھٹھا مار کر بولے "ان مولوی صاحب کو سلام کرو۔ یہ سب کچھ انہی کی بدولت ہے۔" مولوی صاحب کو یہ بات نہایت ناگوار گزری۔ خون کا سا گھونٹ پی کر چپکے ہو رہے اور گھر آ کر پہلا کام یہ کیا کہ موتی ساگر وکیل کو بلایا۔ اس شخص کے کاغذات ان کے حوالے کئے اور اس پر نالش کر دی۔ مقدمے نے طول پکڑا اور خوب روپیہ برباد ہوا۔ فریقِ ثانی نے جب یہ دیکھا کہ اب قید ہونے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تو ایک دن آ کر مولوی صاحب کے پاؤں پکڑ لئے۔ اور ان کے قدموں میں لوٹ گیا۔ مولوی صاحب نے اسے معاف کر دیا۔

مولوی نذیر احمد عربی میں غیر معمولی استعداد رکھتے تھے۔ کئی کئی سال سے لوگوں کا ان پر تقاضا تھا کہ قرآن مجید کا ترجمہ کرو۔ مگر وہ پس و پیش کرتے اور کہتے کہ یہ کام ان لوگوں کا ہے جو خدمتِ دین میں اپنی ساری ساری عمر صرف کر چکے ہیں۔ مگر جب پنشن لے کر وہ دلّی آ گئے تو تیسیر کا ترجمہ شروع کیا اور اس سلسلے میں اکثر آیاتِ قرآنی کا ترجمہ بھی کرنا پڑا۔ اس سے انہیں اندازہ ہوا کہ یہ کام اتنا دشوار نہیں ہے جتنی کہ طبیعت میں ہچکچاہٹ ہے۔ چنانچہ کئی مولویوں اور عالموں کے مشوروں سے انہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ کرنا شروع کیا۔ ایک ایک لفظ پر ردّ و قدح ہوتی اور بالآخر ایک رائے ہو کر ترجمہ لکھ لیا جاتا۔ ترجمہ مکمل ہونے کے بعد بھی ایک نابینا جیّد عالم کو پڑھ کر سنایا گیا اور ایک اور عالم کو نظرِ ثانی کے لئے باہر بھیجا گیا۔ جب کاپیوں کی تصحیح ہوئی اور پروف دیکھے گئے تب بھی ان میں ترمیم کی گئی اور جب تک اس کی طرف سے پورا پورا اطمینان نہیں ہو گیا اسے شائع نہیں کیا گیا۔ اس میں ڈھائی سال لگ گئے مگر ترجمہ بھی ایسا شُستہ رفتہ اور بامحاورہ ہوا کہ اب پچھلے پچاس برس میں کوئی اور ترجمہ اس سے بہتر شائع نہیں ہو سکا۔ خود مولوی صاحب کو اپنی تمام کتابوں میں ترجمۃ القرآن ہی پسند تھا۔ اور وہ فرماتے تھے کہ میں نے اور سب کتابیں دوسروں کے لئے لکھی ہیں اور یہ ترجمہ اپنے لئے کیا ہے کہ یہی میرا توشۂ آخرت ہے۔

مولوی نذیر احمد نے دلّی کی ٹکسالی اور بامحاورہ اردو میں ترجمہ کیا۔ اوّل تو ایک زبان کے الفاظ و خیالات کو دوسری زبان میں پوری صحت کے ساتھ مُنتقل کرنا ایک ناممکن سی بات ہے۔ پھر کلام اللہ کا ترجمہ کہ لفظ ادھر سے اُدھر ہوا اور مفہوم بدلا۔ خدا جانے کن احتیاطوں اور دشواریوں سے یہ ترجمہ مکمل ہوا ہوگا۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ اگر کسی معمولی مضمون کا ترجمہ بھی کرنے بیٹھے ہیں تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ نذیر احمد جب ترجمہ میں لفظی پابندی سے کام نکلتا نہیں دیکھتے تو مفہوم ادا کرنے کا بہترین پیرایہ اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ تعزیراتِ ہند کے ترجمہ میں بھی انہوں نے یہی ترکیب استعمال کی اور ترجمۃ القرآن میں بھی۔ ٹرانسپورٹیشن فار لائف" کا ترجمہ انہوں نے حبسِ دوام

سرسید احمد خاں عمر میں مولوی نذیر احمد سے بائیس سال بڑے تھے اور عوام کے علاوہ انگریزی حکام میں بھی بہت معزز تھے۔ مولوی نذیر احمد بھی ان کی بڑی عزت کرتے اور دامے درمے، قدمے سخنے ان کی مدد کرتے۔ ایک دفعہ علی گڑھ کالج میں ایک ہندو محاسب نے لاکھوں روپے کا غبن کیا اور کالج جاری رکھنا محال ہو گیا۔ اس خبر کو سنکر مولوی نذیر احمد دلّی سے علی گڑھ پہونچے اور ہر طرح کی ڈھارس بندھائی۔ بولے "اگر روپے کی ضرورت ہو تو یہ روپیہ اس وقت موجود ہے، لے لو اور بھی دوں گا۔ اور اگر کسی خدمت کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔" سرسید اس خلوص سے بے حد متاثر ہوئے۔

اسی زمانے میں مولوی نذیر احمد کے دو نواسے مشرف الحق اور اشرف الحق علی گڑھ میں پڑھتے تھے۔ (ڈاکٹر) اشرف الحق نے بتایا کہ "نانا ابا نے ہمیں سید صاحب کے کمرے میں بھجوایا تو ہم نے دیکھا کہ ان کے پاؤں میں بوٹ ہیں اور وہ ٹانگیں میز پر سرسید کی طرف کئے نہایت بدتمیزی سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ (ڈاکٹر) اشرف نے چپکے سے ان سے کہا "نانا ابا پاؤں نیچے کر لیجئے۔" بولے "یہ انہی کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔" سرسید ہنس پڑے۔

ٹامسن صاحب (جو غالباً شمال مغربی صوبے کے لفٹنٹ گورنر تھے) مولوی نذیر احمد کے بڑے قدرداں دوست تھے۔ اُن کی آمد کی اطلاع پا کر مولوی صاحب اُن سے ملنے گئے۔ چپراسی نے ایک مُلّا شکل کے کالے آدمی کو دیکھا تو کوٹھی کے دروازے ہی پر روک لیا۔ مولوی صاحب نے لاکھ چاہا کہ کسی طرح تعارفی کارڈ صاحب تک پہنچا دے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اُسے یہ بھی بتایا کہ میرے پُرانے ملنے والے ہیں مگر وہ بھلا انہیں کیوں گردانتا؟ آخر ہار کر مولوی صاحب نے دو روپے بٹوے میں سے نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھے اور کہا "بھائی اب تو اللہ پہنچا دے۔" یہی تو وہ چاہتا تھا۔ جھٹ کارڈ لے کر اندر چلا گیا اور فوراً ہی مولوی صاحب کی طلبی ہو گئی۔ مولوی صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو ٹامسن صاحب سروقد کھڑے ہو گئے اور بولے "مولوی صاحب مزاج شریف؟" یہ کہہ کر انہوں نے ہاتھ ملانے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ مولوی صاحب نے کہا۔

"مزاج میرا اس وقت ٹھیک نہیں ہے اور میں آپ سے ہاتھ بھی نہیں ملا سکتا۔" ٹامسن نے حیران ہو کر پوچھا "کیا ہوا مولوی صاحب آپ کو؟" بولے "آپ کا چپراسی دو روپے مجھ سے لینے کے بعد آپ تک مجھے لایا ہے۔" صاحب تو یہ سنتے ہی آگ بگولا ہو گئے۔ اس چپراسی کو آواز دے کر بلایا اور پوچھا "تم نے مولوی صاحب سے دو روپے لئے؟" روپے اس کی جیب میں موجود تھے انکار کیسے کرتا؟ کہنے لگا "جی ہاں!" صاحب نے خفگی سے کہا "تم برخاست۔" اور مولوی صاحب سے بولے "لائیے اب ہاتھ ملائیے۔" مولوی صاحب نے ہاتھ نہیں بڑھایا اور کہا "مگر وہ میرے دو روپے تو مجھے واپس نہیں ملے۔" صاحب نے پھر اس چپراسی کو آواز دی اور اس سے مولوی صاحب کے دو روپے واپس دلوائے۔ بولے "اب ہاتھ ملائیے۔" مولوی صاحب نے اب بھی ہاتھ نہیں بڑھایا۔ صاحب نے متعجب ہو کر پوچھا "اب کیا بات ہے؟" مولوی صاحب نے کہا "میرے دو روپے مجھے مل گئے اس کا قصور معاف کیجئے اور اسے بحال کر دیجئے۔" صاحب چیں بجبیں ہوئے مگر مولوی صاحب کی بات بھی نہیں ٹال سکتے تھے۔ آخر بولے "جاؤ مولوی صاحب کے کہنے سے ہم نے تمہیں بحال کیا۔" یہ کہہ کر پھر ہاتھ بڑھایا اور اب کے مولوی صاحب نے بھی ہاتھ بڑھا دیا۔

مولوی نذیر احمد صاحب علی گڑھ کے لئے چندہ اگانے کے سلسلے میں بہت کارآمد آدمی تھے۔ اس لئے جہاں تک ممکن ہوتا سرسید انہیں اپنے دوروں میں ساتھ رکھتے اور ان سے تقریریں کراتے۔ نذیر احمد کی قوتِ تقریر کے متعلق کہا جاتا تھا کہ انگلستان کا مشہور مقرر برک بھی اُن سے زیادہ مؤثر تقریر نہیں کر سکتا تھا۔ اب بھی اگلے وقتوں کے لوگ جنہوں نے مولوی صاحب کے لکچر سُنے ہیں کہتے ہیں کہ یا تو ہم نے ڈپٹی صاحب کو دیکھا یا اب اخیر میں بہادر یار جنگ مرحوم کو دیکھا کہ سامعین پر جادو سا کر دیتے اور جو کام ان سے چاہتے لے لیتے۔ جب چاہا انہیں ہنسا دیا اور جب چاہا ان کی جیبیں خالی کرا لیں۔ اور عورتوں کے زیور تک اُتروا لیا کرتے تھے۔ مولوی نذیر احمد میں شوخی و ظرافت کا عنصر زیادہ تھا۔ پھبتی کہنے اور چوٹ کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ خود مولوی صاحب

کہا کرتے تھے کہ چندہ اگانے کے لئے سر سید نے ہمارا ایک طائفہ تیار کیا ہے۔ حالی روں روں روں روں سارنگی بجا رہے ہیں، شبلی مجیرے کھڑکھڑا رہے ہیں۔ ہم طبلہ بجا رہے ہیں اور سید صاحب ہاتھ پھیلا پھیلا کر کہہ رہے ہیں" لاچندہ! لاچندہ!! غور سے دیکھئے یہ کس قدر مکمل تشبیہ ہے۔ کارکردگی کے اعتبار سے کس قدر مکمل!

مولوی نذیر احمد بہت سخت گیر آدمی تھے اور بہت نرم دل بھی۔ مسلمانوں میں تجارت کا شوق عام کرنے کے لئے روپیہ قرض دیا کرتے اور منافع میں اپنا حصہ بھی رکھتے۔ اس شوقِ تجارت میں انہوں نے بڑے بڑے نقصان اُٹھائے۔ پکا کاغذ لکھوا کر روپیہ دے دیتے۔ اور روپیہ لینے والا خوب نفع کماتا اور اخیر میں دیوالیہ ہونے کی درخواست دے دیتا۔ خوشامد درآمد سے مولوی صاحب کو راضی کر کے رقم کا بیشتر حصہ ہضم کر جاتا۔ اگر مولوی صاحب سے کوئی کہتا بھی کہ آپ کیوں ایسے جھوٹے اور مکار لوگوں کے فریب میں آتے ہیں تو وہ ناراض ہوتے اور جب غصہ دُور ہو جاتا تو کہتے "میں اپنے روپے سے اُن کا ایمان خریدتا ہوں"۔ ایک دفعہ کسی کو روپیہ اُدھار دیا۔ اُسنے خوب روپیہ کمایا اور کچھ مولوی صاحب کو بھی دیا۔ ایک دن مولوی صاحب بازار میں سے گزر رہے تھے۔ سامنے سے ایک اعلیٰ درجے کی فٹن آئی اور ان کے قریب آ کر رک گئی۔ اس میں سے وہ صاحب شراب کے نشے میں جھومتے ہوئے اُترے اور جو رنڈی ساتھ تھی اس سے ٹھٹھا مار کر بولے "ان مولوی صاحب کو سلام کرو، یہ سب کچھ انہی کی بدولت ہے"۔ مولوی صاحب کو یہ بات نہایت ناگوار گزری۔ خون کا سا گھونٹ پی کر چپکے ہو رہے اور گھر آ کر پہلا کام یہ کیا کہ موتی ساگر وکیل کو بلایا۔ اس شخص کے کاغذات ان کے حوالے کئے اور اس پر نالش کر دی۔ مقدمے نے طول پکڑا اور خوب روپیہ برباد ہوا۔ فریقِ ثانی نے جب یہ دیکھا کہ اب قید ہونے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تو ایک دن آ کر مولوی صاحب کے پاؤں پکڑ لئے۔ اور ان کے قدموں میں لوٹ گیا۔ مولوی صاحب نے اسے معاف کر دیا۔

مولوی نذیر احمد عربی میں غیر معمولی استعداد رکھتے تھے۔ کئی کئی سال سے لوگوں کا ان پر تقاضا تھا کہ قرآن مجید کا ترجمہ کرو۔ مگر وہ پس و پیش کرتے اور کہتے کہ یہ کام ان لوگوں کا ہے جو خدمتِ دین میں اپنی ساری ساری عمر صرف کر چکے ہیں۔ مگر جب پنشن لے کر وہ دلی آ گئے تو تیسیر کا ترجمہ شروع کیا اور اس سلسلے میں اکثر آیاتِ قرآنی کا ترجمہ بھی کرنا پڑا۔ اس سے انہیں اندازہ ہوا کہ یہ کام اتنا دشوار نہیں ہے جتنی کہ طبیعت میں ہچکچاہٹ ہے۔ چنانچہ کئی مولویوں اور عالموں کے مشوروں سے انہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ کرنا شروع کیا۔ ایک ایک لفظ پر ردّ و قدح ہوتی اور بالآخر ایک رائے ہو کر ترجمہ لکھ لیا جاتا۔ ترجمہ مکمل ہونے کے بعد بھی ایک نابینا جیّد عالم کو پڑھ کر سنایا گیا اور ایک اور عالم کو نظرِ ثانی کے لئے باہر بھیجا گیا۔ جب کاپیوں کی تصحیح ہوئی اور پروف دیکھے گئے تب بھی ان میں ترمیم کی گئی اور جب تک اس کی طرف سے پورا اطمینان نہیں ہو گیا اسے شائع نہیں کیا گیا۔ اس میں ڈھائی سال لگ گئے مگر ترجمہ بھی ایسا شُستہ رفتہ اور بامحاورہ ہوا کہ اب پچھلے پچاس برس میں کوئی اور ترجمہ اس سے بہتر شائع نہیں ہو سکا۔ خود مولوی صاحب کو اپنی تمام کتابوں میں ترجمۃ القرآن ہی پسند تھا۔ اور وہ فرماتے تھے کہ میں نے اور سب کتابیں دوسروں کے لئے لکھی ہیں اور یہ ترجمہ اپنے لئے کیا ہے کہ یہی میرا توشۂ آخرت ہے۔

مولوی نذیر احمد نے دلی کی ٹکسالی اور بامحاورہ اردو میں ترجمہ کیا۔ اوّل تو ایک زبان کے الفاظ و خیالات کو دوسری زبان میں پوری صحت کے ساتھ منتقل کرنا ایک ناممکن سی بات ہے۔ پھر کلام اللہ کا ترجمہ کہ لفظ اِدھر سے اُدھر ہوا اور مفہوم بدلا۔ خدا جانے کن احتیاطوں اور دشواریوں سے یہ ترجمہ مکمل ہوا ہوگا۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ اگر کسی معمولی مضمون کا ترجمہ بھی کرنے بیٹھتے ہیں تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ نذیر احمد جب ترجمہ میں لفظی پابندی سے کام نکلتا نہیں دیکھتے تو مفہوم ادا کرنے کا بہترین پیرایہ اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ تعزیراتِ ہند کے ترجمہ میں بھی انہوں نے یہی ترکیب استعمال کی اور ترجمۃ القرآن میں بھی۔ ٹرانسپورٹیشن فار لائف" کا ترجمہ انہوں نے حبسِ دوام

بہ عبور دریائے شور کیا ہم تو "عمر قید" کہتے۔ مگر اس میں کالے پانی بھیجے جانے کا مفہوم ادا نہ ہوتا۔ اسی طرح انہوں نے قرآن مجید کے ترجمے میں "عورتیں مردوں کا لباس ہیں۔ اور مرد عورتوں کا لباس" لکھنے کے بجائے "مرد عورت کا چولی دامن کا ساتھ ہے" لکھا۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کیا کہ مفہوم کو واضح کرنے کے لئے بریکیٹ میں الفاظ یا فقرے اپنی طرف سے بڑھا دیئے۔ اس قسم کی "آزادی" اکثر علما کو ناگوار گزری۔ اور چاروں طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہوئی۔ اور تو اور مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم نے "رد ترجمۂ دہلویہ" کے نام سے ایک خاصی ضخیم کتاب لکھ کر اسی زمانے میں چھپوائی تھی۔ مگر مولوی نذیر احمد نے اپنے ترجمے میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور آج تک وہی ترجمہ مقبول عام ہے۔

اس ترجمہ کی نشر و اشاعت کے لئے مولوی صاحب جہاں بھی لکچر دینے جاتے، بڑے بڑے پوسٹر لگوا دیتے اور اکثر اپنی تقریروں میں بھی اس کا تذکرہ کرتے۔ پنجاب کے ایک مشہور اخبار نویس کو کلام اللہ کے اس ترجمے سے خدا جانے کیا کاوش ہو گئی کہ وہ مولوی صاحب کی مخالفت پر تل گیا۔ اور لگا ان کے خلاف کالم کے کالم سیاہ کرنے۔ جب مولوی صاحب نے سونے چاندی کے ڈلے سے اس کا منہ بند نہیں کیا تو وہ اور بھی کمینہ پن پر اُتر آیا۔ اور مولوی صاحب کی ذاتیات پر حملے کرنے لگا۔ مولوی صاحب اس پر بھی طرح دے گئے تو اُس نے بہتان تراشی اور افترا پردازی شروع کر دی۔ اب مولوی صاحب کو بھی جلال آ گیا اور مقدمہ بازی شروع کر دی۔ مولوی صاحب کثیر دولت کے مالک تھے۔ اور وہ اس ترنگ میں تھا کہ میں نے بھی بڑے بڑوں کو مار رکھا ہے۔ یہ سلسلہ خوب دراز ہوا۔ یہاں تک کہ مولوی صاحب کو اطلاعیں پہنچنے لگیں کہ وہ مقدمے کی زیر باری سے تباہ و برباد ہوا جا رہا ہے۔ آخر میں چند بھلے مانس بیچ میں پڑے۔ اس سے معافی نامہ داخل کرایا اور مولوی صاحب نے اسے معاف کر دیا۔

مولوی نذیر احمد نے اپنی آخری عمر میں ایک کتاب "امہات الامہ" لکھی تھی۔ اس زمانے میں عام دستور تھا کہ پادری چوراہوں میں کھڑے ہو کر عیسائیت کی تبلیغ کرتے اور بہکا سکھا کر

لوگوں کو عیسائی کر لیتے۔ عیسائی پادریوں کے اُردو اخبار بھی اسی غرض سے جاری تھے اور اکثر کتابچے بھی عیسائی اداروں سے شائع ہوتے رہتے تھے۔ ایک پادری نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر غلط سلط اعتراضات کئے۔ بالخصوص ان کے ایک سے زیادہ نکاح کرنے پر۔ اس کا جواب چند علماء نے دیا۔ ایک جواب سر سید احمد خاں نے بھی لکھا اور مولوی نذیر احمد نے ایک پوری کتاب اس کے جواب میں لکھ دی۔ یہ کتاب ویسے تو ایک پادری کے احمقانہ اعتراضات کے جواب میں لکھی گئی لیکن فی الحقیقت تاریخ اسلام کا ایک بیش بہا باب ہے جو تعقّلی تنقید کی روشنی میں لکھا گیا۔ مولوی صاحب سے ادب کی رو میں یہ بے ادبی ہو گئی کہ انہوں نے آنحضرتؐ اور اہل بیتؑ جیسی مقدس ہستیوں کے ناموں کے ساتھ احترام کے الفاظ نہیں لکھے اور چند فقرے ایسے بھی لکھ گئے جو زبان کے اعتبار سے خواہ کتنے ہی صحیح کیوں نہ ہوں احترام بیان کے لحاظ سے ناموزوں بلکہ ہتک آمیز سمجھے گئے۔

اس کتاب کا چھپنا تھا کہ مخالفین نے خوب جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔ مولوی صاحب سے مطالبہ کیا گیا کہ یہ کتاب ہمارے حوالے کرو اور ہم اسے جلسہ کر کے جلائیں گے۔ یہ بات مولانا کو بہت ناگوار گزری اور انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر عوام میں آگ اور بھڑکائی گئی۔ علماء کا ایک جلسہ ہو رہا تھا۔ اس میں اُن کے خلاف کارروائی کی گئی۔ حکیم اجمل خاں کو مولوی صاحب کے پاس بھیجا گیا۔ وہ اس وعدہ پر کتابیں لے آئے کہ اپنے پاس محفوظ رکھیں گے۔ اور کیا یہ کہ کتابیں لا کر بھرے جلسے میں مولویوں کے حوالے کر دیں۔ کتابوں کے ڈھیر میں آگ لگا دی گئی اور اس کے مصنف کو کفر کا فتویٰ دے دیا گیا۔ مولوی صاحب اس جارحانہ کارروائی سے اس قدر دل ریش ہوئے کہ انہوں نے اس دن کے بعد قلم کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ اس کتاب کے سلسلے میں مولوی صاحب کہا کرتے تھے کہ اگر آج کل کے سارے مولوی مل کر مجھ پر دلائل کے ہتھیار سے حملہ کریں تو میں ان کے دلائل کو اس طرح کاٹ دوں گا جیسے قینچی کپڑے کو کاٹ دیتی ہے۔ اور کپڑا دوبارہ جُڑ نہیں سکتا۔ اس سارے ہنگامے کی بُنیاد بہت گھٹیا رقابت کے جذبے پر تھی۔ مولانا کے انتقال کے بعد کسی کو شکایت نہیں رہی۔ آج بھی دہلی کا فرزند نذیر احمد ہی ہیں جن کی کتابیں تعلیم گاہوں میں پڑھائی

جاری ہیں۔ جن کا ترجمۃ القرآن ہر گھر میں موجود ہے اور جن کا تعزیرات ہند کا ترجمہ تمام ہند و پاکستان کی عدالتوں میں رائج ہے۔

مولوی محمد حسین آزاد آخرِ عمر میں ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ ایک دن اپنے گھر سے غائب ہو گئے۔ پہلے لاہور میں انہیں تلاش کیا گیا پھر اور شہروں میں۔ مگر ان کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ کئی مہینے غائب رہنے کے بعد وہ ایکا ایکی دلّی میں رُونما ہوئے۔ لیریاں لگی ہوئیں۔ ننگے پاؤں۔ ننگے سر۔ پیروں میں چھالے، منہ پر خاک۔ چہرے پر وحشت، لال لال دیدے۔ سیدھے منشی ذکاء اللہ کے مکان میں گھس آئے۔ منشی ذکاء اللہ سے ان کا بچپن کا یارانہ تھا۔ وہ انہیں اس جنون کی کیفیت میں دیکھ کر لرز گئے۔ فوراً ان کے کپڑے بدلوائے۔ منہ ہاتھ دُھلوایا۔ معلوم ہوا کہ لاہور سے پیدل چلے تھے اور خدا جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتے دلّی پیدل ہی پہنچ گئے۔

ایک دن مولوی نذیر احمد منشی ذکاء اللہ کے ہاں پہنچے تو دیکھتے کیا ہیں کہ مولانا آزاد ایک مونڈھے پر بیٹھے ہیں اور دوسرے مونڈھے پر منشی ذکاء اللہ بیٹھے نائی سے حجامت بنوا رہے ہیں۔ نہ جانے مولانا آزاد کو کیا خیال آیا کہ اُٹھے اور نائی کے ہاتھ سے اُسترا چھین لیا اور بولے: "اے تو کیا حجامت بنائے گا ہم بنائیں گے۔" یہ کہہ کر منشی ذکاء اللہ کا گلا بنانے لگے اور سارا خط بھی بنا ڈالا۔ مولوی نذیر احمد نے بعد میں منشی جی سے کہا "اماں تم نے غضب کیا کہ اس جنونی کے آگے اپنا گلا کر دیا۔ اور جو وہ اڑا دیتا؟" منشی ذکاء اللہ نے کہا: "نہیں۔ آزاد تو ہمارا دوست ہے۔ ہمارا گلا نہیں کاٹ سکتا۔"

مولوی نذیر احمد کی پنشن پندرہ سو روپے ہر مہینے آیا کرتی تھی۔ اس زمانے میں نوٹوں کا اتنا دستور نہیں تھا۔ چاندی کا روپیہ لیا دیا جاتا تھا۔ جب پنشن کا روپیہ آتا تو مولوی صاحب کے آگے ایک چھوٹی میز پر بیس بیس روپے کی ڈھیریاں لگا دی جاتیں اور وہ ڈھیریاں سنبھال لیتے۔ اگر گھر کا کوئی چھوٹا بچہ کھیلتا ہوا ادھر آتا تو مولوی صاحب اُسے اٹھا کر روپوں کی چبوتری

پر بٹھا دیتے اور خوب ہنستے۔ پھر ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور وہ کہتے "جتنی میری پنشن آتی ہے اتنی ان میں سے کسی کی تنخواہ بھی نہیں آئے گی۔" اور ان کی یہ پیشین گوئی اب تک تو سچ ثابت ہو رہی ہے۔

مولوی عنایت اللہ صاحب فرماتے تھے کہ جب میرے والد صاحب کا انتقال ہوا تو میں نے ڈپٹی صاحب کو جا کر اطلاع دی۔ بہت رنجیدہ ہو کر بولے "تمہارے ابا نے جانے میں جلدی کی۔ ساتھ ہی چلتے۔" آبدیدہ ہو گئے اور کچھ نہیں فرمایا۔ منشی ذکاء اللہ ان کے ہم سن اور سب سے پرانے ساتھی تھے۔

میر ناصر علی

اللہ بخشے میر ناصر علی دلّی کے ان وضعدار شرفا میں سے تھے۔ جن پر دلّی کو فخر تھا۔ عجب شان کے بزرگ تھے۔ "بزرگ" میں نے انہیں اس لئے کہا کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا انہیں بزرگ ہی دیکھا۔ سوکھ کر چمرخ ہو گئے تھے۔ خشخشی ڈاڑھی، پہلے تل چاولی تھی، پھر سفید ہو گئی تھی۔ کتری ہوئی لبیں۔ پوپلا مُنہ۔ دہانہ پھیلا ہوا۔ بے قرار آنکھیں۔ ماتھا کھلا ہوا، بلکہ گُدی تک ماتھا ہی ماتھا چلا گیا تھا۔ جوانی میں سرو قد ہوں گے، بڑھاپے میں کمان کی طرح جھک گئے تھے۔ چلتے تھے تو پیچھے دونوں ہاتھ باندھ لیتے تھے۔ مستانہ وار جھوم کے چلتے تھے۔ مزاج شاہانہ، وضع قلندرانہ۔ ٹخنوں تک لمبا کُرتا گرمیوں میں موٹی ململ یا گاڑھے کا، اور جاڑوں میں فلالین یا وائلہ کا۔ اس میں چار جیبیں لگی ہوتی تھیں جنہیں میر صاحب کہتے تھے: "یہ میرے چار ذکر ہیں۔" گلے میں پٹکا یا گلوبند، سر پر کبھی کپڑے کی پچ گول ٹوپی اور کبھی صافہ۔ گھر میں رُوئی کا کنٹوپ بھی پہنتے تھے اور اس کے پاکھے اُلٹ کر کھڑے کر لیتے۔ جب چغہ پہنتے تو عمامہ سر پر ہوتا۔ اک بَرا پاجامہ، ازاربند میں کنجیوں کا گچھا۔ پاؤں میں نری کی سلیم شاہی، کسی صاحب بہادر سے ملنے جاتے تو انگریزی جوتا پاؤں میں اڑا لیتے۔

آپ سمجھے بھی یہ میر ناصر علی کون ہیں؟ یہ وہی میر ناصر علی ہیں جو اپنی جوانی میں بوڑھے سرسید سے اُلجھتے سلجھتے رہتے تھے۔ جنہیں سرسید ازراہِ شفقت "ناصحِ مُشفق" لکھتے تھے۔ "تہذیب الاخلاق" کے تجدد پسند رُجحانات پر انتقاد اور سرسید سے سخن گسترانہ شوخیاں کرنے کے لئے آگرے

انہوں نے "تیرھویں صدی" نکالا، اور نیچریوں کے خلاف ایسی دھڑتے سے مضامین لکھے کہ ان کی دھوم مچ گئی۔ "تیرھویں صدی" بند ہوا تو "زمانہ"۔ "زمانہ" کے بعد "افسانۂ ایام" اور "افسانۂ ایام" کے بعد "ناصری" نکالا۔ یہ بعد کے دونوں پرچے میر صاحب کے چھوٹے بھائی میر نصرت علی کے نصرت المطابع میں چھپتے تھے۔ جب میر صاحب پنشن لے کر دلّی ہی میں رہنے لگے تو انہوں نے اپنا ایک ہینڈ پریس لگا لیا۔ اور اس کا نام "مطبع ناصری" رکھا۔ ۱۹۰۸ء میں اسی مطبع سے میر صاحب نے "صلائے عام" شائع کرنا شروع کیا جو اُن کے سالِ وفات ۱۹۳۳ء تک چھپتا رہا۔ یہ سب پرچے اعلیٰ اردو لٹریچر کے لئے وقف تھے اور ان میں بیشتر مضامین میر صاحب ہی کے ہوتے تھے۔

"صلائے عام" کے دو مستقل عنوان تھے "پیرایۂ آغاز" اور "مضمونِ پریشان"۔ "پیرایۂ آغاز" رسالے کا دیباچہ ہوتا تھا جس میں میر صاحب مضامینِ نظم و نثر کا تذکرہ بڑے انوکھے انداز میں کرتے تھے۔ "مضمونِ پریشاں" ٹکڑے ٹکڑے مضمون ہوتا تھا جس کا ہر ٹکڑا ایک مکمل خیال پیش کرتا تھا۔ اسے دلِ صد پارہ یا ہزار جامہ سمجھنا چاہئے۔ میر صاحب پچیس سال تک اِن عنوانوں کے تحت خود لکھتے رہے۔ اور نت نئی بات کہتے رہے۔ نازک خیالی اور پاکیزہ بیانی ان کا شیوہ تھا۔ صاحبِ طرز ادیب تھے۔ ان کے اندازِ تحریر پر بہت سوں کو رشک آیا۔ بعض نے کوشش کر کے نقل اُتارنی چاہی۔ تو دو فقرے بھی نہ لکھے گئے اور خون تھوکنے لگے۔ اُردو میں انشائے لطیف کے موجد میر صاحب ہی تھے۔ ان کا اندازِ بیان انہی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ غضب کی علمیت تھی ان میں۔ انگریزی، فارسی اور اُردو کی شاید ہی کوئی معروف کتاب ایسی ہو جس کا مطالعہ میر صاحب نے نہ کیا ہو۔ کتاب اس طرح پڑھتے تھے کہ اس کے خاص خاص فقروں اور پاروں پر سُرخ پنسل سے نشان لگاتے جاتے تھے اور کبھی کبھی حاشئے پر کچھ لکھ بھی دیا کرتے تھے۔ ہزاروں لاکھوں شعر فارسی اور اُردو کے یاد تھے، حافظہ آخر تک اچھا رہا۔ انگریزی اچھی بولتے تھے اور اس سے اچھی لکھتے تھے۔ ساٹھ پینسٹھ سال انہوں نے انشا پردازی کی داد دی۔

جنگ کے محکمے میں ادنیٰ ملازم بھرتی ہوئے تھے، اعلیٰ عہدے سے پنشن لی۔ حکومت کی

نظروں میں بھی معزز ومعتبر تھے۔ "خان بہادر" کا خطاب ملا۔ دلّی میں آنریری مجسٹریٹ رہے اور پاٹودی میں نو سال چیف منسٹر۔

میر صاحب فارسی اور اردو اور انگریزی کے بہت بڑے عالم تھے مگر عربی واجبی ہی جانتے تھے۔ ان کے باپ دادا نہایت جید قسم کے علماء میں شمار ہوتے تھے۔ اور مناظرہ کرنے میں انہوں نے اتنی شہرت پائی تھی کہ امام المناظرہ کہلاتے تھے۔ مگر میر صاحب کو مذہبیات سے کوئی طبعی مناسبت نہیں تھی۔ انہوں نے باپ سے چھُپ کر انگریزی پڑھنی شروع کی تھی جب ان کے والد کو اس کی سُن گُن ملی تو بہت ناراض ہوئے اور انہیں سختی سے منع کیا۔ مگر میر صاحب کا مطالعہ جاری رہا اور اس کی پاداش میں انہیں گھر سے علیحدہ کر دیا گیا۔ فرماتے تھے کہ "گھر سے نکلنے کے بعد ہم نے عرب سرائے میں پانچ روپے مہینے کی ٹیوشن کر لی۔ عرب سرائے آنے جانے میں بہت وقت لگتا تھا، اس لئے ہم یہ کرتے کہ گھر سے دو کتابیں لے کر چلتے۔ ایک کتاب جاتے میں ختم کر دیتے اور دوسری آتے میں۔ یوں ہمارا راستہ بھی کٹ جاتا اور ہمارا مطالعہ بھی ہو جاتا۔" مطالعہ کی عادت انہیں ساری عمر رہی اور ساری دُنیا کا ادب اور فلسفہ انہوں نے چاٹ لیا۔

میر صاحب کو بحث مباحثہ کی عادت بالکل نہیں تھی۔ "سچ کہتے ہو، سچ کہتے ہو" کہہ کر ٹال جاتے تھے۔ اگر اتفاق سے کہیں اُلجھنا ہی پڑ جاتا تو ان کے علم کے سمندر میں جوار بھاٹا آ جاتا۔ بس پھر حریف کا جب تک بیڑا غرق نہ کر لیتے انہیں چین نہ آتا۔ عربی کی کمی کو بعض دفعہ بُری طرح محسوس کرتے تھے۔ معقولات میں تو بھلا کون ان سے جیت سکتا تھا البتہ جب کوئی منقولات پر اُتر آتا تو میر صاحب ایک دم سے خاموش ہو جاتے۔ فرماتے تھے کہ "مولوی صاحب عربی کے حوالے دینے لگتے ہیں، میں اس لئے خاموش ہو جاتا ہوں کہ ان کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی، اور وہ یہ سمجھ کر خوش ہو جاتے ہیں کہ دیکھو کس دھڑلے سے قائل کیا۔"

میر صاحب جب باتیں کرتے تو مُسکراتے بھی جاتے۔ ان کی باتیں عموماً ہنسی مذاق ہی کی ہوتی تھیں۔ انہیں کبھی کسی سے سنجیدہ گفتگو کرتے یا علمی بحث کرتے میں نے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ

ظرافت کی کوئی بات کہتے، اوروں کو ہنساتے اور خود بھی ہنستے۔ مگر ان کی ہنسی میں آواز نہیں ہوتی تھی۔ مولویوں کا مذاق اکثر اُڑاتے تھے۔ ایک دفعہ نہ جانے مولویوں کی برات میں کیسے جا پھنسے۔ دلہن والوں نے برات کو کھانا بھی دیا تھا۔ میر صاحب دسترخوان پر تو بیٹھ گئے مگر کھانا انہوں نے نہیں کھایا۔ ان کے ساتھ ان کا ایک کم عمر پوتا تھا۔ اُس سے بولے "تو کھا لے"۔ جب لڑکا کھا چکا تو میر صاحب بولے "لے جنّت میں جھاڑو نہیں دے گا تو مولوی ناراض ہو جائیں گے"۔ یہ کہہ کر ایک جغادری مولوی کی طرف دیکھ کر کہا "کیوں صاحب؟" اور پھر لڑکے سے بولے "رکابی کو اس طرح چاٹ کہ تُس بھی باقی نہ رہے۔"

میر صاحب کو اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی۔ ہر سال اپنی شادی کی سالگرہ منایا کرتے تھے۔ تیسرے پہر سے گھر والے اور قریبی عزیز جمع ہونے شروع ہوتے۔ کھانا پان ہوتا۔ بیوی دلہن بنتیں، مہمانوں کے ہالے میں آ کر بیٹھتیں اور میر صاحب انہیں ایک سونے کی انگوٹھی پہناتے۔ مبارک سلامت کا شور مچتا، ہنسی مذاق کی باتیں ہوتیں۔ اور ایک ایک کر کے رات گئے تک مہمان رخصت ہوتے۔ بیوی کے انتقال کے بعد میر صاحب بیس پچیس سال جیئے مگر انہوں نے دوسری شادی نہیں کی، اور ادب و فلسفے کے مطالعہ میں زیادہ منہمک ہو گئے۔

میر صاحب کی حویلی —— حویلی کاہے کو محل سرا کہنا چاہئے —— کے تین حصے تھے۔ زنانہ جس میں کُشادہ دالان در دالان، مغل محرابوں والے، ان پر ٹاٹ کے رُوئی بھرے دبیز پردے پڑے ہوئے۔ دالانوں میں دائیں بائیں کوٹھریاں تھیں۔ پیش دالان کے آگے صحن چبوترہ۔ اس کے پہلوؤں میں صحنچیاں۔ نیچے کے رُخ دائیں جانب ایک سہ دری تھی جس میں کیواڑ لگا کر کمرہ بنا لیا تھا۔ اس میں ان کی چھوٹی بہو رہتی تھیں۔ دالانوں کے اوپر آمنے سامنے دو بڑے کمرے تھے جن میں میر صاحب کے بڑے بیٹے اور اُن کا کنبہ رہتا تھا۔ جہاں زنانہ مکان کی حد ختم ہوتی تھی۔ اسی سے ملواں ایک اور حصہ تھا جس کا ایک دروازہ زنانے کے صحن میں کُھلتا تھا۔ اس حصہ میں ایک دالان تھا اور پہلو میں کمرے تھے۔ مکان کے اس حصے میں میر صاحب کا

کُتب خانہ اور نوادر خانہ تھا۔ زنان خانہ اور کتب خانہ کی پوری لمبان میں بازار کے رُخ ایک چوڑی پٹی پر مردانہ بنا ہوا تھا۔ نیچے بازار کے رُخ دکانیں اور محلسرا کا عظیم شان دار صدر دروازہ تھا جس کے بڑے بھاری کیواڑوں میں پیتل کی گُل میخیں جڑی ہوئی تھیں۔ اور ایک پٹ میں کھڑکی بھی کھلی ہوئی تھی۔ اس کے اندر ڈیوڑھی تھی جس میں ایک بڑے سے تخت پر دربان بیٹھا رہتا تھا۔ یہیں سے زنانہ مکان اور کتب خانے کو راستے جاتے تھے، بالاخانے پر دائیں طرف ایک برآمدہ تھا جس میں میر صاحب کا بیشتر وقت گزرتا تھا۔ اسکے پیچھے ایک سکرا کمرہ تھا جس میں میر صاحب کی مسہری اور کتابوں اور نوادر کی الماریاں تھیں۔ اس کے پیچھے ایک چوکور سا بڑا کمرہ یا ہال تھا جس میں ادبی نشستیں ہوتی تھیں۔ بعد میں اسی ہال میں باقی ماندہ کتب خانہ اور نوادر خانہ منتقل ہو گیا تھا کیونکہ نیچے سامان بہت چوری ہونے لگا تھا۔ میر صاحب کی ایک بیٹی مع اپنے خاندان کے اس خالی حصے میں اُٹھ آئی تھیں۔ اُوپر بائیں جانب بھی برآمدہ اور کمرہ در کمرہ تھا۔ یہ حصہ پہلے میر صاحب کے چھوٹے بیٹے کے تصرف میں تھا، پھر ان کے پوتے میاں انصار ناصری اس میں رہنے لگے تھے۔ یہ پورا مکان فراش خانہ میں "نمک والوں کی حویلی" کے نام سے مشہور تھا، کیونکہ میر صاحب نمک کے محکمے میں ملازم رہے تھے۔

جب میر صاحب پنشن لے کر دلّی آگئے تو یہ حویلی بڑی پُر رونق ہو گئی تھی۔ جہاں تک ممکن ہوتا تھا میر صاحب اپنی اولاد کو اپنے سے جُدا ہونے نہیں دیتے تھے۔ بڑے بیٹے نے یکے بعد دیگرے کئی ملازمتیں کیں، آخر ہار کر گھر بیٹھ رہے تھے اور "صلائے عام" کا سارا انتظام میر صاحب نے انہیں سونپ کر دو سو روپے ان کے مقرر کر دیئے تھے۔ چھوٹے بیٹے ملازمت کے سلسلے میں ہمیشہ باہر ہی رہے۔ زنانہ گھر میں دو بیاہی تیاہی بیٹیاں بھی رہتی تھیں۔ میر صاحب بڑے سیر چشم اور کنبہ پرور آدمی تھے۔ اولاد اور اولاد کی اولاد کو تو خیر پھرتے ہی تھے دُور پرے کے رشتہ داروں کا بھی خیال رکھتے تھے۔ ایک صاحب تھے جو کتابت کرتے تھے، خط بہت اچھا نہیں تھا مگر میر صاحب نے انہیں "صلائے عام" کی کتابت کرنے کے لئے رکھ لیا تھا۔

انہی صاحب کے ایک صاحب زادے تھے انہیں اپنے مطبعِ ناصری کا منیجر مقرر کر لیا تھا۔ جنرل منیجر میر صاحب کے بڑے صاحبزادے تھے۔ مطبعِ ناصری نیچے میر صاحب ہی کی دکانوں میں سے ایک میں تھا۔

بالاخانہ پر ایک بہت بڑی کُھلی ہوئی چھت تھی۔ جو دونوں طرف کے علے کے درمیان صحن کا کام دیتی تھیں۔ اس پر چاروں طرف پھولوں کے گملے لگے ہوئے تھے اور بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ بیچ میں بازار کے رُخ ایک گز اونچی کرسی دے کر سنگِ مرمر کا ایک شہ نشین نصب کیا گیا تھا۔ اُس میں بیٹھ کر بازار کی سیر کی جا سکتی تھی اور اسی حصے میں کبھی مشاعرے ہوتے اور کبھی "شبِ ماہ" منائی جاتی۔

"شبِ ماہ" چودھویں کے چاند میں منائی جاتی تھی۔ اس میں خاص اہتمام کیا جاتا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو ہر چیز سفید ہو۔ چنانچہ دھوپ ڈھلتے ہی چھڑکاؤ کیا جاتا، شام ہوتے ہوتے اُجلی اُجلی چاندنیوں کا فرش ہو جاتا۔ چاروں طرف سفید گاؤ تکئے لگ جاتے۔ چنگیروں میں چنبیلی اور موتیا کے پھول رکھے جاتے۔ اِدھر چاند کھیت کرتا اُدھر مہمان سفید بُراق انگرکھے دوبرا اور سفید دوپلیاں برسر آنے شروع ہو جاتے اور تکیوں کے سہارے بیٹھتے جاتے۔ پیچوانوں سے خمیرے کی لپٹیں اٹھتی رہتیں۔ چاندی کی تھالیوں میں گنگا جمنی ڈبیاں رکھی ہوتیں۔ بڑی ڈبیا میں پان، اُس سے چھوٹی میں چھالیہ، اس سے چھوٹی ڈبیوں میں کسی میں چھوٹی الائچیاں، کسی میں زردے کی ننھی ننھی گولیاں ورقِ نقرہ میں لپٹی ہوئیں۔ سفید بلور کے آب دانوں میں برف پڑی ہوئی، ان کے گرد گلاس سجے ہوئے۔ جلسہ شروع ہونے سے پہلے دودھ کے شربت کا دَور چلتا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد مہمانوں ہی میں سے کسی کو صدر بنا کر بٹھایا جاتا اور محفلِ مشاعرہ شروع ہو جاتی۔ ایسے ویسے کا یہاں بھلا گزر کہاں۔ دلّی کے چیدہ چیدہ اہلِ کمال بلائے جاتے تھے۔ ہندو مسلمان سبھی شریک ہوتے تھے۔ سب اپنا اپنا منتخب کلام سناتے اور خاطر خواہ داد پاتے۔ میر صاحب جیسے سخن سنج سے داد لینے کے سب مشتاق۔ میر صاحب کا داد دینے کا طریقہ سب سے نرالا ہے۔ وہ تڑپ

کر داد دینے کے قائل نہیں ہیں۔ بڑے سکون سے شعر سنتے ہیں اور بڑے اطمینان سے داد دیتے ہیں۔ شعر کے ایک ایک لفظ پر اُن کی نظر رہتی ہے "بھئی واہ۔ یہ لفظ اچھا آیا۔" "یہ ٹکڑا اس میں خوب کہا۔" "پہلا مصرع تو شاید کوشش کر کے میں بھی کہہ لیتا، مگر دوسرا مصرع تو میں کوشش کر کے بھی نہیں کہہ سکتا۔" "اگر تم یوں نہ کہتے تو میں ناراض ہو جاتا۔" غرض کوئی دو گھنٹے ڈھائی گھنٹے یہ مشاعرہ جاری رہتا اور اسی شائستگی کے ساتھ برخاست ہوتا اور سارے مہمان مطمئن و خوش رخصت ہوتے۔

میر صاحب کا کتب خانہ ایک زمانے میں دلّی کے بہترین کتب خانوں میں شمار ہوتا تھا۔ یوں تو اس میں تمام علوم کی کتابیں تھیں مگر تاریخ، ادب اور فلسفہ کی کتب کا ذخیرہ بے مثل تھا۔ افسوس کہ اس کتب خانے کی بہار اُن کی زندگی ہی میں لٹ چکی تھی۔ اس کی بیش بہا کتب چوری ہو کر کوڑیوں کے مول ردّی خریدنے والے کباڑیوں میں پہنچتی رہیں۔ میر صاحب اکثر اپنی کتابیں چپکے سے دوبارہ خرید لایا کرتے تھے پھر وہ اپنے لٹنے پر قانع ہو گئے تھے۔ اُن کے انتقال کے وقت بھی اُن کے لُٹے گھُٹے کتب خانہ میں چار ہزار کتابیں تھیں جو اُن کے ورثا میں تقسیم ہو گئیں اور ان کا کتب خانہ سخی کے دل کی طرح صاف ہو گیا۔

نوادر جمع کرنے کا بھی میر صاحب کو شوق تھا۔ کتب خانے کا ایک حصہ عجائب خانہ بنا ہوا تھا۔ اس میں قلمی تصویریں، خطاطی کے نمونے، قطعات، دست کاری کے اعلیٰ نمونے، تاریخی نوادر، قلمی کتابیں، سکے، اور بعض بے حد قیمتی چیزیں شامل تھیں۔ کتب خانہ اور عجائب خانہ میں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ جب میر صاحب خوب جانچ لیتے تھے کہ واقعی کوئی قدر دان آ پہنچا ہے تو اُسے ازراہِ نوازش خود اپنے ساتھ لے جاتے تھے، اور پھر غضب یہ کرتے کہ اس کا امتحان لیتے۔ "اچھا بتاؤ تمہیں اس تصویر میں کیا خوبی نظر آتی ہے؟" "میر پنجہ کش کی اس وصلی میں تم نے کیا بات دیکھی؟" اگر کسی نے کوئی قرینے کی بات جواب میں کہہ دی تو میر صاحب خوش ہو کر اُسے ایک ایک چیز دکھلاتے، اور اگر کوئی اینڈی بینڈی اس کے منہ سے نکل گئی تو میر صاحب

کی طبیعت مکدر ہو جاتی اور فرماتے "کیوں آپ اپنا اور میرا وقت ضائع کرتے ہیں؟ یہ آپ کے ذوق کی چیزیں نہیں ہیں، کہیں اور جا کر اپنا جی بہلایئے۔" اور باہر لا کر اُسے بڑی رُکھائی سے رخصت کر دیتے۔ اسی کھرے پن سے لوگ میر صاحب سے گھبراتے تھے اور اکثر انہیں سنکی سمجھتے تھے۔

میر صاحب کا تعلق چونکہ انگریز افسروں سے رہتا تھا اس لئے انہی کو خوش رکھنے کی تدبیریں کرتے رہتے تھے۔ ان کی یہ کمزوری اس قدر بڑھ گئی تھی کہ جو بھی انگریز دکھائی دیتا اُسے سلام کر لیتے۔ کہتے تھے کہ "کیا خبر کوئی بڑا افسر ہو یا کل کو یہی کوئی بڑا افسر بن کر آ جائے۔ فلاں صاحب کو دیکھو نا پہلے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں ادنیٰ افسر تھے، پھر محکمۂ نمک میں کمشنر بن گئے، اور اب دلّی کے چیف کمشنر بن کر آ گئے ہیں۔" مگر میر صاحب نے اپنی انگریز پرستی اور حکام رسی سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ ہمیشہ اُن کی خدمت کرنے پر آمادہ اور اُن پر احسان کرنے کی فکر میں لگے رہے۔ ایک دفعہ بہت کہنے سننے سے اپنے لڑکے کی سفارش کرنے ایک انگریز افسر کے پاس گئے۔ وہ میر صاحب کا بڑا پرانا قدر دان تھا۔ میر صاحب سے مل کر بہت خوش ہوا اور بار بار کہتا رہا "بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟" اور میر صاحب یہی کہتے رہے کہ "میں تو حضور کے سلام کو حاضر ہوا تھا۔" غرض صحیح گئے اور سلامت آئے۔ گھر والوں نے جب شکوہ کیا تو بولے "میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا مجھ سے کسی کی سفارش نہیں ہو سکتی۔" ایک دفعہ گھر والوں نے میر صاحب کو اس پر آمادہ کیا کہ آپ صرف اپنے لڑکے کو اپنے ساتھ لے جائیں، سفارش کچھ نہ کریں۔ میر صاحب بادلِ ناخواستہ چلے تو گئے اور صاحب بہادر اُن سے مل کر خوش بھی بہت ہوئے مگر جب انہوں نے پوچھا "یہ آپ کا لڑکا ہے؟" تو میر صاحب کی رگِ ظرافت پھڑک گئی۔ بولے "یہ تو اس کی ماں ہی بتا سکتی ہے۔" بات قہقہوں میں اڑ گئی اور لڑکے کو بے نیلِ مرام کے علاوہ پشیمان بھی لوٹنا پڑا۔

مگر میر صاحب انگریز سے بالکل دب کر نہیں رہ گئے تھے، کبھی کبھی انہیں حرارہ بھی آ جاتا

تھا۔ ایک دفعہ کسی یورپی مستشرق کو سلطان جی کی درگاہ دکھانے لے گئے۔ خواجہ حسن نظامی نے درگاہ کے دروازے پر ان کی پذیرائی کی۔ انگریز کے جوتے صاف کرا کے خواجہ صاحب نے درگاہ میں داخل کر دیا۔ مگر میر صاحب سے کہا "آپ جُوتے اُتار کر اندر آجائیے۔" میر صاحب اس امتیاز پر برہم ہو گئے۔ بولے "اگر جوتے اتارنا بے عزتی ہے تو میں اس گورے کے سامنے بے عزت ہو کر اندر جانا نہیں چاہتا۔" چنانچہ میر صاحب وہیں کھڑے رہے اور خواجہ صاحب انگریز کو درگاہ میں گھما لائے۔ واپسی پر خواجہ صاحب نے میر صاحب سے کہا "آپ عمامہ باندھے ہوئے ہیں اور مولویوں کا چُغہ بھی ہے پھر فُل بوٹ کیوں پہنے ہوئے ہیں؟" میر صاحب نے چیخ کر جواب دیا "پاؤں میں پہنا ہے سر پہ تو نہیں اوڑھا اور ہاں تم ایسے سوال کیوں کرتے ہو؟"

میر صاحب میں پُرانے فلسفیوں کی سی بد دماغی تھی۔ کبھی کبھی اُن پر زد بھی سوار ہو جاتی تھی۔ حد ہے کہ میر صاحب کی بیٹی کی شادی ہوئی تو وقتِ رُخصت دولہا نے حاضر ہو کر سلام کرنے کی اجازت چاہی۔ میر صاحب نے اجازت نہیں دی۔ اس پر دولہا والوں میں بڑی جُز بُز جُز بُز ہوئی۔ دولہا کے ماموں بھی خان بہادر تھے۔ انہوں نے کہلا بھیجا کہ اگر اجازت ہو تو میں ملاقات کے لئے حاضر ہوں؟ اس کا جواب یہ آیا کہ "آپ میری طبیعت سے واقف نہیں۔ میں آپ کے مذاق سے آشنا نہیں، آپ دولہا کے ماموں ضرور ہیں مگر اس کے یہ معنی تو نہیں کہ آپ میرا اور اپنا دونوں کا وقت ضائع کریں۔" چنانچہ برات یوں ہی رخصت ہو گئی۔

میر صاحب دراصل اپنے آگے کسی کو گردانتے نہیں تھے۔ نوجوانوں سے تو اور بھی بھڑکتے تھے۔ ایک خاصے نامی گرامی ادیب دلّی آئے تو فرطِ عقیدت سے میر صاحب کے گھر اُن سے ملنے پہنچ گئے۔ طوعاً و کرہاً میر صاحب نے انہیں باریابی کی اجازت دی۔ انہوں نے بنہایت ادب سے جھک کر سلام کیا۔ جواب ملا "بندگی"۔ وہ بے چارے سٹ پٹا گئے۔ گھبرا کر بولے "صلائے عام میرے نام جاری کر دیجئے۔ یہ پانچ روپے ہیں چندے کے۔" میر صاحب نے سر سے پاؤں تک انہیں دیکھا اور بولے "صلائے عام تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتا۔" یہ کہہ کر پھر کتاب پڑھنے لگے۔ عقیدت مند نے بڑی لجاجت سے کہا "آپ کو زحمت دینے کی معافی مانگتا ہوں۔" میر صاحب نے تنک کر کہا۔ "میاں صاحبزادے معافی کیا مانگتے ہو، بھیک مانگو بھیک!" وہ بے چارے اپنا سا منہ لے کر وہاں سے چلے آئے۔ غلط اُردو سُن کر میر صاحب آپے سے باہر ہو جاتے تھے۔

میر صاحب کی نظر ایک ایک لفظ پر رہتی تھی۔ لکھنے میں خود اتنے محتاط تھے کہ جو کچھ لکھتے تھے اسے بار بار پڑھتے تھے، اور اگلے دن صبح کو سب سے پہلا کام یہ کرتے کہ اپنے مضمون کی نوک پلک درست کرتے۔ ایک دن ایک صاحب ایک مضمون لکھ کر لے گئے جس کا عنوان تھا "داغ کی شاعری پر ایک نظر" میر صاحب نے عنوان دیکھتے ہی فرمایا: "ایک نظر کیوں؟ دو نظر کیوں نہیں؟" یہ کہہ کر مضمون واپس دے دیا۔ یوں بھی وہ "صلائے عام" میں گِنے بندھے آدمیوں کے مضمون چھاپتے تھے۔ جو شخص نواب سائل سے بے دھڑک کہہ دیتا ہو "ابے یار تُو تو نواب ہے، شاعر کہاں ہے" وہ بھلا کسی اور کی کیا رکھتا۔

میر صاحب کتابوں اور پُرانی چیزوں کی تلاش میں روزانہ عصر کے وقت فراش خانہ سے جامع مسجد تک پیدل جایا کرتے تھے۔ آندھی جائے مینہ جائے ان کا پھیرا ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ کمر پر ہاتھ باندھے ٹھیکیاں لیتے ہوئے چلتے۔ پیچھے پیچھے ایک مُلازم ہوتا جس سے گھریلو باتوں سے لے کر فلسفیانہ نکات تک بیان کرتے چلے جاتے، اور وہ "جی حضور، جی حضور" کہتا رہتا۔ چوک پر پہونچتے ہی کباڑیے اور پرانی کتابوں والے انہیں گھیر لیتے۔ "نواب صاحب، یہاں آیئے۔" "اجی ڈپٹی صاحب، دیکھئے کیا چیز رکھی ہے میں نے آپ کے لئے۔" "حضور دیکھئے کیسا تحفہ مال لایا ہوں۔" اور میر صاحب ایک ایک چیز کو دیکھتے، مول تول کرتے اور ٹکیوں کی چیز روپوں میں خرید کر خوش خوش گھر لوٹتے۔ کبھی بہت موج میں ہوتے تو کسی برابر سے گزرتے ہوئے لونڈے کے سر پر چپت جما دیتے۔ وہ پلٹ کر موٹی سی گالی دیتا تو یہ اُس گالی کا مزہ لیتے۔ "اوہو ہو ہو آہاہاہا۔ دلّی کا روڑا ہے، کیا پری دماغ پایا ہے۔" کرتے آگے بڑھ جاتے۔

اپنے بچوں سے اور بچوں کے بچوں سے میر صاحب کو بڑی محبت تھی۔ یوں تو ہوا سمجھ کر ان کے پاس ایک بھی نہیں پھٹکتا تھا۔ مگر تیسرے پہر کی چائے میں سب کو جمع ہونے کا حکم تھا۔ اس لئے خوب رول چول رہتی۔ مزے مزے کی باتیں ہوتیں۔ دن بھر کے گھریلو جھگڑے قصے چکائے جاتے، بسکٹ، پنیر، نمکین چیزوں کا دَور چلتا۔ میر صاحب چائے کے بڑے شوقین تھے۔ جس زمانے میں چائے آٹھ آنے پونڈ بکتی تھی۔ میر صاحب سبز چائے پانچ روپے پونڈ سے کم کی نہیں پیتے تھے۔ فرماتے تھے کہ اس سے زیادہ کی مجھ میں ہمت نہیں۔ جب پیالیوں میں چائے ڈالی جاتی" تو کہتے "سونے کا پانی ہے، سونے کا پانی" اور جب اس میں دودھ ڈالا جاتا تو کہتے "اوہو ہو، بادل اُٹھ رہے ہیں۔"

بد دماغی کے باوجود کبھی اپنی ناقدری کا ملال بھی انہیں ضرور ہوتا تھا۔ فرماتے تھے "کبھی کسی اہلِ کمال کی اُس کے وقت میں نہ قدر ہوئی ہے نہ ہو گی۔ اب ہر شخص کی زبان پر غالب اور مرزا غالب ہے۔ زندگی میں غریب کو کوئی پوچھتا تک نہیں تھا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ کرایہ کے ادنٰے مکان میں پڑے رہتے تھے بے چارے کو نہ گھر کا گھر نصیب ہوا نہ آرام سے کھانا نصیب ہوا۔ زندگی بھر مصیبتیں جھیلتے جھیلتے مر گئے۔ اب غالب پرستی شروع ہوئی ہے فرمایئے غالب کے کس کام کی؟" سُنتے چلے آئے ہیں کہ پہنے جگ بھاتا اور کھائے من بھاتا، مگر میر صاحب پہننے اور کھانے دونوں میں اپنی پسند کو ترجیح دیتے تھے۔ خوش خوراک اور نفیس مزاج آدمی تھے۔ کھانا پکانے پر رکاب دار خانساماں ان کے ہاں نہیں رکھا جاتا تھا، مامائیں رکھی جاتی تھیں۔ میر صاحب ازراہِ تفنن کہتے تھے کہ "جب تک آٹا گوندھنے میں چوڑیوں کی دھوون شامل نہ ہو روٹی میں مزہ کیسے آسکتا ہے؟" ویسے اُوپر کے کام پر بڈھے اور لڑکے ہمیشہ نوکر رکھے جاتے تھے۔ دونوں وقت کا کھانا زنانے میں سے پک کر آتا تھا۔ صبح اور تیسرے پہر کی چائے کا اہتمام مردانے میں خود کرتے تھے۔

یہ عجیب بات ہے کہ میر صاحب کو اپنی زندگی میں عورت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

بلکہ ایک طرح سے عورت سے مُتنفر کہے جا سکتے ہیں۔ ان کے کسی پرچے میں عورت کا کوئی مضمون یا غزل کبھی نہیں چھپی۔ کبھی کسی خاتون کا تذکرہ تک انہیں منظور نہ تھا۔ دراصل جب وہ مردوں ہی کو نہیں گانٹھتے تھے تو بھلا عورتوں کو کیا گھاس ڈالتے۔ مگر ان کی یہ نفرت بس اسی حد تک تھی۔ ورنہ عورت کی تعریف میں تو انہوں نے ایسے ایسے نفیس نفسیاتی نکتے بیان کئے ہیں کہ مہدی افادی جیسا بانکا ادیب بھی پھڑک کر کہتا ہے "میں آپ میں یونانیوں کی سی لطافتِ خیال پاتا ہوں۔" اور پھر میر صاحب ہی کے اندازِ بیان سے مُتاثر ہو کر اپنا وہ بے پناہ مضمون پیش کرتا ہے جس میں اس نے فلسفۂ حُسن و عشق بیان کیا ہے۔ میر صاحب کے مضامین میں عورت کے متعلق اَن گنت نشتر ہیں۔ ان میں سے چند یہاں نقل کرتا ہوں۔

"عورت جب منہ پھیر کر چلنے کے لئے اُٹھ کھڑی ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ یہ چاہتی ہے کہ کوئی دوڑ کر دامن پکڑ لے۔"

"عورت کے لئے اس قدر بس نہیں ہے کہ مرد کا دل ہاتھ میں رکھے بلکہ جب ہاتھ آجائے تو تنگ رکھے کہ یہی نسخۂ تسخیر ہے۔"

"اکیلے مے نوشی عیش میں داخل نہیں۔ کسی غارت گرِ دین آفتِ ہوش کے ساتھ اگر یہ دولت میسر ہو تو ایسے میں رحمتِ الٰہی پر ایمان نہ رکھنا ضعفِ عقائد میں داخل ہے۔"

"کسی کے خیال میں اپنی جان کو خوش رکھنا بُرا نہیں۔ خاص کر ایسی محبت جس میں یار کا مسکرانا یہ بتائے کہ ع

"نہ دیکھو اس وقت میں ہوتی ہوں بدنام"

"محبت وہ چیز ہے جو سامان و اسباب کی محتاج نہیں۔ محبت کے لئے ایک اکیلا دل چاہئے۔"

"عورت کیسی ہی آوارہ کیوں نہ ہو مگر پارسائی پر جان دیتی ہے۔"

"حسینوں کو شاعروں سے شاعر مزاج زیادہ پسند ہیں۔ ان کے لئے موزونیٔ طبیعت کا

ہے۔ ان کو اس خیال میں مزہ آتا ہے کہ کسی کو ہمارا خیال ہو اور ہمیں کسی کا۔"

"وہ حسین بھولنے کی چیز نہیں جو لڑکپن سے نکلتی جوانی میں کسی کے خیال میں ہو۔ ایسی عورت کو اپنے چاہنے والے سے بچھڑنے کی تاب نہیں کہ رات زیادہ گئی ہے۔ اس کی ایک رات الف لیلہ کی ہزار رات سے بہتر ہے۔"

"یہ عورت جو دامن کشاں جا رہی ہے اسکو آپ کی بے التفاتی کا رنج ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ آپ کسی اور کی طرف نہ دیکھیں۔"

"حسین عورت جب کسی سے بچ کر نکلے تو اُس کا اس قدر نقصان نہیں جس قدر کا پتہ ہے۔"

"آپ یہ نہ سمجھیں کہ مرد عورت سے بازی لے جاتا ہے۔ مرد اگر کسی عورت کو دغا دے تو بھی عورت ہی کا مارا سمجھئے۔"

"تمام عالم میں حسینوں کی کم سنی سے زیادہ کوئی چیز دل سے قریب نہیں۔ جن کی کھلی یا بندھی سر کی چوٹیاں درازیٔ عمر کا جواب ہیں۔"

"خدا نے عورت کو بالطبع عیش پسند پیدا کیا ہے۔ عورت کے لئے عیش سلطنت کا جلوس ہے۔"

"عورت کے پاؤں فرشِ مخملیں چاہتے ہیں۔ مرد کے پیر کانٹوں کے لئے بنے ہیں۔"

"مصائب میں عورت کا حال شاخِ گل کا سا ہے جو آندھی میں جھک جاتی ہے اور جہاں ہوا تھمی پھر سیدھی ہوگئی۔"

"عورت کا دماغ ہمیشہ بہار کا نمونہ سمجھئے جس میں خزاں کو دخل نہیں۔"

"عورت جس بات کا ارادہ کرے کر گزرتی ہے۔ اس لئے محبت میں زیادہ لطف اُس محبت کا ہے جو عورت کی طرف سے ہو کہ اگر عورت چاہے تو سو بہانہ سے ملے گی۔ وہی نہ چاہے تو ملنا معلوم۔

یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہئے!"

کہتے ہیں کہ محبت میں ہوش نہیں رہتا۔ میری رائے میں مرد کو ہوش نہیں رہتا۔ عورت کو ہوش رہتا ہے۔"

"عورت کو معلوم ہے کہ میں اکیلی بے کار ہوں۔ میری زندگی کا مدار دوسرے پر ہے۔ جو غیر جنس (مرد) ہے۔"

"عورت جس کی عملداری میں رہتی ہے اس پر حکومت کرتی ہے۔"

"یہ بات عورت کی علت میں داخل ہے کہ مُنہ چھپائے اور حُسنِ التفات کا دعوٰے کرے۔"

"عورت کو چُپکے ہی چُپکے گھر میں جان دیتے سُنا۔"

"مرد عشق کرتے ہیں مگر عورت عشق مجسم ہے۔"

"عورت میں محبت کے سوا کسی چیز کی قابلیت ہی نہیں۔"

"محبت بغیر عورت جی نہیں سکتی۔ مرد اور طرح بھی جی سکتا ہے۔"

"عورت کے دل میں محبت جس قدر جلد اثر کرتی ہے اُسی قدر دیرپا بھی ہے۔"

"عورت کے لئے نری پارسائی کافی نہیں۔ دل رُبائی اور دل فریبی بھی ضروری ہے۔"

میر صاحب کی آدم بیزاری کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ طوالتِ عمر کی وجہ سے ان کے تقریباً سارے ساتھی ایک ایک کرکے اُٹھ گئے تھے اور وہ اس بھری دُنیا میں اکیلے رہ گئے تھے۔ حدیہ کہ اُن کے چھوٹے بھی اُن کے سامنے ہی رخصت ہوگئے۔ مولوی نصرت علی' میر صاحب کے چھوٹے بھائی جو تین سال چھوٹے تھے اُن سے چھ مہینے پہلے سدھار گئے۔ یہ بھی عجب شان کے بزرگ تھے۔ سو سے زیادہ اُن کی تصانیف ہیں' ایک لُغت بھی انہوں نے سات زبانوں کی مرتب کی تھی۔ اپنا چھاپہ خانہ اور اپنا اخبار تھا۔ سالہا سال تک ان کا اخبار چھپتا رہا مگر آج نصرت علی مرحوم کو کوئی بھی نہیں جانتا۔ خود میر ناصر علی کو لوگ اُن کی زندگی ہی میں بھول گئے تھے۔ ان کے مرنے پر جب "ناصر نمبر" ساقی نے نکالا تو لوگ چونکے کہ ہائیں' کوئی اتنا بڑا ادیب بھی تھا جو مر گیا! کتنی بے رحم ہے موت اور کتنا بے رحم ہے زمانہ! ناصر علی کی موت

پر ریاحین اور دل گیر جیسے دو چار بُڈھے ٹھڈے رہ گئے اور بس۔ ہماری بے حسی تو بفضلہٖ اس دیہاتی عورت کی طرح قائم ہے جس نے اکبر بادشاہ کی سناونی سُن کر کہا تھا کہ "جب چھیدو کا باپ نہ رہا تو اکبر کیسے رہ جاتا۔"

میر صاحب بڑے سمجھ دار آدمی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بڑھاپے میں آدمی کس بٹے کو پہنچ جاتا ہے۔ کسی انگریزی کتاب میں انہوں نے پڑھا تھا کہ بڑھاپے میں سب سے دور رہنا ہی ٹھیک ہوتا ہے۔ جب آدمی ساٹھ سال کا ہو جائے تو اُسے اپنی زندگی یکسر بدل لینی چاہیئے۔ اپنی صورت شکل اور لباس کا زیادہ خیال رکھنا چاہیئے۔ اس سے جی ذرا ہلکا رہتا ہے۔ کوئی نہ کوئی مشغلہ اس عمر میں ضرور ہونا چاہیئے۔ ساٹھ سے نوّے سال کی عمر تک جنازوں میں شریک نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کو دفنانے کے بعد اپنے دفنائے جانے کی باری آجاتی ہے۔ شادی بیاہوں میں اور عام جلسوں میں شرکت مناسب نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان سے اُلجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور اُلجھنوں سے عمر کم ہوتی ہے۔

میرے والد سے میر صاحب کے گوناگوں تعلقات تھے، عزیزداری کے، مضمون نگاری کے، وظیفہ خواروں کی انجمن کے۔ مگر میر صاحب کو میں نے ان کے جنازے میں نہیں دیکھا۔ بعد میں پُرسا دینے البتہ آئے تھے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی بولے "چلا گیا۔ ہمارا یار چلا گیا۔ جلدی چلا گیا۔ اچھا آدمی تھا۔"

مضمون نگاری، مطالعہ اور نوادر جمع کرنا، یہ سب شغلے ایسے تھے کہ ان کے بعد میر صاحب کو نہ تو کسی سے ملنے کی فرصت ہوتی تھی نہ ضرورت۔ بچوں کے بچوں سے ان کا جی بہلتا ہی رہتا تھا، کوئی ملنے آجاتا تو انہیں طبیعت پر جبر کرکے اُس سے ملنا پڑتا۔ جانتے تھے کہ کم علمی کی اور بیکار باتیں کرے گا، اس لئے رکھائی سے ملتے تھے۔ طبیعت بھی بڑی بے نیاز پائی تھی۔ نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا۔ ساری عمر ان کے قدر دان ان سے اصرار کرتے رہے کہ اپنے مضامین کے منتخب مجموعے چھاپ دیجئے۔ مگر انہوں نے کبھی اس کا خیال بھی نہیں کیا۔ میر صاحب کوئی ساٹھ

برس کے ہوں گے جب مہدی افادی نے مجموعۂ مضامین نہ چھاپنے کے سلسلے میں انہیں لکھا تھا۔

> "اس پاکیزہ مجموعے کی ترتیب سے اُردو ادبِ عالیہ میں آپ کی طرف سے مستقلاً قیمتی اضافہ ہوتا جو یادگارِ زمانہ رہتا۔ آپ معاف فرمائیں گے یہ بدترین حق تلفی تھی جو آپ اپنی کر سکتے تھے ......"

خود مہدی نے اس مجموعے کا نام "افاداتِ ناصری" بھی تجویز کر دیا تھا۔ مگر مہدی مر گئے اور مجموعہ شائع نہ ہوا۔ اس تجویز کے کوئی بیس سال بعد انصار ناصری اور میں نے ڈرتے ڈرتے میر صاحب سے اجازت چاہی کہ ہم اس خدمت کو انجام دیں۔ میر صاحب اس پر رضامند ہو گئے تھے اور "افاداتِ مہدی" بھی اُن کی نظر سے گزر چکی تھی۔ انصار ناصری نے میر صاحب کی کتاب کا نام "افاداتِ ناصری" رکھنا چاہا تو میر صاحب چیں بہ جبیں ہو کر بولے "میں مہدی سے گھٹ کر نہیں رہنا چاہتا۔ میں نے مقاماتِ حریری اور مقاماتِ حمیدی کے وزن پر "مقاماتِ ناصری" سوچا ہے۔" مگر میر صاحب کی علالت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ وہ انتخابِ مضامین کا کام نہ کر سکے اور پھر اُن کا وقتِ آخر آ پہونچا، اُن کے مرنے کے بعد اور بہتیرے بکھیڑے پھیل گئے۔ اور یہ کام رہ ہی گیا۔

میر صاحب وضعدار ایسے تھے کہ ساری عمر اُن کے لباس میں کوئی فرق نہیں آیا۔ "صلائے عام" ۲۵ سال جاری رہا۔ پہلا پرچہ جس کاتب نے لکھا تھا آخر کے پرچے تک وہی کتابت کرتا رہا۔ پریس میں بھی شروع سے آخر تک ایک ہی رہا۔ آخر آخر میں "صلائے عام" کی اشاعت جب بہت کم ہو گئی تو صرف سو سوا سو پرچے چھپتے اور قدر دانوں میں تقسیم ہو جاتے۔ میر صاحب اس کے لئے دو سو روپے ماہوار آخر تک دیتے رہے اور پرچہ بند کرنے کو اپنی وضعداری کے خلاف سمجھتے رہے۔ اپنے کسی پرچے میں کبھی کوئی اشتہار نہیں چھاپا۔ روزانہ شام کو جامع مسجد کا پھیرا ضرور ہوتا تھا جب تک ان کے دوست احباب جیتے رہے ان سے ملنے اور بازدید کے لئے جاتے رہے۔ نماز پابندی سے نہیں پڑھتے تھے مگر جب پڑھتے تو بڑے خضوع و خشوع کے ساتھ۔ کبھی کبھی یوں ہی

سجدے میں پڑ جاتے۔ عید، بقر عید کے موقع پر گھر کے سب چھوٹے بڑوں کو جمع کر کے عید گاہ ضرور جاتے تھے۔ آخری بقر عید کے موقع پر سخت تکلیف میں مبتلا تھے مگر عید گاہ جا کر ہی نماز ادا کی۔ عید کے دن خاندان کے کُل افراد کو دوپہر کے کھانے پر جمع کرتے تھے۔

میر صاحب کو برش سے دانت مانجھنے کی عادت تھی۔ ایک ایک کر کے سب دانت رخصت ہو گئے۔ آخر میں صرف ایک دانت رہ گیا تھا۔ اس کے لئے بھی برش اور کریم کا اہتمام کرتے تھے۔

میر صاحب کو ہزاروں شعر یاد تھے۔ شعر کا برجستہ مصرف اُن سے بہتر کہیں اور نہیں دیکھا۔ لکھنے میں بھی شعر بہت لکھتے اور بولنے میں بھی بات بات پر شعر پڑھتے تھے۔ جب حبسِ بول کی شکایت بڑھ گئی تو میر صاحب زندگی سے مایوس ہو گئے تھے۔ فرماتے تھے ؎

ختم ہی سمجھو زندگی کے دن + کچھ ورق اور ہیں فسانے کے

انتقال سے چار دن پہلے کا واقعہ ہے کہ مرض الموت کی شدت میں مُبتلا تھے۔ ضُعف سے آنکھ نہ کُھلتی تھی۔ ان کے صاحب زادے نے دل بہلانے کے لئے کہا "دیکھئے آپ کے بیٹے بیٹیاں، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں، سب آپ کی خدمت کے لئے جمع ہیں۔ کیا انہیں دیکھ کر آپ کو خوشی نہیں ہوتی؟" مُتبسّم ہو کر بولے ع

"ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کرے؟"

مرنے سے کچھ دیر پہلے جب اُن سے پوچھا گیا کہ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ تو فرمایا ؎

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے!

میر صاحب کی آخری آرزو ان کے ایک خط میں درج ہے۔ یہ خط انہوں نے اپنے بیٹے انتصار علی صاحب کو لکھا تھا۔

خط کی نقل حاصل کر کے درج کی جاتی ہے۔

"بیٹا

میری ایک آرزو یہ ہے کہ کتب خانے والا مکان تکلف سے آراستہ ہو جائے اور میں دن رات وہیں پڑا رہوں۔ تم اگر ساتھ چاء پینے آ جاؤ تو کیا کہنا مگر کوئی معمولی ذکر کسی کا نہ ہو۔ کھانا جب مجھے بھوک لگے، پکا پکایا مل جائے، اور کوئی لڑکی آ کر کھلا جائے۔ کوئی نایاب کتاب یا چیز نظر آئے تو مجھے اتنا مقدور ہو کہ فوراً خرید لوں۔ رات کو بے فکر سوؤں اور صبح خوش اُٹھوں۔ کوئی مسئلہ فلاسفی کا جو سمجھ میں نہ آتا ہو اُسے سمجھ لوں اور دوسروں کو سمجھا سکوں۔ دُنیا کی جتنی کتابیں دل و دماغ کو خوش کر سکیں سب میرے پاس ہوں۔ جاڑے میں انگیٹھی ہو اور گرمی میں برف۔ برسات میں کمرے کے اندر بیٹھا ہوں اور وہ ٹپکتا نہ ہو۔ رات کو جلانے کے واسطے خوب صورت CANDLE-STICK کی روشنی ہو، اور جو کتاب مجھے پسند ہو وہ میرے سامنے ہو۔ تم اتنا سامان میرے لئے کر دو تو I WILL DIE HAPPY"

یہ نفیس مزاج انسان ۱۹۳۳ء میں ہم سے رخصت ہو گیا۔ سیماب اکبر آبادی نے "میر ناصر علی خاں" سے تاریخِ وفات ۱۳۵۲ھ نکالی۔

اُستاد بیخودؔ دہلوی

دلی کے اردو بازار میں کُتب خانہ علم و ادب ادیبوں اور شاعروں کا ایک اچھا خاصہ اڈا بن گیا تھا۔ یوں تو چلتے پھرتے سبھی یہاں ٹھیکی لیتے تھے مگر مغرب کے بعد یہاں بطور خاص ادیبوں کا پھڑ جمتا تھا۔ آندھی جائے مینہ جائے یہاں آنے والوں کا پھیرا ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ ایک تو مرکزی جگہ، دوسرے کتب خانے کے مالک سید وصی اشرف کی خوش اخلاقی شام پڑتے ہی سب اپنے اپنے گھروں سے چل کر کتب خانہ پر پہنچ جاتے۔ روز کے آنے والوں میں ظفر قریشی، اخلاق احمد، صلاح الدین قریشی، صادق الخیری، نہال سیوہاروی، فہیم بیگ چغتائی، میر صاحب۔ نام پوچھنے کی کبھی نوبت ہی نہ آئی، بہار کے رہنے والے تھے، حکیم حبیب اشعر اور محمد میاں تھے۔ دو تین گھنٹے مزے مزے کی باتیں ہوتیں۔ چائے کے دور چلتے۔ یہ چائے دو طرح کی ہوتی تھی۔ ایک تو وہ جو وصی اشرف اخلاقاً پلاتے تھے، اور دوسری وہ جو جُرمانے میں پلائی جاتی تھی۔ یہ جُرمانہ شاعروں سے بچنے کیلئے عاید کیا گیا تھا۔ دراصل ہوا یہ کہ شاعروں نے بھانپ لیا کہ یہاں شام کو چند شریف آدمی جمع ہوتے ہیں۔ بس پھر کیا تھا، اللہ دے اور بندہ لے۔ شاعروں نے یلغار شروع کردی۔ شروع شروع میں تو تکلف میں انہیں سُنا، پھر مروّت میں، مگر جب جان ضیق میں آگئی تو تکلف اور مروّت دونوں کو بالائے طاق رکھا اور صاف صاف کہہ دیا جاتا کہ یہاں کا دستور کچھ اور ہے۔ وہ یہ کہ جو صاحب اپنے کلام بلاغت نظام سے مستفیض فرمانا چاہیں وہ سامعین کے کام و دہن کو بھی چائے سے فیض پہنچائیں، چنانچہ شاعروں کی یورش ختم ہوگئی۔

اس پر بھی قراقرِ شعر نے بہت سوں کو چین سے بیٹھنے نہ دیا اور شاید ہی کوئی منحوس دن ایسا گزرتا ہو کہ جرمانے کی چائے نہ پی جاتی" مزا اور تو اور آپس کے بیٹھنے والے بغلی گھونسہ بن جاتے۔ اچھے بچے بیٹھے ہیں کہ لگے پہلو بدلنے سارے بھئی خیر تو ہے؟ کسی نے برابر سے کہا "شعر لگ رہا ہے شاید!" اور نہالؔ نے جھٹ گلے میں باہیں ڈال کر بڑی لجاجت سے کہا "بھائی غزل ہوگئی ہے سُن لو" کہا "بھائی سب کو چائے پلانی پڑے گی"۔ بولے "منگوا لیجئے"۔ مرزا جی چائے والے کا لڑکا تو آتے کا تانتا ہی رہتا تھا۔ جھٹ لے آتا۔ نہالؔ ترنم سے اپنی غزل سنانی شروع کرتے تو اخلاق احمد کہتے "دیکھو بھئی تحت اللفظ کی ہوئی تھی۔ اگر تم ترنم سے سنانی چاہتے ہو تو بسکٹ بھی ہوں گے"۔ نہالؔ کہتے "اچھا بسکٹ بھی منگا لو"۔ چنانچہ سب کے لئے ایک ایک نمکین بسکٹ بھی آجاتا۔ پھر غزل سُنی جاتی۔ دھواں دھار واہ واہ ہوتی۔ نہالؔ مرحوم نہالم نہال ہوجاتے۔ کبھی کبھی مرزا فہیم بیگ چغتائی اپنا موٹا سا ڈنڈا ہلاتے ہوئے آتے، اور آتے ہی اعلان کردیتے کہ "آج مُجوانوں نے غزل کہی ہے۔ چائے منگوائیے سید صاحب"۔ سید وصی اشرف فوراً چائے کا آرڈر دیدیتے، اور مرزا صاحب کی غزل کا سب لطف اُٹھاتے۔ یہ اجتماع اتنا دلچسپ ہوتا تھا کہ وصی اشرف اپنی دکان داری بند کردیتے تھے۔ اگر کوئی جاننے والا آکر کتاب مانگتا تو کہہ دیتے کہ اب تو وقت ختم ہوگیا، اور اگر کوئی انجانا آجاتا تو کہتے "کل دن کو آپ آئیے۔ منگوا رکھوں گا"۔ غرض رات کے دس بجے تک خوب رونق رہتی۔

انہی روز کے آنے والوں میں سے ایک حضرت بیخودؔ دہلوی بھی تھے جو مغرب کے لگ بھگ ایڈورڈ پارک کی طرف سے ٹُکٹے ٹُکٹے آتے تھے۔ عمر زیادہ ہو جانے کی وجہ سے وہ کچھ ربگے ہو گئے تھے۔ دونوں ٹانگیں کمان کی شکل کی ہوگئی تھیں۔ اور انہیں چلنے میں خاصی زحمت ہوتی تھی۔ مگر وہ شام کو مٹیا محل سے ایڈورڈ پارک تک ضرور جایا کرتے، اور واپسی میں کتب خانہ پر ٹھیکی لیتے۔ کبھی کتب خانہ کے سامنے ہی کرسی پر بیٹھ جاتے اور کبھی اندر جا بیٹھتے۔ وصی اشرف صاحب کے والد سید علی اشرف صاحب بڑے نیک اور پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ عمر میں بیخود صاحب

سے کچھ چھوٹے تھے مگر بیخودؔ صاحب کو ان سے بڑی عقیدت تھی اور اکثر چِٹے والی پہاڑی کی چڑھائی چڑھ کر اُن کے پاس جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ تو گھر میں بڑی ہنسی پڑی۔ سید صاحب کی ڈیوڑھی پر ایک آدمی رہتا تھا۔ یہ سید صاحب کا مُرید بھی تھا، دربان بھی اور وفادار خادم بھی، مگر بڑا سادہ لوح۔ ایک دن بیخودؔ صاحب نے آواز دی۔ میاں مُرادی نے پوچھا "آپ کا نام؟" انہوں نے کہا۔ "بیخودؔ"۔ اندر جا کر میاں مُرادی نے فرمایا "بے وقوف صاحب آئے ہیں"۔ سید صاحب کی تیوری پر پہلے تو بل آیا مگر فوراً ہی سمجھ کر مُسکرا دیئے اور بیخودؔ صاحب کو اپنے پاس اندر بُلوا لیا۔ وہ تو خدا نے بڑی خیر کی کہ بیخودؔ صاحب کو میاں مُرادی کے توارد کی خبر نہیں ہوئی۔ ورنہ وہیں لتے لے ڈالتے۔

ہاں تو وصی اشرف صاحب سے بیخودؔ صاحب کو دوگونہ تعلقِ خاطر تھا۔ ایک تو اُن کے والد کے تقدس کی وجہ سے اور دوسرے ان کے سرمایۂ کتب کے باعث۔ بیخودؔ صاحب کو کتابوں کی چاٹ پڑ گئی تھی۔ روزانہ ایک ناول لے جاتے اور اگلے دن واپس کر کے دوسرا لے جاتے۔ وصی اشرف نے انہیں بڑھیا سے بڑھیا اور گھٹیا سے گھٹیا سارے ہی ناول چٹا دیئے مگر بیخودؔ صاحب ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ "میاں اس میں مزہ نہیں آیا۔ کوئی اور دو"۔ اور وصی اشرف دلّی کے جوتے والوں کی طرح روز انہیں ایک تُرنذ (تحفہ) ناول دیتے اور وہ اُسے اپنے بڑے سے ململی رومال میں لپیٹ کر لے جاتے۔ پڑھتے صرف ناول ہی تھے۔

بیخودؔ صاحب اُس وقت اسّی سے اوپر ہو چکے تھے۔ ہاتھوں میں رعشہ آ گیا تھا۔ چہرہ چُرمُرا کر رہ گیا تھا۔ رنگ گُھٹا ہوا گندمی، سفید براق سرسیدی ڈاڑھی، لمبی ترشی ہوئیں، اتنی عمر ہونے پر خاصے ٹانٹے تھے اور سیدھے چلتے تھے۔ بتیسی پوری نقلی چڑھی ہوئی تھی۔ جس کا تالو اکثر ڈھیلا ہو جاتا اور بات کرنے میں پورا جبڑا نیچے آ رہتا، پھر اُسے چبا کر ٹھیک کرتے تو بات کرتے۔ لہجہ خاص دلّی والوں کا تھا۔ تکلف سے بری، اور آواز اُونچی اور کراری تھی۔ جب موج میں آتے تو بے ساختہ گالیاں بھی شروع کر دیتے۔ مگر بڑی برجستہ۔ اور جب انہیں جلال چڑھتا تو

پھر چھوٹے بڑے کا ادب لحاظ بھی اُٹھ جاتا۔ ایک دفعہ ٹاؤن ہال میں بہت بڑا مشاعرہ ہوا۔ بیخودؔ صاحب نے مُدتوں سے مشاعروں میں جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ اور غالباً سرکاری مشاعرہ تھا۔ کنور مہندر سنگھ وغیرہ منت سماجت کر کے انہیں لے گئے۔ بیخودؔ صاحب نے نئی غزل کہی اور مشاعرے میں پہنچ گئے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آگے کی قطاروں میں خواتین بھی تھیں۔ مشاعرہ خوب گرم ہو رہا تھا۔ بیخودؔ صاحب ڈائس پر پہنچے تو اُستاد کے نام کی آوازیں پڑنے لگیں۔ یوں بھی اُستاد زیادہ دیر کب بیٹھنے والے تھے، یاد نہیں کون صاحب صدارت کر رہے تھے، مشاعرے میں انتشار پیدا ہوتا دیکھ کر اُستاد ہی کے نام کا اعلان کر دیا۔ بیخودؔ صاحب خود نہیں پڑھتے تھے۔ ان کا ایک خوش آواز شاگرد تھا، وہ پڑھا کرتا تھا۔ اُس دن اتفاق سے وہ شاگرد ساتھ نہیں تھا۔ ایک اور شاگرد تھا، وہ نہ صرف بدآواز تھا، طبع موزوں بھی نہ رکھتا تھا۔ بیخودؔ صاحب نے اُسے اپنی غزل دی اور وہ بڑے اہتمام سے اُسے پڑھنے بیٹھا۔ مگر جب اسنے مصرعے ناموزوں پڑھنے شروع کئے تو ہال میں ہنسی پھیلنے لگی اور کچھ آوازے تاوزے بھی کسے جانے لگے۔ بیخودؔ صاحب پہلے تو اسے داد کھیے، پھر جو معلوم ہوا کہ بیداد ہو رہی ہے تو مارے غصّے کے بے آپے ہو گئے۔ وہیں سے مُغلّظات شروع کر کے شاگرد کی طرف کھسکے اور اس کے ہاتھ سے غزل چھین کر مائکروفون پر اُسے گالیاں دینی شروع کیں۔ مشاعرے میں کھلبلی پڑ گئی اور ایک شورِ قیامت برپا ہو گیا۔ بارے بیخودؔ صاحب کا کرملا کا سُنائی دیا اور انہوں نے اپنے شعر تحت اللفظ پڑھنے شروع کر دیئے۔ ہال میں سنّاٹا چھا گیا۔ شعر ختم ہوتا تو داد کا شور بلند ہوتا۔ سبحان اللہ! غزل کا تو ان کی جواب ہی نہ ہوتا تھا۔ مشاعرہ انہی کے ہاتھ رہا۔

بیخودؔ صاحب کے ہاتھ سے ہزار دانہ کبھی نہ چھُوٹتا تھا۔ ہر وقت تسبیح گھومتی رہتی تھی۔ باتیں بھی کرتے جاتے ہیں اور دانے بھی کھٹا کھٹ چل رہے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ ان کے بالکل قریب بیٹھ کر کنکھیوں سے اُن کے کُھلے ہوئے مُنہ میں جھانک کر دیکھا، زبان تالو سے ٹکراتی اور نیچے آ جاتی، اُوپر جاتی پھر نیچے آ جاتی، اور یہی زیر و بم جاری رہتا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ وہ "اللہ" کا ورد کرتے تھے۔

بجّو صاحب اپنے وقت میں گوروں کو پڑھایا کرتے تھے اس لحاظ سے انگریزی اچھی خاصی جانتے ہوں گے، مگر ہم نے اُن کے مُنہ سے کبھی کوئی انگریزی کا لفظ نہیں سُنا۔ ان کے گوروں کو پڑھانے کا ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک دفعہ دو تین مہینے کے لئے انہیں دلّی سے کہیں باہر جانا پڑ گیا۔ شاگردوں سے انہوں نے چھٹی لے لی۔ ایک شاگرد کا امتحان قریب آ پہنچا تھا۔ اس نے اپنے کسی سویلین دوست سے کہہ کر اسکے دفتر کے ایک کلرک کو لگا لیا۔ کلرک سے اس نے پوچھا پڑھانے کا کیا لوگے؟ اس نے اپنی دانست میں بہت بڑھا کر پندرہ روپے ماہوار بتائے۔ اس زمانے میں کلرک کو پچیس روپے تنخواہ ملتی تھی۔ درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا، اور تین مہینے میں وہ گورا فروٹ ہو گیا۔ اسنے ماسٹر کو پندرہ روپے مہینہ بھی دیا اور کچھ انعام بھی اور بولا۔ "ہمارا اپلا منشی پچاس روپے لیتا تھا اور اس نے ہمیں ایک سال میں کچھ بھی نہیں پڑھایا"۔ بجّو صاحب جب لوٹ کر آئے تو دیکھا کہ شاگرد تو فارغ التحصیل ہو چکا ہے۔ پوچھا یہ کیا ماجرہ ہے؟ معلوم ہوا کہ فلاں فلاں شخص نے کورس ختم کرا دیا۔ بجّو صاحب اسے کچھ جانتے تھے۔ اس کے پاس پہنچے اور بولے "میاں اب کیا ــــ لوگے؟ ان لوگوں کو کہیں اس طرح پڑھایا جاتا ہے؟ تمہیں اپنے شہر کے اُس جرّاح کا قصہ یاد نہیں جو قصائی کے لڑکے کا علاج کیا کرتا تھا؟" پوچھا "چگونہ بودہ است آں حکایت؟" فرمایا "ایک قصائی کا لڑکا تھا۔ اس کے پاؤں میں ہڈی کی کرچ چبھ گئی اور زخم پک گیا۔ قصائی اُسے لے کر جرّاح کے پاس پہنچا جرّاح روزانہ اس کی مرہم پٹی کرتا اور معاوضہ میں آدھ سیر گوشت پاتا۔ یہ سلسلہ دنوں چلتا رہا۔ ایک دن جرّاح کسی وجہ سے دُکان پر نہ جا سکا۔ اس کے لڑکے نے تمام پھنسی پھوڑوں والوں کی دیکھ بھال کی۔ شام کو باپ نے پوچھا "سب کے کام ہو گئے تھے نا؟" بیٹے نے کہا "ہاں کام تو سب کے ٹھیک ہو گئے، مگر وہ جو قصائی کا لڑکا آتا ہے اُس کے زخم سے آج ہڈی کی ایک کرچ نکلی، وہ میں نے نکال کر پھینک دی"۔ باپ نے کہا "بے غضب کر دیا تو نے! اب کیا خاک کھائے گا! اے وہی ہڈی تو آدھ سیر گوشت روز کھلا رہی تھی"۔ تو میاں ماسٹر صاحب ان حرام زادوں کو اس طرح نہیں پڑھایا جاتا جس طرح تم نے پڑھایا کہ تین مہینے میں سب کچھ اسے چٹا دیا۔ اگر ہم اس طرح پڑھائیں تو بس کھا کما چکے"۔

بجّو صاحب کو جن اُتارنا بھی آتا تھا۔ اکثر لوگ انہیں بُلا کر لے جاتے اور وہ جن اُتار کر چلے آتے۔ ایک دفعہ ہم میں سے کسی نے کتب خانہ پر اُن سے پوچھا "کیوں حضرت، کیا واقعی جن ہوتے ہیں؟" اُستاد نے فرمایا "ہاں ہوتے ہیں، قرآن شریف میں سورۂ جن جو موجود ہے۔ جنوں کے علاوہ پلید روحیں بھی ہوتی ہیں، مثلاً چڑیل بھتنی، بھُتنا، بن سرا، سر کٹا، پچھل پیری، آسیب وغیرہ" پوچھا "کیا یہ سب انسانوں کو ستاتی ہیں؟" فرمایا "بے شک چڑیل کلیجہ چبا جاتی ہے، بھُتنے لپٹ جاتے ہیں اور غوں غوں کر بولتے ہیں، بن سرے کا سر نہیں ہوتا، سر کٹے کو دیکھو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی کسی نے اس کا سر کاٹ لیا ہے۔ پچھل پیری کے پنجے ایڑی کی طرف ہوتے ہیں۔ جنوں سے اگر مصافحہ کیا جائے تو ان کے انگوٹھے کی ہڈی نہیں ہوتی۔ بعض گھروں میں بد روحیں رہنے لگتی ہیں اور طرح طرح سے رہنے والوں کو ستاتی ہیں۔ یہ آسیب کہلاتا ہے"۔ "تو اُستاد آپ جن کس طرح اُتارتے ہیں؟" "میاں جہاں لال مرچوں کی دھونی دی اور حرام زادی کی چوٹی میں بل دے کر دو طمانچے مارے اور جن بھاگا۔ اور اگر طمانچوں سے نہ بھاگا تو جوتا سنبھالا"۔ اُستاد نے اس ترکیب سے بڑے بڑوں کے جن اتار دیئے تھے۔ سخت سے سخت ہسٹیریا فوراً رخصت ہو جاتا اور عشق و شق تو لمحہ بھر میں غائب ہو جاتا تھا۔

اُستاد بجّو بڑے خوش مزاج اور غپ باز بھی تھے۔ ڈینگ مارنے میں بڑا کمال رکھتے تھے۔ یقیناً اس سے اُن کا مقصد یہ نہیں تھا کہ دوسروں پر اپنا رعب گانٹھنا چاہتے تھے بلکہ اپنی پُرلطف باتوں سے دوسروں کے دل لُبھاتے تھے۔ بات اس انداز سے کہتے تھے کہ بالکل سنجیدہ معلوم ہو۔ مثلاً کہنے لگے۔ "امین الدین اور ان کے چند دوست جامع مسجد کی سیڑھیوں سے روزانہ سویرے دوڑ لگاتے تھے۔ ایک صاحب گھڑی لے کر کھڑے ہو جاتے۔ دوڑ لگانے والی ٹولی دلّی دروازے سے نکل کر فیروز شاہ کے کوٹلے، ببر کے تکئے، پُرانے قلعہ کے سامنے سے ہوتی ہوئی نظام الدین پہنچتی۔ اور نیلی چھتری کا چکر کاٹ کر پھر اسی راستے سے لوٹتی اور جامع مسجد

کی سیڑھیوں پر واپس پہنچ کر دم لیتی۔ یہ کوئی سوا آٹھ ساڑھے آٹھ میل کا چکر ہوتا ہوگا اور اس میں انہیں بیالیس منٹ لگتے تھے۔ (یہاں تک تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایسا ہوتا ہوگا۔ اب استاد کو زیٹ کی سوجھی اور فرماتے) ایک دن امین الدین کو راستے میں پیاس لگ آئی۔ اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا "تم چلو میں سامنے کنوئیں سے پانی پی کر آتا ہوں۔" دوست آگے بڑھ گئے اور امین الدین نے کنوئیں کا رُخ کیا۔ ڈول چرخی پر ڈال پانی کھینچا۔ خوب جی بھر کے پیا۔ اتنے میں عجیب طرح کی آواز برابر میں سے سُنائی دی کہ "ہمیں بھی پانی پلا دو۔" امین الدین نے جو مُڑ کے دیکھا تو ایک آدمی کھڑا تھا، جسم ننگا، مگر اس کا سر غائب تھا۔ کٹی ہوئی گردن پر تازہ تازہ خون تھا، اور اس میں سے آواز نکل رہی تھی کہ "ہمیں بھی پانی پلا دو۔" امین الدین نے کہا "تمہارا منہ تو ہے ہی نہیں، پانی کہاں سے پلاؤں؟" سر کٹے نے کہا "میرے نلخڑے میں ڈال دو۔" چنانچہ امین نے ڈول بھر کر اُس کے نلخڑے میں ڈال دیا۔ سر کٹے نے کہا "بڑی پیاس لگ رہی تھی، مگر ایک بات تو بتاؤ تم مجھ سے ڈرے نہیں؟" امین الدین نے کہا "میاں میں سر والوں سے تو ڈرتا نہیں بن سروں سے بھلا کیا ڈروں گا؟" گھر دیر سے پہنچے تو امین الدین سے اُن کے بڑے بھائی نے پوچھا "اے بھئی آج بڑی دیر کر دی۔ کہاں رہ گئے تھے؟" امین الدین نے سر کٹے سے ملاقات کا واقعہ سنایا تو وہ ہنسنے لگے اور مذاق اُڑانے لگے۔ امین الدین نے کہا "ان چیزوں کا مذاق نہیں اُڑانا چاہیے، ورنہ وہ پریشان کرنے لگتی ہیں۔" مگر بھائی نہ مانے اور مذاق اُڑاتے رہے۔ امین الدین ناشتہ لینے بازار چلے گئے، وہاں سے جو پوڑیاں اور دودھ لے کر واپس آئے تو دیکھا کہ بھائی اُلٹے لٹکے ہوئے ہیں۔ ہزار کوشش کرتے ہیں مگر سیدھے نہیں ہو سکتے۔ بھئی یہ تو خود ہماری آنکھوں کا دیکھا ہوا واقعہ ہے۔"

بیخود صاحب کو اپنی شاعری پر بڑا ناز تھا۔ اُستاد داغ کے انتقال پر مرزا خورشید جاہ نے بیخود صاحب ہی کے جانشینی کی پگڑی باندھی تھی۔ فرماتے تھے کہ خود استاد نے وصیت بھی "بیخودین" کے حق میں کی تھی۔ یہ تثنیہ کا صیغہ بھی خوب تھا۔ خدا جانے وہ دوسرے بیخود کون

تھے۔ نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی نے بھی یہ کیا کہ داغ کے جتنے مشہور شاگرد تھے سب کو اُستاد کی جانشینی کی سند دے دی۔ یہ ایک الگ قصّہ ہے۔ خیر جارج پنجم کی تخت نشینی اور دلّی میں دربار کرنے کے موقع پر بیخود صاحب نے ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا تھا۔ قصیدے کے آخر میں خاصی تعلّی بھی تھی۔ منشی محمد دین صاحب کو جب قصیدہ سُنایا تو منشی جی نے کہا "آپ نے اپنا مرتبہ بھی بادشاہ کے لگ بھگ ہی کر لیا۔" بیخود صاحب نے فرمایا "اور کیا؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں اُن سے کچھ کم ہوں؟ وہ بادشاہِ ملک ہیں تو میں بادشاہِ سخن ہوں۔"

بیخود صاحب کو شکار کا بھی شوق تھا۔ شکار چھوٹا بھی کھیلتے تھے اور بڑا بھی۔ مہاراجہ گوالیار سے ان کے خصوصی تعلقات تھے۔ ایک دفعہ گوالیار گئے تو گوالیار کے اسٹیشن پر اُترتے وقت انہیں خیال آیا کہ مہاراج کو تو اطلاع ہی نہیں دی کہ ہم آ رہے ہیں۔ اور نہ ان صاحب کو جن کے ہاں ٹھہرنا تھا۔ فرماتے تھے کہ اپنی بھول پر افسوس کرتا اسٹیشن سے باہر نکلا تو دیکھا کونجوں کی ایک قطار اُڑتی چلی آ رہی ہے۔ میں نے امین الدین سے کہا جلدی سے بندوق نکال کر دینا۔ انہوں نے بکس کھول کر بندوق نکالی۔ اور میں نے کارتوس لگا کر اس طرح فیر کیا کہ ایک کونج تو میرے ہی قدموں میں آ پڑی۔ دوسری اُن صاحب کے گھر میں گری جن کے ہاں مجھے مہمان ہونا تھا، اور تیسری راج محل میں عین مہاراج کے سامنے گری۔ میرے میزبان فوراً سمجھ گئے کہ یہ کونج بیخود صاحب ہی نے گرائی ہے۔ اور جب ہم ان کے گھر پہنچے تو وہ کھانے کے ساتھ بھُنی ہوئی کونج بھی رکھی ہوئی تھی، اُدھر مہاراج نے حاضر باشوں سے کہا "بھئی بڑی عمر ہے ابھی اُن کا ذکر ہو رہا تھا کہ ان کے بغیر شکار کا کیا مزہ (کونج کی طرف اشارہ کر کے) او دیکھو بیخود صاحب آ پہنچے۔" اور کھانے سے فارغ ہو کر تھوڑی دیر بعد ہم مہاراج کی خدمت میں جا پہنچے۔

اگلے دن شکار کا پروگرام تھا۔ ہاتھیوں پر سوار ہو شیر کے شکار کو چلے۔ جنگل میں ہانکا کیا گیا۔ شیر نکل کر جب سامنے میدان میں آیا تو سب سے پہلی گولی مہاراج کی چلی مگر وہ اوچھی پڑی۔ شیر زخمی ہو کر جھلا گیا، اور چھلانگ مار کر مہاراج کے ہاتھی سے جا چمٹا۔ میں نے فوراً رفل اُٹھا کر گولی چلائی

اور شیر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ مہاراج نے بہت واہ واہ کی اور بولے "اب واپس چلنا چاہیے۔" میں نے کہا "دُنیا میں ہر جانور کا جوڑا پیدا کیا گیا ہے۔ جب شیر ہے تو اس کی شیرنی بھی ضرور ہو گی۔ اسے بھی ساتھ لینا چاہیے۔" اب شیرنی کی تلاش شروع ہوئی۔ سب نے اپنے ہاتھی مختلف سمتوں میں ڈال دیے۔ ہمارا ہاتھی جنگل کے ایک گھنے حصّے کی طرف چلا۔ کچھ دیر بعد ہاتھی ایک کھوہ پر پہنچ گیا اور شیرنی جھپٹ کر ہاتھی کے سامنے آئی۔ اور اس کی ڈانٹ سے ہاتھی نے ڈر کر رُخ پلٹ دیا۔ مگر اتنی دیر میں میری گولی چل چکی تھی اور شیرنی مر چکی تھی۔ اُسے ہاتھی پر لاد کر ہم واپس چلنے کو ہوئے۔ فیر کی آواز سن کر مہاراج اور دوسرے شکاری ہم سے آ ملے۔ مہاراج نے کہا "تو بھئی اب تو جوڑا تیار ہو گیا اب واپس چلو۔" میں نے کہا "ذرا ٹھہریئے۔ میں ابھی آیا۔" یہ کہہ کر میں کھوہ میں گھس گیا۔ مجھے خیال تھا جب شیر اور شیرنی ہیں تو ان کے بچے بھی ضرور ہوں گے۔ اور واقعی میں دو بچے کھوہ میں نظر آئے۔ انہیں اچکن کی جیبوں میں چھپا کر میں لے آیا، اور میں نے کہا "اب چلئے۔ مگر نہیں ذرا اور توقف کیجئے۔ شیر کا گوشت کھایا تو جاتا نہیں اور وہ شکار ہی کیا ہوا جس میں کھانے کے لئے گوشت نہ ملے؟" مہاراج نے کہا "ہاں، بات تو ٹھیک ہے۔" قضا عند اللہ سامنے سے ایک کالا ہرن اینڈتا ہوا گزرا۔ گز گز بھر کے سینگ۔ میں نے دھائیں سے فیر کیا۔ اس نے ڈھیکلی کھائی مگر اٹھ کر تڑاٹ ہو گیا۔ ہرن کو جاتا دیکھ کر امین الدین لپکے۔ ہرن نے قلانچیں بھرنی شروع کر دیں۔ مگر امین الدین نے دوڑ کر اسے جا دبایا اور بسم اللہ، اللہ اکبر کہہ اُس کے گلے پر چھری پھیر دی۔ پھر اُس کی گٹھری بنا کر کندھے پر رکھ کر ہمارے پاس لے آئے۔ مہاراج نے ان کی پھُرتی کی بہت تعریف کی۔ میں نے کہا "اسے دوڑ لگانے کی مشق ہے۔ یہ تو زخمی ہرن تھا اگر امین الدین جی پر رکھ لے تو ویسے ہی دوڑ کر جنگل سے ہرن پکڑ لائے۔"

بیخود صاحب شاعر تو بڑے پُرگو تھے ہی نثر بھی اچھی لکھتے تھے۔ مگر انہیں نثر لکھنے کی طرف زیادہ توجہ نہیں ہوئی۔ کوئی پینتیس سال اُدھر کی بات ہے مولانا عبدالحلیم شرر نے مروجہ پردہ کے خلاف تحریک شروع کی تھی۔ انہوں نے مضامین بھی لکھے تھے اور ایک ناول "بدر النساء کی

مصیبت" بھی لکھا تھا جس میں پردے کی خرابیاں بیان کی تھیں۔ اس پر ملک میں خاصی لے دے ہوئی تھی۔ مولانا شرر نے ہندوستان کے مشہور ادیبوں اور شاعروں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے بھی خطوط لکھے تھے، کہ اس میں ان کے ہم خیال بنیں۔ اور اس سلسلے میں لکھنا شروع کریں۔ میں اس زمانے میں اسکول کی چھوٹی جماعتوں میں تھا اور ادب کے دردِ سر سے آزاد۔ اتنا یاد ہے کہ ابا مجھے فارسی پڑھا رہے تھے کہ اُن سے ملنے کوئی بزرگ آ گئے۔ ابا نے اُن سے کہا تھا "شرر کا ایسا خط آیا ہے اور میں نے انہیں لکھا ہے کہ سب سے پہلے تو اپنی بیوی کا پردہ اٹھاؤ۔ جب میں انہیں سر بازار بے پردہ دیکھ لوں گا تو تمہارا ساتھ دوں گا۔" اُستاد بیخود فرماتے تھے کہ "میرے پاس بھی شرر کا اسی مضمون کا خط آیا تھا۔ میں نے اُس کا تو کوئی جواب دیا نہیں البتہ اس کے جواب میں ایک ناول "ننگ و ناموس" لکھ کر شائع کروا دیا تھا۔" اس ناول میں پردے کی خوبیاں اور بے پردگی کی خرابیاں بتائی گئی تھیں۔ افسوس کہ وہ ناول ایک دفعہ چھپنے کے بعد دوبارہ نہیں چھپا۔ اس کا کچھ حصہ میں نے دمی اشرف صاحب کے رسالہ "شاہ جہاں" میں دیکھا تھا۔ پورا ناول دیکھنے کی آج تک ہوس ہے۔

اُستاد کے سینکڑوں شاگرد تھے۔ شیرینی لے کر شاگرد بناتے تھے۔ بس اس کے بعد شاگرد اصلاح لیتے رہتے تھے، دیتے دلاتے کچھ نہ تھے۔ دلّی کلاتھ مل والے لالہ شنکر لال ان کے شاگرد ہوئے تو مرتے دم تک برابر سلوک کرتے رہے، غالباً استاد کو اُن کے ہاں سے ماہوار مشاہرہ بھی ملتا تھا۔ آنجہانی نہایت ناموزوں طبیعت رکھتے تھے مگر شعر کہنے کی انہیں ہُڑک تھی، بے تُکے اور ناموزوں مصرعے کہہ کر استاد کو بھیج دیتے۔ استاد انہیں کیا خاک بناتے، پوری غزل کہہ کر خود ہی دے دیتے۔ لالہ جی کو چند بار مشاعروں میں غزل پڑھتے سُنا۔ شاید کبھی بھول کر کوئی مصرعہ بحر میں پڑھ دیتے ہوں تو پڑھ دیتے ہوں، ویسے معلوم ایسا ہوتا تھا کہ بڑی کوشش سے ہر مصرعہ ناموزوں پڑھ رہے ہیں۔ لالہ مُرلی دھر لائل پور ملز والے بھی استاد ہی کے شاگرد تھے اور استاد کی بڑی عزت و تکریم کرتے تھے۔ ہر سال لائل پور میں ایک شاندار مشاعرہ بڑے اہتمام سے کرتے، شاعروں کو دُور دُور سے بلاتے،

بڑی بڑی رقمیں دیتے اور وقتِ رخصت سب کو اپنی مِل کا بنا ہوا کپڑا وغیرہ بھی دیتے۔ استاد کو خود آکر دلّی سے لے جاتے اور ہتھیلی کے پھپھولے کی طرح رکھتے۔ لالہ شنکر لال کے بعد لالہ مُرلی دھر استاد کے کفیل ہوگئے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد لالہ مرلی دھر ہوائی جہاز کے سانحے میں کام آئے۔ ان کے بعد خدا جانے استاد پر کیا گزری۔ اب آخر آخر میں حکومتِ ہند نے ڈیڑھ سو روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ اس سے استاد کی کچھ اشک شوئی ہوگئی تھی۔

ہارڈنگ لائبریری میں فصیح الدین احمد مرحوم کے اہتمام سے ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوا تھا۔ بیخود صاحب کو بھی فصیح الدین احمد کسی نہ کسی طرح رضامند کر کے لے گئے۔ صدارت سر رضا علی کر رہے تھے۔ یہ بڑے سلجھے ہوئے مزاج کے بزرگ تھے۔ ادب و شعر کا عمدہ ذوق رکھتے تھے بڑے حاضر جواب اور فقرہ طراز تھے۔ مشاعرے کو آخیر تک سلیقہ مندی سے چلاتے اور کسی کو شکایت کا موقع نہ دیتے۔ ہمارے مشاعروں میں بزرگی و استادی کا یہ تصور سمایا ہوا ہے کہ جو جتنا بعد میں پڑھے گا وہ اتنا ہی بزرگ و استاد سمجھا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر شعرا کی ترتیب اور مقدم موخر پر بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ آج کل بھی اس کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے کہ مشاعرہ نو آموزوں سے شروع کر کے استادوں پر ختم کیا جائے۔ مگر سر رضا علی کی صدارت میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہ ہوتی تھی، جس کا نام انہوں نے پکار دیا وہ بے چون و چرا اسٹیج پر پہنچ جاتا تھا۔ ہارڈنگ لائبریری کے مشاعرے میں جب سارے شاعر پڑھ چکے تو آخیر میں دو بزرگ بچ رہ گئے۔ ایک حضرت بیخود دہلوی اور دوسرے حضرت ثاقب لکھنوی۔ دونوں ایک سے ایک بڈھا اور پرانا دُم گلا۔ سب کو یہ اندیشہ کہ دیکھئے کہیں آخر میں بدمزگی نہ ہو جائے۔ مگر سر رضا علی کا تدبر آڑے آیا۔ انہوں نے کرسیٔ صدارت فوراً چھوڑ دی اور کہا "اب میرے دو محترم بزرگ باقی رہ گئے ہیں۔ جو صاحب چاہیں گے پڑھیں گے۔" اس پر بیخود صاحب نے فرمایا "پہلے میں پڑھوں گا" اور ثاقب صاحب نے فرمایا "پہلے میں پڑھوں گا۔" ایک نے

کہا "نہیں بھائی، آپ مجھے اجازت دیجئے" دوسرے نے کہا "یہ نہیں ہو سکتا، آپ مجھے اجازت دیجئے۔" اب یہ انہیں پکڑ رہے ہیں اور وہ انہیں پکڑ رہے ہیں کہ "نہیں پہلے میں۔" مشاعرے میں ہنسی پڑ گئی، قصہ مختصر بیخود صاحب نے فرمایا "آپ ہمارے مہمان ہیں۔ اس لئے پہلے میں پڑھوں گا، میرے بعد آپ پڑھیں گے۔" یہ کہہ کر پڑھنے بیٹھ گئے۔

حج کرنے کے بعد بیخود صاحب کا مزاج بہت بدل گیا تھا۔ ان کی تنک مزاجی و آشفتہ سری تقریباً ختم ہی ہوگئی تھی۔ ورنہ یہی بیخود صاحب تھے کہ ناک پر مکھی تک بیٹھنے نہ دیتے تھے۔ نواب سراج الدین سائل کو اگر یہ زعم تھا کہ میں داغ کا داماد ہوں۔ تو انہیں اس کا گھمنڈ تھا کہ میں استاد کا چہیتا شاگرد ہوں۔ اور استاد نے اپنے شاگردوں کے چاروں رجسٹر میرے سپرد کر رکھے تھے۔ سائل صاحب سے ان کی کبھی نہ بنی۔ ادبدا کر انہیں نیچا دکھانا چاہتے تھے۔ دلّی کے مشاعروں میں دونوں استادوں کے شاگردوں میں آئے دن جھگڑے ہوتے اور مار پیٹ تک نوبت پہنچی۔ اس بے ہودگی کی وجہ سے صرف ایک رُخے مشاعرے رہ گئے تھے اور بھلے آدمیوں نے مشاعروں میں جانا چھوڑ دیا تھا۔ مگر یہ عجیب طرح کی مخاصمت تھی۔ شاعری سے قطع نظر دونوں استادوں میں خلوص و محبت کے تعلقات تھے۔ نواب سائل نے اپنے بیٹے کو تاکید کر رکھی تھی کہ بیخود صاحب سے اصلاح لیا کرو۔

بیخود صاحب نے دیوانِ غالب کی شرح بھی لکھی تھی۔ اشعار کا مفہوم بڑی خوبی سے بیان کرتے تھے۔ ایک دفعہ ہم نے ان سے پوچھا "استاد، آپ نے تو غالب کو دیکھا ہو گا؟" فرمایا "ہاں دیکھا تھا۔ میری عمر اس وقت پانچ سال کی تھی۔ ابّا حضرت کے ساتھ ان کے ہاں جایا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ پہلی دفعہ جب ان کے ہاں گیا تو شام کا وقت تھا۔ ان کے آگے بلوری صراحی اور گلاس رکھا تھا۔ اور طشتری میں تلے ہوئے بادام اور پستے تھے۔ چسکی لگاتے جاتے اور دو دو چار چار دانوں کے ٹُھنگیر کرتے جاتے۔ ابّا حضرت سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں مغرب کی اذان ہوئی، تو ابّا حضرت نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے ہیں

بچپن میں بہت شریر تھا۔ مگر نئی جگہ ہونے کی وجہ سے خاموش بیٹھا تھا۔ دادا غالب مجھ سے مخاطب ہو کر بولے "یارچہ! لو کچھ کھاؤ۔" میں نے تھوڑے سے بادام اور پستے اُٹھائے۔ کچھ ہنسی مذاق کی باتیں کرتے رہے پھر ایک دم سے بولے "یارچہ! تم ہمارے سر پہ ایک دھول تو کس کر لگاؤ۔" یہ کہہ کر اپنا گھٹا ہوا سر میرے آگے کر دیا۔ مجھے اتنا شعور کب تھا۔ دھول رسید کرنے کے لئے جھٹ کھڑا ہو گیا۔ اتنے ہی میں ابا حضرت نے سلام پھیر کر "ہوں ہوں" کہا اور مجھے گھور کر دیکھا۔ میں پھر دبک کر بیٹھ گیا۔ ابا حضرت نے کہا "مرزا صاحب قبلہ اللہ نے بڑی خیر کی۔ مجھے تو منہ دکھانے کو جگہ نہ رہتی۔ یہ بڑا ڈھنگی ہے۔ اس کا کیا ہے، یہ تو مار بیٹھتا، مگر میں تو کہیں کا نہ رہتا۔"

یہیں اگر کوئی پرانا لفظ یا محاورہ پوچھنا ہوتا تو بیخودؔ صاحب سے پوچھ لیتے۔ ان کے سوا دلی میں رہ بھی کون گیا تھا؟ تمام بڑے بوڑھے دیکھتے ہی دیکھتے اُٹھ گئے تھے۔ کتب خانہ پہ ایک دفعہ خود اُستاد ہی کے ایک مقطع پر بحث چل نکلی۔ سب نے اس کی تاویلیں طرح طرح سے کیں مگر بات کسی کی نہ بنی۔ آخر میں یہ طے ہوا کہ خود استاد ہی سے اس کا مطلب پوچھا جائے۔ شام کو جب اُستاد آئے تو ان سے مقطع رجوع کیا گیا۔ فرمایا "یہ شعر یوں سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اس میں ایک تلمیح ہے۔ مقطع یہ تھا۔

بیخودؔ کے لب بھی تر نہ ہوئے وقتِ مے کشی
آلودۂ شراب گریبان ہی رہا

فرمانے لگے "یہ شعر ایک واقعہ سے متعلق ہے۔ میں فلاں ریاست میں ملازم تھا۔ رئیس کی محفلِ خاص روزانہ رات کو سجتی تھی۔ جب دورِ شراب چلتا تو رئیس کی منظورِ نظر طوائف جام بھر بھر کر مقربین کو پیش کرتی۔ انکار کی مجال کسی کو نہ ہوتی۔ میں بھی اس سے جام لے لیتا اور منہ تک لے جا کر چپکے سے اپنے گریبان میں اُلٹ لیتا۔ اب یہ شعر تمہاری سمجھ میں آ جائے گا۔"

بڑے آدمیوں کی بڑی کمزوریاں، اُستاد ہر سوال کا جواب ضرور دیا کرتے تھے لاعلمی

کا اظہار کرنا غالباً کسرِ شان سمجھتے تھے۔ اور جب کبھی مجبور ہو جاتے تو ناراض ہو کر بات کو ٹال جاتے۔ ایک زمانے میں سہراب مودی کو "غالب" فلم بنانے کا خیال ہوا۔ مکالمے اور سیناریو سعادت حسن منٹوؔ نے لکھا تھا۔ اس سلسلے میں وہ مجھے بھی بمبئی بلوانا چاہتے تھے۔ مگر دلی والے سے دلی کب چھوٹتی تھی۔ میں نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ان کے ایک ڈائریکٹر مسٹر نندا مجھ سے ملنے دلی آئے۔ سو سال پہلے کی تہذیب و معاشرت کے متعلق انہیں اکثر باتیں معلوم کرنی تھیں۔ مجھے ان کا بہت کم علم تھا۔ میں انہیں لے کر بیخودؔ صاحب کے گھر مٹیا محل پہنچا۔ مردانہ بیٹھک میں چاندنی کا فرش تھا۔ یہیں ایک صاحب نے بیٹھنے کو کہا۔ تھوڑی دیر میں بیخودؔ صاحب تشریف لائے تو میں نے نندا صاحب کا تعارف کرایا۔ ملاقات کی غایت سن کر استاد کچھ خوش نہیں ہوئے۔ اُپرا کر بولے "پوچھئے کیا پوچھنا ہے؟" نندا صاحب نے کہا "مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ اُس زمانے کی جو سواریاں تھیں اُن کی کیا کیا شکلیں تھیں۔ مثلاً تخت رواں، ہوادار، تام جھام، پالکی، نالکی۔" اُستاد چیخ کر بولے "پالکی پالکی ہوتی ہے، نالکی نالکی۔ پالکی نالکی کیسے ہو سکتی ہے اور نالکی پالکی کیسے ہو سکتی ہے؟" میں نے دیکھا کہ استاد کا پارہ چڑھ گیا، یہاں دال نہ گلے گی، میں نے نندا صاحب سے کہا "آپ ایسا کیجئے کہ جو جو باتیں معلوم کرنی ہوں ان کی ایک فہرست بنا لیجئے۔ پھر کسی وقت حضرت کو زحمت دیجئے۔" زحمت دینے کی پھر نوبت نہ آئی۔

اُستاد کو کبوتر اُڑانے کا بہت شوق تھا۔ جال اور کابکیں اوپر چھت پر رہتی تھیں۔ چھتری چھپکا سب کچھ موجود تھا۔ اپنی ٹکڑیاں اڑاتے اور دوسرے کبوتر بازوں کی ٹکڑیوں سے لڑاتے۔ اس شغل میں اگر کوئی ملنے والا آ کر حارج ہوتا تو مزاج برہم ہو جاتا۔ وہیں سے گالیاں بڑبڑاتے اُترتے اور بڑے استکراہ سے ملاقات فرماتے۔ ایک مہربان اپنے صاحبزادے کو لے کر عین اس وقت پہنچے جب استاد کی جان کبوتروں میں اٹکی ہوئی تھی۔ بہت مکدر ہوئے۔ بُرا بھلا کہتے نیچے آئے۔ مہربان نے مٹھائی کی ٹوکری پیش کی اور بولے "یہ میرا لڑکا ہے، شعر کہتا ہے، اسے شاگردی میں قبول فرمائیے۔" ٹوکری تو استاد کا پوتا لے کر فوراً اندر چلا گیا، اور استاد

نے فرمایا "اپنے کچھ شعر سناؤ۔" وہ شامت کا مارا نہ جانے کس سے لکھواتا تھا۔ لگا ناموزوں شعر سنانے۔ بیخود صاحب ایک دم سے بکھر گئے۔ "نکل میرے گھر سے۔ باہر نکل۔" اور گالیوں کا سیلاب اُمنڈ پڑا۔ کھڑے کھڑے اسے اور مہربان کو گھر سے نکالا اور کنڈھی لگا اوپر جا کر پھر کبوتر اُڑانے لگے۔

شعر گوئی اور زبان سیکھنے کے شوق میں حیدرآباد جا کر چھ مہینے استاد کے پاس رہے۔ فرماتے تھے "مگر کبھی پان کا ٹکڑا تک اُن کا نہ کھایا۔ ان کے دیوانوں کی ورق گردانی کرتا اور بغور ایک ایک شعر کو دیکھتا۔ اس مطالعے میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ ہر دو چار غزلوں کے بعد ایسے شعر آجاتے جو سمجھ میں نہ آتے تھے۔ ایک دن میں نے استاد سے کہہ ہی دیا کہ میری فہم ناقص میں یہ بات نہیں آئی کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ ان اشعار کے معنی ہی نہ ہوں۔ ہو نہ ہو یہ میری سمجھ کا قصور ہے۔" استاد نے فرمایا "نہیں، تم ٹھیک سمجھے۔ میری عادت ہے کہ کبھی کبھی میں جان بوجھ کر مہمل شعر کہتا ہوں۔" اس وقت تو بات آئی گئی ہوئی۔ مگر ان اشعار کی قدر و قیمت اب معلوم ہو رہی ہے۔ جب ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ پوچھا "استاد وہ کون سے شعر ہیں؟" بولے "یاد نہیں"۔

فرماتے تھے کہ حکیم واصل خاں نے استاد داغؔ سے پوچھا "آپ کے بعد آپ کی زبان لکھنے والا بھی کوئی باقی رہے گا؟" استاد نے فرمایا "بیخود۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہاری زبان گھر کے گھر ہی میں رہی۔"

ایک دن فرمانے لگے "استاد کا مطلع ہے ؎

وہ مزے عشق میں آئے ہیں کہ جی جانتا ہے
رنج بھی ایسے اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے

مگر میرا مطلع اس سے بڑھ گیا۔"

کہا "استاد اپنا مطلع سنائیے۔"

فرمایا "یاد نہیں۔"

استاد بیخود بہت جئے، بہت جئے۔ ان کے والد سو سے اوپر ہو کر گئے تھے۔ استاد سنچری پوری نہ کر سکے۔ یک پیری و صد عیب۔ آخر عمر میں طرح طرح کی بیماریوں نے انہیں گھیر لیا تھا۔ یونانی علاج کرتے تھے۔ مرنے سے کچھ دن پہلے عطار کے ہاں سے نسخہ بندھوا کر لا رہے تھے، راستے میں دہی بڑے والا نظر آ گیا۔ مرض و مریض سب بھول گئے۔ آخر دلّی والے تھے، چٹورپن نے زور مارا اور خوب ڈٹ کے دہی بڑے کھائے۔ اس وقت تو مزہ آ گیا، مگر بعد میں اس کی کسر نکلی۔ ضُعفِ معدہ کے مریض، اسہال شروع ہو گئے۔ بھلا جو شخص ساری عمر اچھے سے اچھے کھانوں کا شوقین رہا ہو وہ ترکِ غذا کیسے کرے؟ بد پرہیزیاں ہوتی رہیں اور امراض بڑھتے رہے، یہاں تک کہ موت نے آ کر سلام کیا۔ استاد تو اس زندگی سے بیزار ہی تھے، ہنسی خوشی رخصت ہو گئے۔ جب تک جئے اوروں کو ہنساتے رہے، جب مرے تو صفِ ماتم بچھ گئی۔ ایسے زندہ دل انسان بھلا اب کاہے کو پیدا ہوں گے۔ اچھے لوگ تھے، اچھی گزار گئے۔ اپنے ساتھ دلّی کا نام بھی روشن کر گئے۔ اب نہ ایسا شاعر پیدا ہو گا اور نہ ایسا انسان ؏

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

خواجہ حسن نظامی

حضرت خواجہ حسن نظامی دلّی کے اُن بزرگوں میں سے تھے جنہیں زمانہ کبھی فراموش نہ کر سکے گا۔ وہ ایک بہت غریب گھر میں پیدا ہوئے۔ افلاس کی وجہ سے ان کی تعلیم نہ ہو سکی۔ مگر انسان کو انسان بنانے میں صرف تعلیم ہی تو کارآمد نہیں ہوتی۔ یوں لادنے کو تو گدھے پر بھی کتابیں لاد دی جاتی ہیں، لیکن گدھا تو گدھا ہی رہتا ہے۔ اصل چیز ہے تربیت۔ خواجہ صاحب حضرت نظام الدین اولیأؒ کے خواہرزادوں کی اولاد میں سے اپنے آپ کو بتاتے تھے۔ ان کی شرافتِ نسبی نے انہیں سنبھالے رکھا۔ ان کے والد بھی درگاہ محبوبِ الٰہیؒ کے خادموں میں شامل تھے۔ درگاہ کی آمدنی میں سے حصہ رسد انہیں بھی کچھ مل جاتا۔ یہ یافت اس قدر قلیل تھی کہ اس سے جسم و جاں کا رشتہ بہ مشکل قائم رکھا جا سکتا تھا، تاہم غیور والدین نے اپنے لڑکے کو کچھ ایسی تربیت دی کہ مفلس و قلاش ماں باپ کا بیٹا بعد میں دلّی کے لکھ پتیوں میں شمار ہوا۔ ادب میں اپنے زمانے کا سب سے بڑا ادیب کہلایا۔ علومِ دینی میں وہ بصیرت حاصل کی کہ فرنگی حکومت نے شمس العلماء کا خطاب دیا۔ معاملاتِ روحانی میں اتنی ترقی کی کہ تین لاکھ مریدوں کا مرشدِ کامل بنا۔ مُبلّغ اسلام بنا تو اچھوتوں سے لے کر راجہ مہاراجاؤں تک کو حلقہ بگوشانِ اسلام میں لا شامل کیا۔ سیاست میں قدم رکھا تو دیکھتے ہی دیکھتے صفِ اوّل کے لیڈروں میں جا پہنچا۔ غرض زندگی کے ہر شعبہ میں حیرت ناک ترقی کی۔ یہ سعادت خدائے بخشندہ کی طرف سے تھی کہ خواجہ صاحب نے مٹی میں بھی ہاتھ ڈالا تو سونا بن گئی۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا خواجہ صاحب کو ایک ہی سا دیکھا۔ انہیں دیکھ کر یہ خیال ہوتا تھا کہ وقت کی رفتار تھم گئی ہے۔ زمانے کی گردش رُک گئی ہے۔ آخر آخر میں اُن کی ڈاڑھی میں چند سفید بال البتہ آ گئے تھے ورنہ خود اُن میں سرِ مو فرق نہ آیا تھا۔ لمبا اونچا قد چھریرا ہلکا دُبلا بدن، سر پر کُلاہ نما بیلی ٹوپی۔ لمبا سا جُبہ۔ بڑے پائنچوں کا پاجامہ۔ پاؤں میں دیسی جوتی۔ رنگ شہابی، چہرہ کتابی۔ آنکھوں پر سُنہرے فریم کی عینک جس میں سے آنکھیں ہیرے کی طرح جگر جگر چمکتی تھیں۔ سُتواں ناک۔ موزوں دہانہ، لب ذرا موٹے۔ کترواں لبیں۔ مٹھی بھر بھرپری ڈاڑھی۔ صراحی دار گردن۔ شانوں پر کاکلیں کالے ناگوں کی طرح لہراتی اور افعی کی طرح بل کھاتی۔ چلتے تو کڑی کمان کے تیر کی طرح، بیٹھتے تو لاکھوں من کے بیٹھے معلوم ہوتے۔ خاموشی میں پہاڑ کا سا سکوت ہوتا اور گفتگو میں دریا کی سی روانی۔ خوش گفتار ایسے کہ بات کرتے تو منہ سے پھول جھڑتے۔ سننے والے دھیان کا دامن پھیلا کر انہی پھولوں سے اپنے من کی جھولیاں بھر لیتے۔ سنجیدگی اور بُردباری کے جوہر اُن کے چہرے پر ہوتے رہتے۔ کوئی خوش مذاقی کی بات بھی کرتے تو خندۂ دنداں نُما سے آگے نہ بڑھتے۔ جس محفل میں بیٹھ جاتے طوطی کی طرح چہکتے رہتے۔ کیا مجال جو کسی اور کو اُن کے آگے لب کشائی کا یارا ہو۔ بڑوں میں بڑوں کی سی باتیں کرتے اور بچوں میں بچوں کی سی۔ تمام علوم ظاہری و باطنی میں درک رکھتے تھے۔ اُن کے ایک ہاتھ میں دین اور ایک ہاتھ میں دُنیا تھی۔ طُرفہ طبیعت کے آدمی تھے۔ دلّی سے اُن کا نام اس طرح پیوست ہے جس طرح گوشت سے ناخن۔ اس عجیبُ غریب ہستی پر میرا کچھ لکھنا چھوٹا منہ بڑی بات۔ دوسرے یہ کہ خواجہ صاحب کے مُقربین میں سے نہیں، دوستوں میں سے نہیں۔ وہ میرے والد کے ملنے والوں میں سے تھے۔ میرے بزرگ اور محترم تھے۔ اکثر انہیں دیکھا اور چند بار اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا بھی موقع ملا۔ یوں ساری عمر اُن کے رسالے۔ اخبار۔ کتابیں اور روزنامچہ پڑھتا رہا۔ اور ان کی البیلی اُردو کے مزے لیتا رہا۔ گزشتہ تیس سال کے چند ناقابلِ فراموش تاثرات ہیں جو ناظرین کی دلچسپی کے لئے لکھتا

ہوں بشرطیکہ ان میں سے کوئی ایسا ہو جو مستقبل کے مؤرخ کے کام آجائے۔ میں صرف ایک واقعاتی مرقع پیش کر رہا ہوں۔

خواجہ صاحب کی اخباری زندگی کا آغاز پھیری پر کتابیں اور اخبار بیچنے سے ہوا۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر اُن کی بے خواب راتیں گذریں۔ انہوں نے بھوک اور افلاس کا مزہ بچپن ہی میں چکھ لیا تھا۔ اگر اُن میں غیرت نہ ہوتی تو وہ بھی کنگلوں کی طرح اپنی پوری زندگی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر گذار دیتے۔ یہ اُن کے خاندانی شرف کا جوہر ہی تھا جو انہیں اُن کی پستی کا احساس دلاتا رہا اور اس گری ہوئی زندگی پر وہ قانع نہ ہو سکے۔ اُن کے دل میں ہمیشہ سے ایک بڑا آدمی بننے کی اُمنگ تھی۔ دِلّی کے چوک اور دِلّی کی گلیوں ہی میں انہوں نے تعلیم پائی۔ یہی وہ مکتب تھے جن میں انہوں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ تجربہ بھی حاصل کیا۔ ناموافق حالات نے انہیں سخت کوش بنا دیا۔ وہ ہمت کے پَر لگا کر اُڑے اور شہرت کے آسمان پر کامیابی کا تارہ بن کر چمکے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو خواجہ صاحب نے اپنے سینکڑوں ہی اخبار جاری کئے روزنامہ، ہفتہ وار، پندرہ روزہ اور ماہانہ۔ یہ سب پرچے شہابِ ثاقب کی طرح مطلعِ صحافت پر نمودار ہوتے۔ اپنی خیرہ کُن چمک دمک دکھلاتے اور دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں گھُل جاتے۔ ان کا اخبار "منادی" صرف ایک ایسا پرچہ ہے جو بیسیوں چولے بدلنے پر بھی شائع ہوتا رہا۔ اور اس کے شائع ہونے کی وجہ یہی ہے کہ اس میں خواجہ صاحب کا دلچسپ روزنامچہ شائع ہوتا رہا۔ یہ روزنامچے کی جدّت خواجہ صاحب کے غیر معمولی دماغ کی پیداوار تھی۔ صبح سے رات تک کے واقعات اس میں درج ہوتے۔ اس میں شک نہیں کہ روزنامچہ کا مقصد محض خواجہ صاحب کا ذاتی پروپیگنڈا تھا۔ لیکن اس کی مقبولیت کا سبب وہ زبان اور بیان تھا یا وہ اندازِ تحریر جو خواجہ صاحب کے ساتھ پیدا ہوا اور خواجہ صاحب ہی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ یہ سیدھا سادا اندازِ بیان ہزار کوشش پر بھی کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔ اُس کی سادہ پُرکاری کا گھائل ایک عالم ہے۔ سر عبدالقادر کے "مخزن" سے لے کر آج کل کے عمدہ ادبی رسالوں تک شاید ہی کوئی ایسا ہو

جو خواجہ صاحب کے مضامین شائع کرنے کو اپنے اعلےٰ کارناموں میں شمار نہ کرتا ہو۔

دِلّی کے خاص لوگوں میں سے ایک صاحب ہیں محمد ارتضیٰ، جو کوچہ چیلان میں رہتے تھے۔ اور دِلّی کے اچھے آسودہ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ خاصے مُتموّل آدمی تھے، جائداد بھی کافی تھی۔ عربی، فارسی اور اُردو سے شغف رکھتے تھے۔ طبیعت کا رجحان مذہب کی طرف زیادہ تھا۔ ہم نے ہمیشہ سے اُن کے منہ پر چھوٹی سی ڈاڑھی دیکھی۔ ڈاڑھی کیا تھی ڈاڑھی کی علامت تھی۔ ادب سے دلچسپی کی وجہ سے اُن کا تعلق گزشتہ چالیس پینتالیس سال پہلے کے تمام اچھے ادیبوں اور شاعروں سے رہتا تھا۔ اُن میں علامہ راشد الخیری۔ خواجہ حسن نظامی اور نیاز فتحپوری جیسے جلیل القدر ادیب شامل تھے۔ ان صاحب سے خواجہ صاحب کا تعلق دوگونہ تھا۔ ایک تو ادب کا اور دوسرے مذہب کا۔ ارتضیٰ صاحب نے بھی کئی رسالے نکالے جن میں "درویش" بہت مشہور ہوا۔ خواجہ صاحب نے جب حلقۂ مشائخ نواب بڈھن کے کمرے پر قائم کیا تو "نظام المشائخ" کے نام سے محمد ارتضیٰ صاحب نے ایک ماہنامہ جاری کیا۔ اس پرچے میں جہاں اہلِ سلوک کے مسائل پر مضامین ہوتے تھے وہاں اعلیٰ درجہ کے ادبی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ خواجہ صاحب نے اُس زمانے میں بہت اچھے اچھے مضامین لکھے۔ محمد ارتضیٰ صاحب کو خواجہ صاحب نے "ملّا واحدی" کا خطاب دیا جو اتنا مشہور ہوا کہ آج واحدی صاحب کو سب جانتے ہیں اور محمد ارتضیٰ کو کوئی نہیں جانتا۔ واحدی صاحب کی دولت اور خواجہ صاحب کی عقل نے مل کر بہت بڑے بڑے کام کئے۔ روپیہ لگانے والے خواجہ صاحب کو ہمیشہ مل جاتے تھے۔ واحدی صاحب کی طرح خواجہ صاحب کے ایک اور بہت بڑے قدرداں بھیّا احسان تھے جو میرٹھ کے رئیسوں میں شمار ہوتے تھے۔ انہیں بھی علم و ادب کا بہت شوق تھا۔ ان کا ایک اخبار بھی نکلتا تھا۔ اسی اخبار کے سلسلے میں خواجہ صاحب سے ان کے دوستانہ تعلقات قائم ہوئے۔ کانپور کی مسجد کا جب پہلی دفعہ ہنگامہ ہوا تو خواجہ صاحب میرٹھ ہی میں تھے۔ اور انہوں نے ایک بہت بڑے جلسے میں ایسی دھواں دھار تقریر کی کہ

مسلمانوں میں جوش و خروش پھیل گیا۔ اس تقریر سے خواجہ صاحب کی بہت شہرت ہوئی۔

بھیا احسان اور واحدی صاحب سے خواجہ صاحب کے تعلقات قیام پاکستان تک نہایت مخلصانہ رہے۔ پاکستان بننے کے بعد خواجہ صاحب تو دلّی ہی میں رہ گئے اور بھیا احسان اور واحدی صاحب کراچی چلے آئے۔ یہاں آکر جو حال اور سب مہاجروں کا ہوا وہی ان کا بھی ہوا۔

روایتِ عام کے مطابق خواجہ صاحب کے تین لاکھ مُرید تھے۔ ہندو اور عیسائی بھی ان کے مُرید تھے۔ ایک اطالوی شہزادی بھی ان کی مُرید تھی۔ فرماتے تھے کہ برنارڈ شاہ بھی میرا مُرید ہے اور پرنس آف ویلز (ایڈورڈ ہشتم) نے بھی میرے مُریدوں میں شامل ہونے کے لئے مجھے چٹھی لکھی ہے۔

خواجہ صاحب کو خطابات دینے اور نام رکھنے کا عجب سلیقہ تھا۔ علامہ راشد الخیری کو "مصورِ غم" خواجہ صاحب ہی نے خطاب دیا تھا۔ میرے والد کو "وارث الادب" کہتے اور لکھتے تھے۔ خود مصورِ فطرت تھے۔ ان کی بیگم خواجہ بانو ہیں۔ ایک بیٹی حور بانو اور دوسری روحہ۔ ضیاء الدین احمد کو ان کی تاریخی معلومات کی وجہ سے برنی خطاب دیا تھا۔ کوئی ناسوتی نظامی تھے اور کوئی ابن عربی۔ ایک صاحب ملنسار نظامی کہلاتے تھے۔ بھیا احسان کشفی شاہ تھے۔ ایک صاحب مستری عشقی کہلاتے تھے۔ کوئی جمالی تھا کوئی غزالی۔ ایک تھے قلندر نظامی۔ یہ قلندر نظامی بھی عجیب چیز تھے۔ ان کی وضع قطع خواجہ صاحب سے مُشابہ تھی۔ بلکہ کہا جاتا تھا کہ خواجہ صاحب کی اُترن انہی کو ملتی ہے۔ وہی پیلی ٹوپی۔ وہی چغہ۔ کاکلیں چھٹی ہوئیں۔ عمر میں خواجہ صاحب سے بڑے تھے۔ بہت غریب آدمی تھے۔ وضعدار ایسے کہ سوائے خواجہ صاحب کے اخباروں کے اور کسی کا اخبار نہ بیچتے تھے۔ دلّی والے کہتے تھے کہ خواجہ صاحب کو پیر و مُرشد بنانے میں قلندر نظامی نے بڑا کام کیا ہے۔ روایت مشہور تھی۔ (اور اکثر غلط روایتیں بھی زیادہ مشہور ہو جایا کرتی ہیں) کہ قلندر نظامی کا کام ہی یہ تھا کہ خواجہ صاحب کو

سجدے کرتے رہیں۔ یہ سجدے بڑے خضوع و خشوع سے کئے جاتے تھے اور دیکھنے والے ان سے بے حد متاثر ہوتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اُن کا فی سجدہ کچھ مقرر تھا۔ اس طرح قلندر نظامی نے کافی رقم کمائی۔ خیر ہم نے تو یہ دیکھا کہ قلندر نظامی بہت ضعیف ہو گئے تھے اور کوئی کام نہیں کر سکتے تھے۔ خواجہ صاحب ہی کچھ سلوک کرتے تھے جو اُن کی زندگی کے آخری دن بسر ہوتے تھے۔

خواجہ صاحب جدّت طرازیوں کے دلدادہ تھے۔ عیسوی، ہجری، فصلی سنوں کے مقابلہ میں انہوں نے اپنا ایک سن وضع کیا تھا۔ بارہ مہینوں کے نام بارہ اماموں پر رکھے تھے اور سات دنوں کے بھی مقدس نام تجویز کئے تھے۔ اپنی بعض کتابوں کے نام بھی عجیب غریب رکھے تھے۔ "کم ڈوت"۔ "زم قبلہ و شملہ"۔ "طمانچہ بر رخسار یزید"۔ "کانا باتی"۔ "مرشد کو سجدۂ تعظیم" وغیرہ

جب شُدھی نے بہت زور پکڑا تو خواجہ صاحب نے تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔ اس میں اتنے کامیاب رہے کہ ایک چھوٹے موٹے راجہ کو بھی انہوں نے مسلمان کر لیا تھا۔ مگر سوامی شردھانند کی تحریک بڑھتی ہی جاتی تھی۔ اُس کے ساتھ پوری ہندو قوم کی دولت تھی۔ خواجہ صاحب نے تاڑ لیا کہ یہ یوں نہیں دبے گا۔ لہٰذا انہوں نے سوامی جی کو مقابلے کا چیلنج دے دیا۔ خواجہ صاحب نے کہا: "آؤ ہم تم دونوں قطب مینار پر سے چھلانگ لگتے ہیں۔ جو سچا ہوگا وہ جی جائے گا۔ اور جو جھوٹا ہوگا وہ مر جائے گا۔" خواجہ صاحب نے تمام اخباروں میں اس کا اعلان کرا دیا اور اس کا وقت بھی مقرر کر دیا۔ اُس دن صبح ہی سے قطب مینار پر ٹھٹ کے ٹھٹ لگنے شروع ہو گئے۔ خلقِ خدا اُمڈی چلی آتی تھی۔ وقتِ مقررہ پر خواجہ صاحب آ پہنچے مگر شردھانند نہیں آئے۔ خوب تھڑی تھڑی ہوئی اور میدان خواجہ صاحب کے ہاتھ رہا۔ (ایک روایت یہ بھی ہے کہ شردھانند پہونچ گیا، خواجہ صاحب نہیں پہونچے)

دلّی میں جتنے بھی مسلمان ایڈیٹر اور اشتہاری حکیم تھے سب کے سب بالواسطہ یا بلا واسطہ خواجہ صاحب کے مرہونِ منت تھے۔ خواجہ صاحب نے کتابوں اور رسالوں کے علاوہ

دوائیں اور غذائیں بھی بیچنا شروع کر دی تھیں: "فقیر کی جھنگی" اور "چودہ چھوارے" اور عجیب عجیب ناموں کی دوائیں تھیں۔ دوائیں ان کی کتابوں سے بھی زیادہ بکتی تھیں۔ "سوہان" اور فاسفورس کا تیل تو پاکستان بننے سے پہلے تک مشتہر ہوتا رہا۔ تجارت کا اصول یہ سمجھا جاتا تھا کہ کتابوں میں چار آنے کا ایک روپیہ بنتا ہے اور دواؤں میں ایک آنے کا ایک روپیہ۔ اکثر باہر والے کسب معاش کے لئے دلّی آئے اور خواجہ صاحب کے ہاں ملازم ہو گئے۔ تھوڑے دنوں میں انہوں نے خواجہ صاحب کا سارا کاروبار سیکھ لیا۔ خریداروں کے پتے اُن کے ہاں سے چُرا لئے اور نوکری چھوڑ خود اپنا کاروبار لے بیٹھے۔ اور برکت بھی اللہ نے اُن کے اس چوری کے کاروبار میں ایسی دی کہ اُن میں سے کئی تو اب لکھ پتی ہیں۔ خواجہ صاحب کے رسالے بھی تھک گئے اور دوائیں بھی۔ مگر اِن کے رسالے بھی خوب چل رہے ہیں اور دوائیں بھی۔ ان میں سے ایک صاحب شاکی تھے کہ کراچی میں بہت مہنگائی ہے، فرماتے تھے کہ جو شیشی پہلے ایک آنے میں گھر پڑتی تھی۔ اب دو آنے میں تیار ہوتی ہے۔ بکتی پہلے بھی تین روپے کی تھی اور اب بھی تین ہی روپے کی بیچنی پڑتی ہے۔

ایک زمانے میں خواجہ صاحب کی قوتِ ارادی غیر معمولی طور پر بڑھی ہوئی تھی۔ ان کی آنکھوں میں وہ قوت تھی جو مسمریزم کرنے والوں میں ہوتی ہے۔ جہاں اُنہوں نے کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور وہ موم ہوا۔ ایک دفعہ خواجہ صاحب دوپہر کو اپنے دفتر میں اکیلے بیٹھے تھے کہ ایک لٹھ بند آریہ سماجی غنڈا اندر گھس آیا۔ خواجہ صاحب نے لکھتے لکھتے قلم روکا، آنکھیں اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور بولے "چلے جاؤ یہاں سے۔" اور وہ کچھ ایسا مرعوب ہوا کہ فوراً واپس چلا گیا۔ ایک دفعہ اور ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ پرانی قلمی کتابوں کا ایک ذخیرہ دکھانے کے بہانے سے ایک ہندو خواجہ صاحب کو ایک گھر میں لے گیا۔ جب خواجہ صاحب گھر میں داخل ہو گئے تو اُس نے کواڑ بند کر کے کنڈی لگا لی۔ خواجہ صاحب بالکل ہراساں نہیں ہوئے۔ ڈپٹ کر بولے "کھول دروازہ۔" اُس نے سہم کر دروازہ کھول دیا اور خواجہ صاحب بڑے اطمینان سے اپنے گھر چلے آئے۔

پروپیگنڈا خواجہ صاحب کی سب سے بڑی قوت بھی تھی اور کمزوری بھی، خوبی بھی اور عیب بھی۔ اپنی بات منوانے کے لئے وہ جائز و ناجائز، موزوں اور ناموزوں کا امتیاز اُٹھا دیتے تھے۔ مثلاً سلطان جی کی باؤلی پر سے جو گلیارا بائیں ہاتھ کے اندر جاتا ہے اُس کے سرے پر ایک قبر سب سے نمایاں ہے۔ اس پر کتبہ لگوا دیا: "حسن نظامی کے دادا کی قبر"۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اُردو کا پروپیگنڈا کرنے پر آئے تو اپنے ایک گھر کا نام "اُردو منزل" رکھ دیا۔ اور اس میں تمام ٹائیل لگوا دیئے جن پر "ہر گھر اردو" اور "گھر گھر اردو" لکھا ہوا تھا۔ یہ ٹائیل انہوں نے خود بنوائے تھے اور تلقین فرمائی تھی کہ تمام مسلمانوں کو یہ ٹائیل خرید کر گھروں میں لگوانے چاہئیں۔

خواجہ صاحب کے دماغ میں نئی سے نئی آتی تھی۔ ایک زمانے میں اعلیٰ پیمانے پر کتابیں چھاپنے کا اعلان کیا۔ اس کے لئے ایک کمپنی قائم کی جس کا نام "دی حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی لمیٹڈ" رکھا۔ اس کے حصے فروخت کئے گئے، خوب روپیہ برسا، مگر کچھ ہی عرصہ بعد یہ کمپنی ایسی غائب ہوئی کہ لوگ اسے جھینکتے ہی رہ گئے۔ اسی طرح غالب کے مزار کے لئے کئی دفعہ اپیل کر کے چندہ جمع کیا مگر مزار نہ بن سکا۔ لیکن ان کے عقیدت مندوں کی عقیدت مندی میں کوئی فرق نہ آیا۔

خواجہ صاحب کو غصہ کبھی نہ آتا تھا۔ نہایت شائستہ اور مؤثر گفتگو کرتے تھے ہر ایک کی سعی سفارش کے لئے جھٹ تیار ہو جاتے اور دامے۔ درمے۔ قدمے سخنے اُس کی مدد کرتے۔ غرور اُن میں نام کو نہیں تھا ہر ایک سے اچھی طرح پیش آتے۔ یہاں تک کہ بدخواہوں اور دشمنوں سے بھی۔

خواجہ صاحب کھلی ہوئی طبیعت کے آدمی تھے۔ مذہبی پیشواؤں میں بھی شمار ہوتے تھے۔

مگر تنگ نظر مُلّائیت سے کوسوں دُور تھے۔ تھیٹر اور سینما دیکھتے تھے۔ قوّالی تو خیر سارے ہی صوفی سُنتے ہیں۔ خواجہ صاحب قوّالی کے علاوہ بھی اور سب قسم کے گانے سُن لیتے تھے۔

کوئی تیس سال اُدھر کا ذکر ہے۔ کرنل اشرف الحق حیدر آباد دکن سے دلّی آئے ہوئے تھے۔ یہ بھی ایک عجیب و غریب شخصیت کے آدمی تھے۔ چودہ سال ولایت میں رہ کر ڈاکٹری پڑھی تھی۔ ریاست دکن کی افواج کے بڑے ڈاکٹر تھے۔ ہزل اور فحش گوئی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ مسکرات کے تجربات کرتے ساری عمر گذر گئی۔ تجربہ اپنے اوپر بھی کرتے تھے اور دوسروں پر بھی۔ مزاج درویشانہ تھا۔ فرقہ رفاعیہ سے منسلک ہو گئے تھے اور خلیفہ بھی ہو گئے تھے۔ ضربیں لگا لیتے تھے۔ کیمیا بنانے کا بھی شوق تھا۔ مگر سونا کبھی نہیں بنا۔ ہمیشہ ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔ کرنل صاحب کے تعلقات خواجہ صاحب سے مخلصانہ تھے۔ اس زمانے میں جب دلّی آئے تو اپنے آبائی مکان میں اُترے۔ یہ مکان تراہا بیرم خاں مفتی والوں کے پھاٹک میں ہے۔ ٹیڑھا بنا ہوا ہے۔ اس لئے ٹیڑھی حویلی کہلاتا ہے۔ اس ٹیڑھی حویلی کی کُھلی چھت پر ایک محفلِ سماع برپا ہوئی۔ دِلّی میں دو بہنیں تھیں جو مِل کر گاتی تھیں۔ یہ مہترانیاں کہلاتی تھیں۔ انہوں نے تو خود کبھی نہیں کمایا البتّہ اُن کے باپ دادا لال بیگی تھے۔ انہوں نے بچپن ہی سے گانا سیکھا تھا۔ شرفا کی مجلسوں میں جاتی تھیں۔ ہر جگہ جاتی بھی نہ تھیں۔ صاف ستھرا لباس۔ اچھے چہرے مُہرے۔ نستعلیق گفتگو، قاعدے قرینے سے واقف۔ ایک بہن ڈھولک لے لیتی۔ برابر میں اُستاد جی سارنگی لے کر بیٹھتے۔ پیچھے ہارمونیم والا ہوتا۔ ایک بڑے بڑے گلچھوں والا آدمی اُن کے ساتھ ہوتا۔ یہ اُن کا باپ تھا۔ ساز ملے، راگ شروع ہوا۔ گمبھیری آوازیں، سماں بندھ جاتا تھا۔ اس محفل میں خواجہ صاحب بھی شریک ہوئے تھے۔ ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ اس زمانے میں مولانا محمد علی سے خواجہ صاحب کی خوب چل رہی تھی۔ روزانہ خواجہ صاحب کے پوسٹر نکل رہے تھے۔ مولانا محمد علی نے خواجہ صاحب کا نام ہی "قدِ آدم پوسٹر" رکھ دیا تھا۔ کوئی غزل گائی جا رہی تھی۔ پورا شعر یاد نہیں رہا۔ مصرعۂ ثانی تھا ع

"تمہاری بدگمانی چھپ گئی ہے اشتہاروں میں"

اس پر ایک قہقہہ پڑا تو خواجہ صاحب چونکے اور مسکرا کر بولے "کیا ہے؟ کوئی پوسٹر؟" اس پر ایک اور قہقہہ پڑا اور دیر تک سب ہنستے رہے۔

ایک دفعہ خواجہ صاحب اور مولانا محمد علی میں چلی اور ایسی چلی کہ بھلے آدمی تراہ تراہ پکار اٹھے۔ ایک صاحب تھے ضیاء الحق ہاپڑ کے رہنے والے۔ اپنے وقت کے بڑے مشہور لوگوں میں سے تھے۔ انہیں بڑے بڑوں کو نیچا دکھانے میں مزہ آتا تھا۔ ہر ایک کی ٹوہ لیتے رہتے اور جہاں موقع ملتا چُٹکی لیتے۔ ان کے کاٹے کا منتر ہی نہ تھا۔ اپنے اس فن کی وجہ سے ہزاروں کے وارے نیارے کرتے تھے۔ یہ صاحب خواجہ صاحب کے بھی دوست تھے اور مولانا محمد علی کے بھی۔ نہ جانے ان کے جی میں کیا آئی کہ انہوں نے ان دونوں دوستوں کو لڑوا دیا۔ خواجہ صاحب کا کوئی خط تھا جس کی بُنیاد پر انہیں انگریزوں کا جاسوس ٹھہرا گیا۔ مولانا محمد علی انگریز کے نام سے جلتے تھے، اُن کے تو تلوؤں سے جو لگی تو تالو سے نکل گئی۔ ایسے چراغ پا ہوئے کہ اپنے اخبار "ہمدرد" میں انہوں نے خواجہ صاحب کے خلاف لکھنا شروع کر دیا۔ خواجہ صاحب بھلا کب دبنے والے تھے۔ انہوں نے تُرکی بہ تُرکی جواب دینا شروع کیا اور ایک نیا اخبار ہی اس ہنگامہ کے لئے جاری کر دیا۔ دونوں طرف سے وہ گندگی اچھلی کہ توبہ ہی بھلی۔ اس کا یہ بُرا اثر پڑا کہ دونوں کی قدر و قیمت لوگوں کے دلوں سے جاتی رہی۔ خواجہ صاحب کے اخبار میں ایک کارٹون چھپا جس میں دکھایا گیا تھا کہ ایک دیو ہیکل شخص نہایت خونخوار انداز میں کھڑا ہے اور اس کے سامنے ایک ننھا سا مچھر بیٹھا ہے۔ مچھر کہہ رہا ہے "تو نمرود ہے اور میں مچھر۔ میں تیری ناک میں گھُس جاؤں گا۔" بارے کچھ لوگ بیچ میں پڑے اور لڑائی بند کرائی گئی۔ خواجہ صاحب نے اس ساری لڑائی کی رُوداد "جنگِ صفّین" کے نام سے کتابی شکل میں شائع کی۔ یہ کتاب خوب بکی۔

خواجہ صاحب کو نئی سے نئی سوجھتی تھی۔ ایک دفعہ دلّی کے ہندو، مسلمان، سکھ،

عیسائی سارے ایڈیٹروں کو آموں اور آئس کریم کی دعوت دی۔ بڑا عمدہ انتظام کیا۔ اعلیٰ درجہ کے سردلی آم کھلائے اور بڑی خوش ذائقہ آئس کریم۔ انگریزوں کو قوالی سنوانا تو اُن کے لئے ایک عام بات تھی۔ سترھویں کے موقع پر عرس سے ایک دن پہلے خواجہ صاحب میدانِ عرفات میں اپنے انتظام سے قوالی کراتے تھے۔ انہوں نے اپنے احاطوں اور کمروں اور زمینوں کے عجیب عجیب نام رکھے تھے۔ انہی میں سے ایک احاطہ کا نام میدانِ عرفات تھا۔ ایک وادیٔ ایمن تھی۔ ایک ایوان خانہ تھا خود جس گھر میں رہتے تھے اس کا نام رین بسیرا تھا۔ قوالی میں شہر اور باہر کے تمام مشہور آدمی مدعو ہوتے تھے۔ ہندو اور سکھ بھی بڑی عقیدت سے اس محفل میں شریک ہوتے تھے۔ خواجہ صاحب تقریر کرتے اور سلطان جی یا امیر خسرو کے واقعات بتاتے۔ ہندوستان کی چیدہ چیدہ ٹولیاں قوالی سناتیں۔ ایک زمانہ میں بخشہ قوال کا زور بندھا جب اس پر کسی وجہ سے عتاب ہوگیا۔ تو واعظ قوال نے اپنا رنگ جمایا۔ واعظ قوال صاحب خود پیری مُریدی کرتے تھے۔ وہ بھی کچھ عرصہ بعد معتوب ہوگئے۔ ان کے بعد پریم راگی مشہور ہوئے اور وہ لد گئے تو ایک چھوٹا قوال تھا۔ اُسے نظام راگی کا خطاب دے کر مشہور کیا گیا۔ غرض خواجہ صاحب کے خاص قوال یوں ہی بنتے بگڑتے رہے۔

میرے لڑکپن میں خواجہ صاحب نے دلّی سے ایک نیا اخبار "رعیت" جاری کیا تھا۔ اُس میں کام کرنے سردار دیوان سنگھ دلّی آئے تھے۔ سردار دیوان سنگھ پہلے کہیں کمپاؤنڈر تھے مگر انہیں ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ مجھے تو بڑا آدمی بننا ہے۔ اخبار نویسی کا شوق رکھتے تھے۔ اخبار "رعیت" کی ایڈیٹری سے ان کی اخباری زندگی شروع ہوئی۔ خواجہ صاحب نے ان کے خلوص و محبت کو دیکھ کر "مفتوں" کا خطاب دیا۔ پھر دیوان سنگھ صاحب نے اپنا اخبار ریاست شائع کرنا شروع کر دیا۔ جو آج تک اردو کے تمام ہفتہ وار اخباروں میں منفرد ہے۔ مفتوں سے خواجہ صاحب کے تعلقات سالہا سال تک اچھے رہے۔ کبھی کبھی ان

میں کھٹک بھی گئی مگر صلح صفائی ہو ہوگئی۔ پھر ایک معاملے میں ایسی بگڑی کہ ہزار کوششوں پر بھی سردار صاحب کا دل صاف نہ ہو سکا۔ اور آخر تک یہ رنجش جاری رہی۔ خواجہ صاحب نے بھی مفتوں کے خلاف بہت کچھ لکھا مگر اخیر میں خود ہی خاموش ہونا پڑا۔ کیونکہ مقابلہ بڑے بےڈھب آدمی سے تھا۔ خواجہ صاحب نے ایک بات یہ بڑے مزے کی لکھی تھی کہ میں نے سردار دیوان سنگھ کو "مفتوں" کا خطاب دیا تھا جس کے معنی ہیں "فتنہ زدہ"۔

خواجہ صاحب کی مطبوعات کئی سو ہیں۔ یہ کتابیں تین طرح کی ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو خواجہ صاحب نے خود لکھی ہیں۔ دوسری وہ ہیں جو خواجہ صاحب نے لکھوائی ہیں یا ترجمہ کرائی ہیں اور مصنف یا مترجم ہی کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔ تیسری وہ خواجہ صاحب نے اپنی نگرانی میں اور اپنے ہی طرزِ تحریر میں لکھوائی ہیں۔ موخرالذکر کتابوں پر اصل مصنف کا نام نہیں دیا گیا۔ خواجہ صاحب ہی کے نام سے یہ کتابیں منسوب ہیں۔ بعض لوگ اس بات کو خواجہ صاحب کی بددیانتی پر محمول کرتے ہیں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے ان کتابوں میں اتنی اصلاح و ترمیم کی ہے کہ یہ کتابیں حقیقت میں انہی کی ہوگئی ہیں۔ واقعات تو وہی ہیں جو سینکڑوں کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ انہیں ایک خاص انداز میں سلیقے سے پیش کرنا ہی اصل کمال ہے۔ ظاہر ہے خواجہ صاحب ہندی کے پنڈت نہیں تھے لیکن خواجہ صاحب کا ترجمۂ قرآن ہندی میں موجود ہے۔ خواجہ صاحب نے یہ ہندی خود تو لکھی نہیں ہوگی۔ کسی اچھے ہندی جاننے والے سے لکھوائی ہوگی۔ مگر اس کا ایک ایک لفظ خوب ٹھونک بجا کر دیکھ لیا ہوگا۔ فقرے بھی بدلوائے ہوں گے۔ ترجمہ کی صحت کا بھی خیال رکھا ہوگا۔ ترجمہ کی ذمہ داری بھی خواجہ صاحب ہی کے سر ہے اس لئے یہ ترجمہ خواجہ صاحب ہی کا ہوا۔

دلّی میں ایک جیّد عالم مولوی عبدالسلام صاحب ہیں۔ انہیں دُنیا بھر کے علوم پر عبور حاصل ہے جس علم سے کہئے خدا کا وجود ثابت کر دیتے ہیں۔ ان کے علم کی دھاک دُور دُور تک بیٹھی ہوئی ہے اور واقعہ بھی یہ ہے کہ وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مزاج قلندرانہ

ہے۔ اپنے آگے کسی کو نہیں گردانتے۔ اور جب انہیں جلال چڑھتا ہے تو علوم کے سمندر میں طوفان آجاتا ہے۔ پھر مولانا کی جادو بیانی سننے سے تعلق رکھتی ہے۔ ضلع جگت پر اتر آتے ہیں تو وہ ناک چوٹی کا بخیہ کرتے ہیں کہ پیوند پر پیوند لگتا چلا جاتا ہے اور ہزار جامہ تیار ہو جاتا ہے۔ تصوف کے بھی دلدادہ ہیں۔ عرسوں میں شریک ہوتے ہیں۔ قوالی سنتے ہیں۔ رنڈیوں کا گانا بھی سنتے ہیں حسن پرست ہیں۔ ہر چیز میں یار کا جمال دیکھتے ہیں۔ کسی کے کہنے سننے کی پروا نہیں کرتے۔ اور کس کی شامت نے دھکا دیا ہے کہ ان سے بھڑے۔ انہیں چھیڑنا تو ایسا ہے جیسے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا۔ مگر ان کی تقریر کا لطف اٹھانا ہو تو ایک ذرا انہیں چھیڑنا ہی پڑتا ہے۔ بس پھر آپ چپکے رہیے اور ان کی گل فشانی گھنٹوں سنے جائیے۔ تو ان مولانا عبدالسلام سے خواجہ صاحب کی بھی یاد اللہ تھی۔ خواجہ صاحب نے ان سے فرمائش کی کہ آپ ایک کتاب تصوف پر لکھ دیجیے۔ مولانا نے فرمایا "خدا خوش رکھے، لکھ دیں گے شیخ"۔ مولانا کو لکھنے کا شوق نہیں ہے پھر بھی انہوں نے اپنے خلاف مزاج ایک پوری کتاب تصوف پر لکھ دی۔ کتاب پوری ہوئی تو کسی جمعرات کو سلطان جی پہنچے اور فاتحہ پڑھ کر خواجہ صاحب کے ہاں گئے۔ خواجہ صاحب تو انہیں خوب اچھی طرح سے جانتے ہی تھے۔ بڑے سلیقے سے کتاب کے بارے میں بات چیت کرتے رہے۔ مولانا کی تعریف کی۔ کتاب کی تعریف کی۔ معاوضہ بھی ان سے طے کر لیا۔ اخیر میں بولے کتاب آپ کے نام سے شائع نہیں ہوگی۔ مولانا نے کہا "کیا مضائقہ ہے شیخ" خواجہ صاحب بولے "میرے نام سے شائع ہوگی۔" مولانا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ خواجہ صاحب کا کچھ لحاظ ہی کر گئے۔ خواجہ صاحب کے ہاتھ سے کتاب لے کر اس کے چار ٹکڑے کئے اور ردی کی ٹوکری میں ڈال دی۔ خواجہ صاحب نے کہا "یہ آپ نے کیا کیا!" بولے "خدا خوش رکھے، چا، پلاؤ شیخ" اور پی کر چلے آئے گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ اخیر تک خواجہ صاحب سے اسی وضعداری سے ملتے رہے۔ وہ کتاب چھپ جاتی تو علمی نوادر میں شامل ہوتی۔

خواجہ صاحب کا اثر مسلمان والیانِ ریاست پر بہت تھا۔ نظام دکن انہیں دو تین سو روپیہ ماہوار وظیفہ دیتے تھے۔ حیدر آباد کے تمام امراء انہیں بہت مانتے تھے۔ مہاراجہ کرشن پرشاد تو ان کے مرید ہی تھے، اور ایسے مرید کہ اپنے بڑے لڑکے کا نام انہوں نے خواجہ پرشاد رکھا تھا۔ خواجہ صاحب کی اس کامیابی نے ان کے بہت سے حاسد پیدا کر دیئے تھے۔ انہیں طرح طرح سے بدنام کرنے کی کوششیں کی جاتی تھیں۔ خواجہ صاحب کو راسپوٹین تک بنایا گیا۔ مگر خواجہ صاحب کی کرامات دیکھئے کہ ان کے اقتدار میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ رامپور، مانگرول، ماناودر، جاورہ، سارے نواب انہیں سر آنکھوں پر جگہ دیتے تھے۔ افتخار علی خاں نواب جاورہ خواجہ صاحب کی بڑی عزت و تکریم کرتے تھے۔ بخشو قوال جاورہ دربار کا خاص قوال تھا۔ وہ گاتا بھی اچھا تھا اور کچھ اس ادا سے بتاتا بھی تھا کہ دیکھنے والے پھڑک جاتے تھے۔ اس کی اسی ادائیگی پر نواب جاورہ بھی لوٹ تھے۔ نواب جاورہ اور خواجہ صاحب بیٹھے تھے اور بخشو گا رہا تھا۔ اس نے ایک شعر گایا اور نواب نے ایک توڑا روپیوں کا دے دیا۔ دوسرا شعر گایا اور دوسرا توڑا دے دیا۔ اس طرح کئی توڑے دے دیئے تو خواجہ صاحب اٹھے اور بخشو کو خاموش کا اشارہ کرکے نواب سے بولے "یہ بخشو ہے تو آپ بھی دل شاہ ہیں۔" نواب صاحب نے خواجہ صاحب کو سینے سے لگا لیا۔ اس دن سے نواب کا نام ہی دل شاہ مشہور ہو گیا۔ یہاں تک کہ ان کی رعایا بھی انہیں دل شاہ ہی کہنے لگی۔

خواجہ صاحب بڑے زندہ دل اور شگفتہ مزاج آدمی تھے۔ حاضر جواب بھی ایسے ہی تھے۔ گھر پر ان کے قریب ٹیلیفون رکھا رہتا تھا۔ دن بھر میں سینکڑوں ٹیلی فون آتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ گھنٹی بجی۔ خواجہ صاحب نے ٹیلی فون اٹھایا اور بغیر جواب دیئے بند کر دیا۔ پھر خود ہی کہتے کوئی گالیاں دے رہا تھا۔ ایک صاحب نے ٹیلی فون پر پوچھا "خواجہ صاحب آپ روزنامچہ تو لکھتے ہیں شب نامچہ کیوں نہیں لکھتے۔" گھنٹی سن کر خواجہ صاحب نے ٹیلیفون اٹھایا کوئی صاحب بلی کی بولی بولے "میاؤں"۔ خواجہ صاحب نے بلے کی طرح "می.... آؤں" کہا

اور اُسنے گھبرا کر ٹیلی فون بند کر دیا۔

خواجہ صاحب ذرا سی بات میں ناراض ہو جاتے تھے اور ذرا سی بات میں خوش بھی ہو جاتے تھے۔ قائد اعظمؒ سے اختلاف ہوا تو عرصۂ دراز تک اُن کے خلاف لکھتے رہے۔ پھر اُن کے ہم خیال ہوئے تو اس شدت کے ساتھ کہ قرآن کی رُو سے مولانا آزاد کے قتل کا فتویٰ تک دے دیا۔ اس کے بعد پھر مولانا آزاد کے بھی دوست ہو گئے۔ علامہ اقبال سے خواجہ صاحب کے ذاتی تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ نہ جانے خواجہ صاحب کو کس بات سے رنجش ہو گئی کہ اقبال کو شاعرِ مشرق سے گھٹا کر انہوں نے شاعرِ پنجاب لکھنا شروع کر دیا۔ علامہ اقبال نے سوچا کہ یہ تو بہت بُرا ہوا۔ چنانچہ انہوں نے خواجہ صاحب کو زک دینے کی ایک ترکیب سوچی۔ خواجہ صاحب کو ایک خط لکھا کہ میرے گھٹنے میں مدت سے درد تھا۔ میں نے آپ کا فاسفورس کا تیل ملا۔ اس سے درد کو افاقہ ہو گیا۔ اُس دن سے علامہ اقبال پھر شاعرِ مشرق ہو گئے۔ منادی میں فاسفورس کے تیل کا جو اشتہار چھپتا تھا اُس میں شاعرِ مشرق سر محمد اقبال کی رائے ضرور شائع ہوتی تھی۔

اگست ۱۹۴۷ء میں جب دلّی میں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہوا تو خواجہ صاحب بستی نظام الدین ہی میں تھے۔ وہ بار بار دلّی کے افسروں کے پاس جاتے مگر کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوتا۔ آخر تنگ آ کر پٹیل کے پاس پہنچے۔ اُسنے پہلے تو انتظار کرایا۔ اور پھر ملا تو بڑی بے رُخی سے ملا۔ پٹیل کی لڑکی خواجہ صاحب کی بڑی عزت کرتی تھی، وہ بھی وہاں آ گئی تو پٹیل کچھ پسیجا، خاطر خواہ نتیجہ تو پھر بھی نہ نکلا۔ اتنا ضرور ہوا کہ بستی نظام الدین کی حفاظت کا کچھ انتظام ہو گیا مگر خواجہ صاحب دل برداشتہ ہو کر اپنے گھر والوں کو لے کر ہوائی جہاز سے حیدر آباد دکن چلے گئے۔ یہاں اُن کے گھر بار پر تالے پڑ گئے اور پہرے بیٹھ گئے۔ جب پوری طرح امن و امان ہو گیا تو خواجہ صاحب دلّی واپس آئے۔ حکومت سے اپنا گھر واگزاشت کرایا۔ خدا جانے کیا ملا اور کیا نہیں ملا۔ کاروبار اُن کے سب بگڑ گئے۔ دلّی کیا ہندوستان ہی میں مسلمان برائے نام رہ گئے۔ اسلامی ریاستیں سب ختم ہو گئیں۔ دوست کم اور دشمن زیادہ ہو گئے۔ واحدی صاحب تک کراچی چلے آئے لیکن خواجہ صاحب بڑی ہمت کے آدمی تھے، ہر قسم کی مصیبت جھیلتے رہے مگر بائیس خواجہ کی چوکھٹ اور سلطان جی کا آستانہ نہیں چھوڑا۔ اکبر الہ آبادی بہت پہلے کہہ گئے تھے ؎

حضرت ابُوہریرہؓ سے بلّی نہ چُھٹ سکی
خواجہ حسن نظامی سے دلّی نہ چُھٹ سکی

آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔ صحت نے جواب دے دیا تھا۔ پریشانیوں کا ہجوم تھا مگر پہلو میں دل اسی طرح زندہ تھا۔ دل میں اُسی طرح امنگ اور ترنگ تھی۔ پرانی پیچش نے دھرّا توڑ دیا تھا۔ مگر خوش گفتاری میں فرق نہ آیا تھا۔ آخری وقت تک چہکتے رہے، یہاں تک کہ طائرِ رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔

بشیر الدّین احمد دہلوی

کسی دانشور کا قول ہے کہ ہر شخص اپنی پُشت پہ تاریخ کا ایک پُشتارہ لادے پھر رہا ہے۔ اِن بے لکھی انگنت تاریخوں میں کیسے کیسے عجیب و غریب واقعات ہوں گے؟ اللہ ہی جانے۔ اور جب کیفیت یہ ہو کہ ؎

ایک ذرّے کا اگر حُسن نمایاں ہو جائے
آدمی کثرتِ انوار سے حیراں ہو جائے

تو پھر ؏

کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمہ را

بہ ایں ادّعائے عقل و دانش ہمارے علم کی بھلا کیا بساط ہے؟ اِسے سمندر کا ایک قطرہ تصور کرنا بھی مُبالغہ ہی ہوگا۔ خصوصاً جبکہ ؎

ہستی اپنی حباب کی سی ہے + یہ نمائش سراب کی سی ہے

ابھی تو اپنے وجود ہی کے بارے میں ہمیں یقین نہیں ہے، اور عالمِ شہود کی ہم طرح طرح سے تاویلیں کر رہے ہیں ؎

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

خیر، یہ تو مابعد الطبیعاتی بحثیں ہیں جن میں پڑنے کا یہ موقع نہیں۔ مجھے یہاں بہت

اختصار کے ساتھ یہ بتانا ہے کہ مولوی بشیر الدین دہلوی مرحوم کون تھے اور کیا تھے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کے احسن القصص کا خُلاصہ یوں کیا گیا ہے کہ "مردے بود، پسرے داشت، گم شد، بازیافت" یعنی ایک صاحب تھے، ان کا ایک بیٹا تھا، وہ کھو گیا، پھر مل گیا۔ مولوی بشیر الدین احمد دہلوی کے قصّے کو مختصر کرنے پر اگر میں آؤں تو یہ کہہ کر ختم کر سکتا ہوں کہ "میرے والد تھے"۔ مگر اتنا اجمال بھی کس کام کا کہ بات کچھ پلّے ہی نہ پڑے۔ اِس لئے مجھے کچھ نہ کچھ تفصیل سے کہنا ہی پڑے گا۔ لُطف تو جب تھا کہ آپ مرحوم ہی سے اُن کی سرگزشتِ حیات سُنتے، مگر افسوس کہ مرنے والے کہانیاں نہیں سُناتے۔ اِس لئے یہ سعادت پس ماندگان کے حصّے میں آتی ہے، خصوصاً اولاد کے حصّے میں۔ لہٰذا بمصداق ؏

اگر پدر نتواند پسر تمام کند — عرض کرتا ہوں سنئے۔

اللہ بخشے میرے والدِ مرحوم ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے اکلوتے بیٹے تھے۔ وہی ڈپٹی نذیر احمد جنہوں نے مراۃ العروس، توبۃ النصوح اور ابن الوقت لکھی اور کلام مجید کا ترجمہ دلّی کی ٹکسالی زبان میں کیا۔ دادا ابّا ہوش سنبھالتے ہی بجنور سے دلّی بغرضِ تعلیم آ گئے تھے۔ اُس زمانے میں یونیورسٹیاں، کالج اور اسکول نہیں تھے۔ امیروں کے بچّوں کو پڑھانے میاں جی گھروں پر آتے تھے، اوسط طبقے کے شُرفا اپنے بچّوں کو کسی نامی گرامی عالم کے مکتب یا مدرسے میں بٹھا دیتے تھے، اور غریب غُربا کے بچّے مسجدوں میں مُلّاؤں کے حوالے کئے جاتے تھے۔ غریب کا بچّہ ننّھا نذیر احمد پنجابی کٹڑے کی مسجد میں داخل کر دیا گیا۔ مسجد کا مُلّا بڑا ظالم و جابر آدمی تھا۔ جب اُس کا ناریل چٹختا تو بچّوں کی کھال اُدھیڑ کر رکھ دیتا۔ یہ مسجد طالب علموں کے لئے اقامت خانے کا کام بھی دیتی تھی مگر اقامت خانوں کی آسائشوں سے محروم تھی۔ دن بھر اس میں مار مار کر پڑھایا جاتا، جب کھانے کا وقت ہوتا تو طالب علموں سے کہا جاتا کہ جاؤ محلّے میں سے روٹی

مانگ لاؤ۔ محلے کے گھروں سے روٹی بندھی ہوئی تھی۔ بچے گھروں میں جاتے اور اپنی اپنی قسمت کا آذوقہ لے آتے۔ نذیر احمد کو جس گھر سے روٹی ملتی تھی وہ ایک جید عالم مولوی عبدالقادر کا گھر تھا۔ مفت روٹی کون کھلاتا ہے؟ نذیر احمد جب روٹی لینے جاتے تو انہیں بازار کا کوڑی پھیرا کرایا جاتا۔ سودا سلف لا دیا تو مولوی صاحب کی بچی کو بہلانا پڑتا۔ وہ کولھا توڑ چکتی تو مسالہ پیسنا پڑتا۔ کبھی یہ بھی ہوتا کہ مسالہ موٹا رہ جاتا تو لڑکی بٹا چھین کر ان کے ہاتھ کچل دیتی اور یہ "سی" کر کے رہ جاتے۔ روزی رزق کا معاملہ، کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے۔ مسجد میں طالب علموں کے لئے نہ تو کمرے تھے اور نہ بستر۔ یونہی صحنچیوں اور آنگن میں پڑ رہتے۔ کڑکڑاتے جاڑوں میں نذیر احمد ایک ٹاٹ کی صف میں لپٹ جاتے۔ صبح جب ملاجی اذان دینے اٹھتے تو ایک لات رسید کرتے اور نذیر احمد لڑھکتے چلے جاتے اور صف بھی کھل کر بچھ جاتی۔ علم کے شوق میں انہوں نے یہ ساری مصیبتیں جھیلیں۔ کڑوے تیل کے چراغ کی روشنی میں رات رات بھر پڑھا۔ جب چراغ میں تیل بھی میسر نہ ہوتا تو سڑک کے کنارے کسی لالٹین کے نیچے کھڑے ہو کر پڑھتے۔ مسجد میں نصاب پورا کرنے کے بعد حسنِ اتفاق سے دلی کالج میں داخلہ مل گیا۔ یہاں محمد حسین آزاد اور منشی ذکاء اللہ کا ساتھ ملا۔ آگے چل کر یہ تینوں ہم جماعت شمس العلماء بنے۔ جب تک جیتے رہے ان تینوں بزرگوں میں محبت اور دوستی کا سلسلہ قائم رہا۔

ہاں تو حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ مولوی عبدالقادر صاحب کو اپنی صاحبزادی کے لئے رشتے کی تلاش ہوئی تو ان کی نظرِ انتخاب نذیر احمد پر پڑی۔ اگلے وقتوں میں ہڈی بوٹی دیکھی جاتی تھی۔ نذیر احمد کی ناداری ہی میں انہوں نے اپنی لڑکی کو بیاہ دیا۔ اللہ آدمی تھے، شاید یہ سوچا ہو کہ لڑکا ذہین اور محنتی ہے، گھر داماد رکھ لیں گے مگر غیرت دار نذیر احمد نے اسے گوارا نہیں کیا کہ سسرال کے ٹکڑوں پر پڑ جائیں۔ دلی والوں کی

ایک مثل ہے "ساس گھر جنوائی کُتّا بہن گھر بھائی کُتّا"۔ بھلا نذیر احمد نے جو دلی کی زبان کے دیوانے تھے اس مثل کو کیسے نہ سنا ہوگا۔ علیحدہ ایک کوٹھری کرایہ پر لیکر رہے اور اپنی کمائی کی روکھی سوکھی پر قناعت کرتے رہے۔ میں نے اپنے خاندان کی بڑی بوڑھیوں سے سنا ہے کہ اس وقت ان کے گھر میں صرف ایک ٹوٹی ہوئی جوتی تھی جسے کبھی دادا ابا بلگا لیتے اور کبھی دادی اماں۔ مجھے تعجب دادی اماں پر ہوتا ہے کہ وہ ایک رئیس آدمی کی لاڈوں پلی بیٹی تھیں۔ انہوں نے اس مفلسی اور تنگدستی کو خندہ پیشانی سے کیسے انگیز لیا؟ کوئی اور سوال کی ہوتی تو کبھی کی دھتا بتا چکی ہوتی۔ مگر نہیں شریفوں کا یہی دستور تھا کہ ماں باپ نے جس کے ہاتھ میں ہاتھ پکڑا دیا اسی کو اپنا مجازی خدا مان لیا۔ مرنا بھرنا ان کا اصول تھا۔ جس گھر میں لڑکی کا ڈولا آتا تھا اس گھر سے پھر اس کی کھاٹ ہی نکلتی تھی۔

دلی کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد نذیر احمد کچھ دنوں تک بیکار رہے۔ انہیں بڑا تاؤ آیا۔ ایک دن پرنسپل سے جا کر بھڑ گئے۔ پرنسپل نے پوچھا "آج کل کیا کر رہے ہو؟" بولے "جھک مار رہا ہوں۔ اپلوں کی ٹال کرنے کا ارادہ ہے۔ اس پر دلی کالج کی سند لگاؤں گا تاکہ سب کو معلوم ہو جائے دلی کالج میں تعلیم پانے کا کیا حشر ہوتا ہے۔" قصہ کوتاہ انہیں پہلے مدرسی اور اس کے بعد اسکول انسپکٹری مل گئی۔

یہی زمانہ تھا کہ ان کے ہاں اولاد ہونی شروع ہوئی، اور خدا کے فضل سے ایسی بھاگوان اولاد ہوئی کہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرتے چلے گئے۔ ڈپٹی کلکٹر بنے اور ڈپٹی صاحب کہلائے۔ ڈپٹی ان کے نام کا جزو ہی ہو گیا اور یہ سابقہ ان کے ساتھ ایسا چپکا کہ حیدرآباد دکن میں رکنِ صدارت عظمیٰ ہو جانے کے باوجود "ڈپٹی" ہی کہلائے۔ نذیر احمد کو کوئی جانتا ہو یا نہ جانتا ہو ڈپٹی صاحب کو سب جانتے تھے: ڈپٹی صاحب کی کتابیں، ڈپٹی صاحب کا اصغری اکبری کا قصہ، ڈپٹی صاحب کا ترجمۂ قرآن۔

حد یہ کہ تقسیمِ ہند تک ہم لوگ "ڈپٹی صاحب والے" کہلاتے رہے۔

میرے والد، ہنگامہ ۱۸۵۷ء جسے عرفِ عام میں "غدر" کہا جاتا ہے، کے تین چار سال بعد پیدا ہوئے۔ اُس وقت عُسرت ڈپٹی صاحب کے گھر سے رُخصت ہو چکی تھی اور روز افزوں فارغ البالی کا دَور شروع ہو گیا تھا۔ اِس لحاظ سے میرے والد خوش قسمت تھے کہ میرے جدِ امجد کی طرح اُنہیں مُفلسی میں آنکھیں کھولنی نہیں پڑیں، بلکہ انگریزی محاورے کے مطابق "مُنہ میں چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے تھے"۔ یوں تو ڈپٹی صاحب کے ہاں کئی بچے ہوئے مگر جیئے صرف تین ہی، دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔

ابتدا میں ان کی تعلیم کا انتظام دادا ابا نے خود کیا تھا۔ قرآن شریف دادی اماں نے اپنے سب بچوں کو خود پڑھایا تھا۔ عربی، فارسی اور اُردو دادا ابا پڑھاتے تھے۔ اُردو میں اُس وقت بچوں کے لئے کتابیں ہی نہیں تھیں۔ دادا ابا نے یہ کیا کہ ایک کتاب لڑکیوں کے لئے اور ایک لڑکے کے لئے لکھ دی۔ اُس وقت دادا ابا سررشتۂ تعلیمات میں تھے۔ اتفاق سے اُس وقت کا انگریز ڈائریکٹر صوبے کا دَورا کرتے کرتے دادا ابا سے ملنے گھر پر چلا آیا۔ اتفاق سے خورد سال میاں بشیر بھی کھیلتے کھیلتے اُدھر آنکلے۔ صاحب نے محبّت سے بلایا اور پوچھا "کیوں میاں، کیا پڑھتے ہو؟" میاں بشیر نے کہا "اپنی کتاب پڑھتا ہوں۔ لاکر دکھاؤں؟" صاحب نے کہا "ہاں لاؤ۔" میاں بشیر دوڑ کر گئے اور گھر میں سے اپنی کتاب لے آئے۔ صاحب نے کتاب کو کہیں کہیں سے دیکھا۔ کتاب کہاں تھی، کتاب کا مسودہ تھا۔ بولے "مولوی صاحب، یہ تو بہت اچھی کتاب ہے۔ آپ اسے چھپوا دیجئے۔" میاں بشیر نے کہا "آپا کی کتاب بھی لاکر دکھاؤں؟" صاحب نے کہا "ضرور دکھاؤ۔" میاں بشیر لپک کر بڑی آپا کی کتاب بھی لے آئے۔ صاحب نے اِسے بھی جستہ جستہ دیکھا، اور حیران ہو کر بولے "مولوی صاحب آپ نے ایسی اچھی اچھی کتابیں لکھ کر گھر میں رکھ چھوڑی ہیں، انہیں فوراً چھپوا دیجئے تاکہ سب بچے

ان سے فائدہ اُٹھائیں۔" چنانچہ یہ کتابیں دادا ابا نے چھپوا دیں۔ ایک مراۃ العروس تھی اور دوسری مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ چند پند تھی یا مُنتخب الحکایات۔ ان دونوں کتابوں پر صاحب نے سفارش کر کے سرکار سے انعام دلوا دیا۔ اِس سے دادا ابا کو احساس ہوا کہ اچھی کتابیں لکھنے کی ان میں صلاحیت ہے۔ چنانچہ بچیوں کے لئے مراۃ العروس کا دوسرا حصّہ بنات النعش لکھا اور لڑکوں کے لئے فارسی کی آسان گرامر "صرفِ صغیر" اور عربی کی گرامر "ما یغنیک فی الصرف" لکھی۔ جب ڈپٹی صاحب کی یہ کتابیں شہرت کے پر لگا کر اُڑیں اور گھر گھر پھیل گئیں تو "ہل من مزید" کی آوازیں چاروں طرف سے آنے لگیں۔ سر سید احمد خاں کی رفاقت کے بدولت ڈپٹی صاحب کو مُسلم قوم اور مُسلم معاشرے کی ابتر حالت کی طرف توجہ ہوئی اور خُشک پند و وعظ کی بجائے انگریزی کی تقلید میں اصلاحی ناولوں کا سلسلہ شروع کیا۔ توبۃ النصوح، ابن الوقت، فسانۂ مبتلا اور ایامیٰ اسی دَور کی یادگار ہیں۔

جب دادا ابا بسلسلۂ ملازمت دلّی سے باہر رہنے لگے تو میاں بشیر کو دلّی کالج میں داخل کر دیا، اور گھر پر پڑھانے کے لئے بھی ایک اُستاد مُقرر کر دیا۔ دادا ابا نے میاں بشیر کی طالب علمی میں جو خطوط اُنہیں لکھے پروفیسر شہباز مرحوم نے اُن خطوں کو "موعظۂ حسنہ" کے نام سے کچھ عرصے بعد شائع کر دیا۔ یہ خطوط نامہ و پیام کی حد سے نکل کر نصیحتِ فرجام کے دائرے میں آجاتے ہیں۔ ڈپٹی صاحب نے بڑی محبّت اور بڑی دلسوزی سے بیٹے کو بار بار دل لگا کر پڑھنے کی تاکید کی ہے۔ خود بھی کئی طویل خطوں میں انگریزی اور عربی کے درس دیئے ہیں۔ بعض خطوں میں ناراض ہو کر میاں بشیر کو شفقت سے ڈانٹا بھی ہے۔ کہیں محبّتِ پدری سے اُن کا دل پسیج جاتا ہے اور بیٹے سے کہتے ہیں کہ "تعلیم کے لئے جتنا روپیہ چاہو مجھ سے لو۔ اگر تمہیں کالج پیدل جانے میں زحمت ہوتی ہو تو بگھی رکھ لو، مگر پڑھنے سے غافل مت ہو۔" میاں بشیر کند ذہن نہیں تھے، محنت

سے کبھی جی نہیں چراتے تھے مگر رئیس زادے تھے اور باپ کی طرح اُن پر بپتیری وقت نہیں پڑا تھا۔ ادب کے علاوہ ان کا جی کسی اور مضمون میں نہیں لگتا تھا۔ تاہم باپ کے خوف سے پڑھا اور دلّی کالج سے فراغت حاصل کرلی۔ دادا ابا کا کہنا یہ تھا، اور ابا کا بھی کہ "اولاد کو کھلاؤ سونے کا نوالہ مگر دیکھو شیر کی نگاہ"۔ دادا ابا نے مارنا تو کیا کبھی میاں بشیر کو پھولوں کی چھڑی تک نہیں چھوائی مگر اُن کا رُعب اس قدر غالب تھا کہ بیاہے تیاہے ہوجانے کے باوجود ابا اُن سے نظریں اُونچی کرکے بات نہ کرتے تھے۔

یہی حال ہمارا بھی رہا کہ ہم نے اپنے باپ سے کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کی، اور نہ کبھی بے ضرورت اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کی جُرأت کی۔

میرے والد نے سولہ سترہ برس کی عمر ہی میں حیدرآباد دکن میں مُلازمت کرلی تھی۔ ملازمت کا آغاز سوم تعلقداری سے ہوا اور اپنی اعلےٰ کارکردگی کے باعث اوّل تعلقداری تک ترقی کی۔ صوبے داری انہیں ملنے والی تھی کہ مُلکی اور غیر مُلکی سازشوں سے مُتنفّر ہوکر قبل از وقت پنشن لے کر دلّی چلے آئے۔ دلّی میں اُن کے لئے بہت سے ضروری کام رُکے ہوئے تھے۔ دادا ابا کے انتقال کو پانچ چھ سال ہوچکے تھے۔ مرحوم کو تجارت میں روپیہ لگانے کا شوق تھا۔ خود اُن کی زندگی میں یار لوگ لاکھوں روپیہ کھا چکے تھے تو بھلا اُن کے مرنے کے بعد کیا خاک وصول ہوتا۔ جائداد کا کرایہ کئی ہزار روپے مہینے کا تھا۔ وہ سب غتر بود ہو رہا تھا۔ دادا ابا کی سب کتابیں، اور ترجمۂ قرآن نایاب ہوچکا تھا۔ غرض دادا ابا کی آنکھ بند ہوتے ہی گھر میں لُٹس مچ گئی تھی، اور جب ابا دلّی پہونچے تو انہیں گھر سخی کے دل کی طرح صاف ملا۔ خود ابا کو لکھنے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ آغازِ جوانی ہی میں انہوں نے "حُسنِ معاشرت" جیسا اصلاحی ناول لکھ ڈالا تھا جسے دادا ابا بھی دیکھ کر خوش ہوئے تھے، اور علامہ راشد الخیری نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر ہمیں یہ نہ بتایا جاتا کہ یہ کتاب مولوی بشیر الدین احمد

نے لکھی ہے تو ہم بلا تکلف کہہ دیتے کہ "حسنِ معاشرت" مولوی نذیر احمد کی کتاب ہے۔ بچیوں کے لئے "حُسنِ معاشرت" کے بعد ابا نے دو ناول اور لکھے تھے، "اقبال دلہن" اور "اصلاحِ معیشت"۔ ملازمت ہی کے زمانے میں سات آٹھ سو صفحے کی کتاب "تاریخ بیجانگر" لکھی اور اس کے بعد دو ضخیم جلدوں میں تاریخِ بیجاپور لکھی۔ ان کتابوں پر نظام گورنمنٹ نے گرانقدر انعام دیا تھا۔ امریکہ کے ڈاکٹر اسٹال نے کوئی پچاس سال اُدھر ایک سلسلہ کتابوں کا لکھا تھا WHAT A BOY OUGHT TO KNOW اور WHAT A GIRL OUGHT TO KNOW وغیرہ وغیرہ۔ اسی کی طرز پر ابا نے "حرزِ طفلاں"، "نشاطِ عمر"، "عصائے پیری" اور "بچیوں سے دو دو باتیں" لکھیں۔ ڈاکٹر اسٹال نے اپنی کتابوں میں جگہ جگہ بائبل کے حوالے دیئے تھے، ابا نے ان کتابوں میں قرآن کی آیتیں حسبِ موقع دیں۔ ان کی یہ سب تصانیف زمانۂ قیام حیدرآباد کی ہیں۔

دلّی آنے کے بعد ابا نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ دادا ابا کی سب کتابیں خاص اہتمام سے چھپائیں۔ بڑا قرآن شریف اور حمائل آگرہ میں صوفی قادر علی خاں کے پریس سے چھپوا کر منگائی۔ دادا ابا کی کتابوں کے بعد اپنی سب کتابیں چھپوائیں۔ اسی دوران میں ہیلی صاحب چیف کمشنر دہلی کی فرمائش پر تاریخ دہلی لکھنی شروع کی۔ سرسید کی آثار الصنادید میں جتنی پُرانی عمارتوں اور کھنڈروں کا ذکر ہے۔ ایک ایک کو خود جاکر دیکھا۔ کتنی ہی عمارتیں دستبُردِ زمانہ سے معدوم ہوچکی تھیں۔ دلّی میں کتنے ہی قبرستان آباد ہوگئے تھے، ان کے کتبوں سے مرنے والوں کا نام نشان معلوم کیا۔ سرسید نے اپنے زمانے کے بعض اکابرِ دہلی کا تذکرہ آثار الصنادید میں کیا ہے۔ آثار الصنادید ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ تاریخ دہلی اس کے کوئی ستّر سال بعد شائع ہوئی۔ مُصنّف نے اس میں اپنے زمانے کے بزرگوں اور اہلِ کمال کا تذکرہ کیا ہے۔ پُرانی دلّی

کے تمام گلی کوچوں اور محلوں کے علاوہ نئی دلی کا پورا حال بھی اپنی تاریخ میں درج کیا ہے، تین موٹی موٹی جلدوں میں یہ کتاب شائع ہوئی اور اس پر حکومت سے انعام ملا۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ اردو میں کوئی مجموعہ شائستہ لطیفوں کا نہیں ہے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ سال بھر کے اندر ہی اندر چھ کتابیں تیار کر کے چھاپ دیں۔ تین حصے "حکایاتِ لطیفہ" کے ہیں اور تین حصے "لطائفِ عجیبہ" کے۔

میرے والد بڑے محنتی آدمی تھے۔ گرمیوں میں صبح چھ بجے ناشتہ کر کے لکھنے پڑھنے کے کام پر جم جاتے۔ میز کرسی نہیں فرش پر بیٹھتے تھے۔ صدر دالان میں چاندنی کا فرش، پیچھے گاؤ تکیہ، آگے لمبی سی نیچی میز۔ میز پر کاغذوں کے انبار۔ دونوں پہلوؤں میں کتابوں کے ڈھیر۔ بائیں طرف بڑے سے تھال میں اونچا سا حقہ جس کی سٹک ان کی گود میں پڑی رہتی۔ ایک لڑکا صرف حقے پر نوکر تھا۔ اس کا یہ کام تھا کہ صبح سے رات گئے تک حقے تازے کرتا رہے اور چلمیں بھرتا رہے۔ بیسیوں قسم کے حقے گھر میں تھے، لکھنؤ کے ہردم تازہ اور گڑگڑی سے لے کر نصف قدِ آدم تک کے حقے۔ ایک حقہ چاندی کا بھی تھا جو شادی بیاہوں کے موقع پر نکالا جاتا تھا۔ حقہ کیا تھا یہ معلوم ہوتا تھا کہ دولہا سہرا بدھی پہنے کھڑا ہے۔ خمیرا اور تمباکو لکھنؤ سے آتا تھا اور اس کی خوشبو سے سارا گھر مہک جاتا تھا۔ گرمیوں میں دالان کے دروں پر خس کی ٹٹیاں لگ جاتیں۔ ہر گھنٹے دو گھنٹے بعد انہیں تر کیا جاتا۔ سقفی پنکھا فرّاٹے بھرتا۔ اس پُر سکون اور ٹھنڈی فضا میں ابا اپنے کام میں کھو جاتے۔ حقے بھی خس ہی کے استعمال کئے جاتے۔ لڑکا انہیں تازہ کرتا رہتا اور چلمیں بدلتا رہتا۔ ابا کو اپنے کام میں اس قدر انہماک ہوتا کہ انہیں دین دنیا کی کچھ خبر نہ رہتی۔ بارہ ساڑھے بارہ بجے بی مغلانی ہلکے سے کھانس کھنکار کے دالان میں داخل ہوتیں اور کہتیں سرکار کھانا تیار ہے۔" ابا چونک کر ہاتھ سے قلم رکھ دیتے۔ اگلے دالان میں فرش پر دستر خوان بچھ جاتا۔ اتنے کھانا چنا جاتا اور ہم سب

قرینے سے ہو بیٹھتے۔ ایک لڑکا آفتابہ اور سلفچی لے کر پہنچ جاتا اور ابا ہاتھ دھو، کلی کر دستر خوان پر آجاتے۔ ہم سب اپنے باپ سے بہت ڈرتے تھے۔ اس لئے خاموش رہتے۔ کھانے کے دوران میں ابا کو بھی اس خاموشی کا احساس ہوتا اور وہ مزے مزے کی باتیں چھیڑ دیتے۔ مثلاً ہمارے ہاں چند دستر خوان ایسے تھے جن کے حاشیے پر نیلے اور لال شیر چھپے ہوئے تھے، منہ پھٹا ہوا، دم اٹھی ہوئی۔ جیسے ابھی حملہ کر دیں گے۔ ہم چونکہ بہت دنوں سے انہیں دیکھتے چلے آرہے تھے کبھی ہم نے اس پر غور نہیں کیا کہ ان شیروں میں کیا مصلحت ہے۔ ایک دن جب ان میں سے ایک دستر خوان بچھا تو ابا ہی نے پوچھا کہ "بتاؤ اس پر یہ شیر کیوں چھپے ہوئے ہیں؟" ہم کیا جانتے؟ بولے "معلوم نہیں۔" ابا نے کہا "حیدر آباد میں ایک چھیپی کو یہ دستر خوان دیئے تھے کہ ان پر شعر چھاپ لاؤ۔ وہ کم بخت یہ شیر چھاپ لایا۔ جب اس سے کہا کہ یہ کیا کیا؟ تو بولا "سرکار ہی تو بولے تھے کہ اس پر شیراں چھاپ کو لاؤ۔" اس انکشاف پر ہم سب ہنستے اور ابا بھی ہمارے ساتھ ہنسنے لگے۔ ایسی خوش مزاجی کی باتیں ابا اکثر کرتے تھے مگر نہ جانے کیوں ہم بچوں کا تو ان سے دم ہی نکلتا رہا۔

ابا بڑے خوش مذاق آدمی تھے۔ کھانے من بھاتا، پہننے جگ بھاتا۔ اچھے سے اچھا باورچی ملازم رکھتے۔ اور عمدہ سے عمدہ کھانے پکواتے۔ لباس کے بھی بہت شوقین تھے۔ دیسی اور ولایتی سبھی قسم کے کپڑے تھے اور اتنے زیادہ کہ ان کے پہننے کی باری بھی نہیں آتی تھی۔ ایک زمانے میں انگرکھا بھی پہنا کرتے تھے۔ ورزشی جسم تھا اس لئے ان پر پھبتا بھی خوب تھا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو سینکڑوں ہی جوڑے جوتے اور جوتیوں کے ان کے پاس تھے۔ لونگ بوٹس سے لے کر سلیم شاہی تک کوئی قسم جوتی کی نہیں بچی تھی۔ یہی حال ٹوپیوں کا تھا کہ سولا ہیٹ سے دو پلی تک سبھی موجود۔ چھڑیوں کے کئی گٹھے تھے جن میں سونٹے بھی تھے اور قمچیاں بھی۔ سواری کے لئے گھوڑے ہمیشہ اچھے

پاس رہے۔ دلی آنے کے بعد بھی دو بگھیاں گھر پر رہیں۔ موٹر انہوں نے کبھی نہیں رکھی۔ کتابیں ان کے پاس کئی ہزار تھیں۔ دو کمروں میں یہ کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ پنشن لینے کے بعد ان کا اوڑھنا بچھونا ہی کتابیں ہو گئی تھیں۔ ظہر کی نماز پڑھ کر آرام کرتے اور عصر کے بعد پھر لکھنے بیٹھ جاتے تو عشاء کے وقت اُٹھتے۔ رات کے کھانے کے بعد لیٹ کر مطالعہ کرتے۔ گیارہ سے پہلے نہیں سوتے تھے اور صبح اذانوں کے وقت اُٹھتے۔ اور اپنے کمرے ہی میں ورزش کر لیتے تھے۔ خصوصاً سینڈو کے ڈمبل۔ ساٹھ سال کی عمر میں چالیس سال کے معلوم ہوتے تھے۔

حیدرآباد میں جب میری والدہ کا انتقال ہوا تو میری عمر چھ برس کی تھی اور بڑے بھائی نو برس کے تھے۔ سب سے چھوٹی بہن چند روز کی تھی۔ اسی کے جاپے میں اماں کا انتقال ہوا تھا۔ ابا نے ہم چار بھائیوں اور دو بہنوں کو اس اہتمام سے پالا کہ ہمیں اپنی ماں کی کمی شاید ہی کبھی محسوس ہوئی ہو۔ نوکر چاکر اور خادماؤں کے علاوہ ہم پر یورپین گورنسیں رکھیں، نرسیں اور آیائیں رکھیں اور ہمیں اعلیٰ درجے کے اُن کونونٹ سکولوں میں پڑھوایا جن میں دیسی بچوں کا داخلہ نہیں ہوتا تھا۔ مگر ابا حاکمِ ضلع تھے اس لئے اُن کی بات کیسے ٹلتی؟ پھر جب ہم ذرا بڑے ہو گئے تو ہم تین بھائیوں کو علی گڑھ میں خود لے جا کر داخل کیا۔ اور ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کو ہمارا نگراں مقرر کیا۔ بورڈنگ میں بھی ایک ملازم اور ایک پرائیویٹ ٹیوٹر ہمارے لئے رکھا۔ ڈھائی تین سال کے بعد جب تحریکِ ترکِ موالات چلی تو ہمیں دلی بلا لیا۔ شام کو ہم سب کو دو گھنٹے انگریزی اور فارسی خود پڑھاتے اور حساب اور دوسرے مضامین پڑھانے کے لئے ٹیوٹر مقرر کئے۔ ابا نے ہماری تعلیم و تربیت کے لئے کبھی روپے کا منہ نہیں کیا۔ دل کھول کر خرچ کرتے۔ پیسے کی کمی بھی نہیں تھی۔ علاوہ کئی لاکھ کے اندوختے کے تین چار ہزار روپے مہینے کی یافت تھی۔ سلیقے مند آدمی تھے، کسی عیب میں نہیں تھے۔ سستا سماں، ایک پیسے کے چار سودے آتے تھے۔ دلی کے تمام بہادر نوابوں سے زیادہ ٹھاٹھ کی زندگی گزارتے۔ سرکار میں بھی بات بنی ہوئی تھی۔ خطاب اور آنریری مجسٹریٹی کی کئی دفعہ پیش کش ہوئی مگر یہ کہہ کر رد کر دی کہ اس سے میرے علمی مشاغل میں فرق آتا ہے۔ خان بہادری سے اُنہیں نفرت تھی۔ شمس العلماء کا خطاب تجویز ہو رہا تھا کہ پیامِ اجل آگیا۔

ابا بڑے مذہبی خیال کے آدمی بھی تھے۔ ان کی ابتدائی تصویروں سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ڈاڑھی کبھی نہیں مُنڈوائی۔ بڑی خوبصورت بھریری ڈاڑھی تھی ابا کی۔ مگر دو انگشت سے آگے کبھی نہیں بڑھی۔ اتنی ہی ڈاڑھی دادا ابا کی بھی تھی۔ مگر چھدری۔ ابا کا خط بھرواں تھا۔ اُس زمانے میں یہ ایڈورڈ فیشن کی ڈاڑھی کہلاتی تھی۔ بعد میں جارج پنجم کی ڈاڑھی بھی اسی وضع کی رہی۔ نماز پابندیٔ وقت کے ساتھ پنج وقتہ پڑھتے تھے۔ رمضان شریف میں تراویاں (تراویح) بھی پڑھنے جاتے تھے۔ قرآن شریف روانی اور خوش الحانی سے پڑھتے اور ماہِ صیام میں ہر تیسرے دن ایک قرآن ختم کرتے۔ ہم سب کو بھی نماز روزے کی تاکید تھی۔ سحری اور افطار میں سب شریک ہوتے۔ محلے کی مسجد میں افطاری ضرور بھجوائی جاتی۔ میلاد اور وعظ بھی ہوتا تھا، خصوصاً مولوی دُلہن کا۔ یہ مولوی دلہن بھی ایک خاص وضع کے آدمی تھے۔ وارثیوں کی طرح ایک گیروا چادر لپیٹے رہتے۔ زلفوں کے چھلّے دونوں شانوں پر پڑے ہوئے، اُجلا رنگ، کُشادہ پیشانی، لمبوترا چہرہ، کھچڑی ڈاڑھی، لبیں ترشی ہوئی۔ سنہری فریم کی عینک جس میں سے سُرمہ لگی آنکھیں چمکتی رہتیں۔ پان کھاتے اور مسّی لگاتے۔ عطرِ حنا میں بسے رہتے۔ وعظ لچھے دار زبان میں کہتے اور نعت و مُنقبت لہک کر سُناتے۔ جی لگتا تھا ان کے وعظ میں۔ ایک آدھ مرتبہ مولوی احمد سعید کا وعظ بھی سُنا۔ ان کی تقریر عالمانہ ہوتی تھی، اور جب ایک دم سے پٹڑی بدل کر دلی کی ٹکسالی زبان بولنے پر آتے تو سُننے والوں میں ہنسی پڑ جاتی۔ روزِ محشر کے نقشے مولوی صاحب پیش کر رہے ہیں کہ "سوا نیزے پر آفتاب ہو گا، آنکھیں بجائے چہرے کے

سروں پر لگی ہوں گی۔ گرمی کا یہ حال ہوگا کہ گنہگار ٹخنوں ٹخنوں، گھٹنوں گھٹنوں، کمر کمر اور گردن گردن تک پسینے میں ڈوبے ہوں گے۔ جو اور زیادہ گنہگار ہوں گے وہ پسینے میں غوطے کھاتے ہوں گے۔ مگر جو اللہ کے نیک بندے ہوں گے وہ درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھے چائے بسکٹ اُڑا رہے ہوں گے۔"

زکوٰۃ بھی ابا بڑی پابندی سے نکالتے تھے۔ غریب اور مسکین رشتہ داروں اور کُنبہ داروں کے ماہانے مُقرر تھے۔ بیواؤں اور یتیموں کا حق ان کے بعد آتا تھا۔ ان کے بعد کارِ خیر کا نمبر تھا۔ جاڑوں میں لحاف بنوا کر تقسیم کرتے اور گرمیوں میں ننھے ململ کے جوڑے۔ حج کو جانے کا ارادہ ہی کرتے رہے۔ ہم سب کی شادیاں کر چکے تھے، صرف میری سب سے چھوٹی بہن رہ گئی تھی۔ اس کی شادی کے بعد جاتے، مگر اس سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

دادا ابا خاصے کٹر مولوی تھے، وہ دین کے آگے دُنیا کی پروا نہیں کرتے تھے۔ ابا دین اور دُنیا دونوں رکھتے تھے۔ تھیٹر اور سینما دیکھتے اور ہمیں بھی دکھاتے۔ ہماری شادیوں میں برات کے ساتھ بینڈ باجہ تو نہیں بجا لیکن دو دو تین تین دن تک مشہور طوائفوں کے ناچ گانے اور بھانڈوں کے مُجرے اور نقالوں کی نقلیں ہوتی تھیں۔ یہ محفلیں مخصوص ہوتی تھیں اور اُن میں صرف اُن شُرفا کو مدعو کیا جاتا جنہیں اس فن کا ذوق ہوتا۔ ان محفلوں میں بیلیں نہیں دی جاتی تھیں اور نہ کوئی اور بیہودگی روا رکھی جاتی۔

اس پر ایک ناگوار قصہ یاد آیا۔ ہمارے ایک دُور پرے کے عزیز جو بڑے کٹر اہلِ حدیث ہیں یوں تو ابا کے پاس ہمیشہ آتے رہے مگر ابا کے جنازے میں نہیں دکھائی دیئے۔ بعد میں انہوں نے بڑے بھائی سے کہا کہ "بھائی بشیر رنڈی کا ناچ دیکھتے تھے، اس لئے میں اُن کے جنازے میں شریک نہیں ہوا۔" بھائی نے کہا "مگر ہم تو آپ کے جنازے میں شریک ہوں گے اور آپ کو کندھا بھی دینگے۔" بہت ناراض ہوئے اور پیر پٹختے

ہوئے چلے گئے۔

ابا ساری عمر بڑے بڑے عہدوں پر رہے اور چونکہ ضلع کے حاکم ہوتے تھے اس لئے ہر قسم کے مُقدموں کی سماعت کر کے فیصلے لکھتے تھے مگر بڑے رحم دل اور خاصے بھولے آدمی تھے۔ پھانسی کا حکم جہاں تک ممکن ہوتا نہیں سناتے تھے۔ حیدر آباد میں پھانسی نہیں دی جاتی تھی بلکہ "گردن ماری" جاتی تھی۔ یعنی مُشکیں کسنے اور دو زانو کرنے کے بعد جلاد کھٹّا سا سر اُڑا دیتا تھا۔ اُس وقت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو بھی موجود رہنا پڑتا تھا۔ اس لئے ابا عموماً عمر قید کی سزا دیا کرتے تھے۔ اُن کی اس نرم دلی سے رعایا تو بہت خوش رہتی مگر حکومت کی "بُری کتابوں" میں ان کا نام چڑھتا رہتا۔ مگر ابا نے کبھی اس کی پروا نہیں کی۔ اور جب ان کی بہت مخالفت ہو گئی تو نوکری چھوڑ چھاڑ کر دلی چلے آئے۔

دادا ابا اور ابا کی کتابیں لکھنے کے لئے کئی کاتب ہمارے مردانے گھر میں بیٹھ کر کتابت کیا کرتے تھے۔ ان میں ایک خوش نویس غیاث الدین بھی تھا جو خوش خط تو بہت تھا مگر بڑا غیر ذمہ دار۔ اُجرت ملتے ہی کئی کئی دن کے لئے غائب ہو جاتا۔ ابا اُسکے تساہل کو اس کی خوشخطی کی وجہ سے ٹال جاتے۔ مگر حد ہوتی ہے برداشت کی بھی۔ غیاث بہانے بنا کر پیشگی بھی لے جاتا اور کام پر بھی نہ آتا۔ ابا خفا ہوتے تو مسکین سی صورت بنا کر کبھی اپنے باپ کے مرنے کی خبر سُنا دیتا اور کبھی اپنی ماں کے فوت ہونے کی۔ غرض رفتہ رفتہ اُسنے اپنے تمام بڑوں کو مار ڈالا۔ ابا کو جب غصہ آتا تو بس پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ ایک چیخ ان کی زمین پر اور ایک آسمان پر ہوتی۔ ہتھ چھُٹ بھی تھے۔ دو چار تھپڑوں ہی میں آدمی کا بھُرکس نکل جاتا۔ مگر غیاث اپنی چالاکیوں سے بچتا رہا۔ ایک دن غائب ہو کر حاضر ہوا تو ابا نے ڈانٹا۔ سوکھا سا منہ بنا کر بولا۔ "گھر والی کا جاپا بگڑ گیا ہے۔ اُسے ہسپتال لے کر گیا تھا۔" ابا نے کہا۔ "اچھا تو جاؤ کام کرو۔" مگر غیاث

سر جھکائے وہیں کھڑا رہا۔ ابا نے کہا: "جاتے کیوں نہیں؟" بولا: "کچھ پیسے چاہئیں خرچہ کے لئے۔" ابا نے کہا: "جاؤ اشتیاق (منیجر) سے لے لو۔" وہاں سے خوش خوش آیا اور اشتیاق صاحب سے دس بیس روپے لے کر پھر غائب ہو گیا۔ جب وہ پیسے اُڑا چکا تو پھر آگیا۔ کاتبوں نے کہا "ڈپٹی صاحب صبح سے کئی دفعہ تجھے پُوچھ چکے ہیں۔ کہہ گئے ہیں کہ اُسے آتے ہی میرے پاس بھیجنا۔ آج تیری خیر نہیں ہے۔ سر سے توا باندھ کر جائیو۔ سارے کُٹم کو مار چکا۔ پیشگیاں الگ مارتا ہے۔ آج بیٹا وہ مار پڑے گی کہ ہڈی پسلی ایک ہو جائے گی۔" مگر میاں غیاث بنہایت اطمینان سے ابا کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ ابا جھلائے ہوئے بیٹھے تھے۔ نظر اُٹھا کر دیکھا تو دیکھا کہ غیاث سر اور ڈاڑھی کے بال پریشان کئے میلے چیکٹ کپڑے پہنے کھڑے ہوئے ہیں اور رُخسار آنسوؤں سے تر ہیں۔ اس سے پہلے کہ ابا کچھ کہیں خود انہوں نے رو کر کہا "مر گئی۔" ابا کا چہرہ اس وقت دیکھنے کے لائق تھا۔ یا تو مارے غصّے کے ایک رنگ آرہا تھا اور ایک جا رہا تھا یا ایک دم سے سُت گیا اور گھبرا کر بولے۔ "جاؤ جاؤ، اشتیاق سے کچھ لے کر فوراً گھر جاؤ۔" یاد نہیں کون پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اُس سے بولے "ارے ہے، بچارے کی بیوی مر گئی۔" غیاث وہاں سے اُلٹے قدموں لوٹے اور ڈیوڑھی سے نکلتے ہی ٹھٹھے لگاتے اشتیاق صاحب کے پاس پہونچے کہ "لائیے روپے دلوائیے، ڈپٹی صاحب نے کہدیا ہے۔" سب نے حیرانی سے اُس کی طرف دیکھا۔ پوچھا "ابے کیا منتر مارا آج؟ تیری تو آج خبر ہی آنے والی تھی؟" غیاث نے ہنس کر لطیفہ سُنایا۔ چشتی صاحب نے کہا "ہا کمبخت، منحوس، تُو نے جورو کو جیتے جی مار ڈالا۔" بولے "جی حضور، ورنہ آج میں مارا جاتا۔"

ابا نے ایک کتاب لکھنی شروع کی تھی۔ "تمثال الامثال"۔ اس میں محاورے، ضرب الامثال، اور کہاوتیں جمع کرنی شروع کی تھیں۔ اپنے سب جاننے والوں اور خاندان کی پڑھی لکھی عورتوں میں سادی کاپیاں تقسیم کر دی تھیں کہ جو محاورہ یاد آئے اس

میں لکھ لیں۔ جتنی کتابیں مل سکیں خریدیں یا مُستعار لیں۔ یہ کام اتنا پھیلا کہ پرچیاں اور کاغذ کے پُلندے دیکھ کر ہمارا دم نکلتا تھا۔ کوئی مددگار انہوں نے اپنا مقرر نہیں کیا۔ خود ہی سارا کام کرتے۔ تمام شاعروں کے دیوان اور ادیبوں کی کتابیں خود ہی چھانتے رہتے۔ فرہنگِ آصفیہ اور نُوراللغات تو کبھی کی مسودوں میں کھپ چکی تھیں۔ سند کے لئے اشعار بھی چھانٹے جا چکے تھے۔ مگر یہ کتاب تو پھیل کر زبان کی انسائیکلوپیڈیا بنتی جا رہی تھی۔ پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، دوسخنے، سرسخنے، انمل، ڈھکوسلے، اور خدا جانے کیا کیا اس میں شامل کئے جانے لگے۔ شاید ابا بھی اس سے گھبرا گئے تھے، اس لئے انہوں نے جی بہلانے کے لئے شاعری شروع کر دی۔ مگر یہ شاعری تو اُن کے گلے کا ہار ہو گئی۔ ایک ایک دن میں دس دس بیس بیس غزلیں ہونے لگیں۔ پھر انہیں خیال آیا کہ لاؤ کسی اُستاد سے مشورہ بھی کر لیا جائے۔ پہلے اُستاد بیخود سے رجوع کیا۔ تھوڑے دن تو نبھی، اس کے بعد ان سے چخ گئی۔ اُستاد بڑے مُنہ پھٹ اور بدلحاظ آدمی تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ یہ شاگرد تو اصلاح پر حُجّت کرتا ہے، صاف جواب دے دیا کہ آپکو اصلاح کی ضرورت نہیں ہے۔ اُستاد بیخود کے تڑے پن سے بیزار ہو کر نواب سائل سے ناتہ جوڑا۔ اُن سے دوستی پہلے ہی تھی۔ وہاں بھی اصلاح پر اختلاف ہوا۔ نواب کہتے کہ "اس مصرعہ کو یوں کر لو۔" ابا کہتے "نہیں جی، میرا ہی مصرعہ ٹھیک ہے۔" نواب سائل مُدمغ آدمی تھے مگر شائستہ۔ انہوں نے کچھ عُذر معذرت کر کے اپنے اُستاد بھائی نوح ناروی سے اصلاح لینے کا مشورہ دیا۔ نوح صاحب سے میزان پٹ گئی۔ وہ مرنجاں مرنج قسم کے آدمی اور بڑے پُرانے تجربہ کار۔ دو چار ہی خطوں میں جان گئے کہ یہ شاگرد اصلاح سے چڑتا ہے۔ یہاں سے غزلوں کا پُلندا نارہ جاتا اور دو چار مصرعوں کی تبدیلی کے بعد جوں کا توں آجاتا۔ غرض سال ڈیڑھ سال میں مُردّف دیوان تیار ہو گیا اور "دیوانِ بشیر" کے نام سے شائع بھی ہو گیا۔

اسی عرصے میں خیال آیا کہ لاؤ لگے ہاتھوں بادشاہوں کے فرمان ہی جمع کر لیں۔ خبر نہیں کہاں کہاں سے فرمان، ان کی تصویریں اور اُن کی نقلیں منگوائی گئیں۔ انہیں مُرتب کر کے اُن کے ترجمے اور حواشی لکھے۔ ایک سال میں خاصی موٹی کتاب "فرامین سلاطین" شائع ہو گئی۔ پھر لڑکیوں کے لئے "انشائے بشیر" لکھی۔ اس سے پہلے میری بہن کے جہیز میں دینے کے لئے دو حصوں میں "لختِ جگر" لکھی تھی۔ غرض تابڑ توڑ اتنی کتابیں لکھیں کہ اُس زمانے میں سوائے مولوی عبدالحلیم شررؔ کے کسی اور نے اتنی کتابیں نہ لکھی ہوں گی۔

شررؔ کا بھی ایک واقعہ یاد آگیا۔ انہوں نے پردہ کے خلاف ایک ناول "بدر النساء کی مُصیبت" لکھا تھا۔ ابا کو انہوں نے اس کی ایک کاپی بھیجی اور خط لکھا کہ "مولوی صاحب! آپ بھی آج کل کے پردے کے خلاف لکھئے۔ اور میری تائید کیجئے۔" ہر چند کہ ابا کسی قدر آزاد خیال مولوی تھے اور عورتوں کے حقوق اور عورتوں کی حمایت میں بہت کچھ لکھتے رہتے تھے مگر اتنے آزاد خیال بھی نہیں تھے کہ مذہب کے اوامر و نواہی کو بالائے طاق رکھ دیتے۔ ہمارے گھر میں سختی سے پردہ کیا جاتا تھا۔ گھر کی عورتیں کہیں ملنے ملانے یا شادی غمی میں جاتیں تو گھر کی بند گھگی میں یا ڈولی میں۔ اور ڈولی کے پردے پر بھی ایک چادر ڈال دی جاتی۔ بارہ برس سے زیادہ عمر کا لڑکا زنانہ گھر میں مُلازم نہیں رکھا جاتا تھا۔ شررؔ کا خط جب آیا تو ابا خوش مذاقی کے موڈ میں تھے۔ جواب میں لکھا کہ "ایسا کیجئے کہ پہلے آپ اپنی بیوی اور بچیوں کو لا کر میرے سامنے کیجئے پھر میں آپ کی تائید کروں گا۔ کارِ خیر گھر سے شروع ہونا چاہیئے۔" خبر نہیں اس کے بعد کیا گزری۔ شررؔ تو آئے نہیں۔

شاعری اور دوسری کتابوں میں اُلجھ جانے سے یہ ہوا کہ "تمثال الامثال" رہ گئی۔ دراصل یہ کام ایک آدمی کے کرنے کا تھا بھی نہیں۔ اس کے لئے ایک معقول ادارہ کی ضرورت تھی۔ ہاں اگر ابا چار پانچ سال اور جی جاتے تو شاید خود ہی ختم کر لیتے۔

ہم نے تو اس پشتارے کو ایک مضبوط کپڑے میں باندھ کر مچان پر ڈال دیا تھا۔ ہمارے پاکستان چلے آنے کے بعد خدا جانے اس کا کیا حشر ہوا۔ آں دفتر را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب بُرد۔

۱۹۳۶ء میں جاڑوں کے دن تھے۔ ایک صبح جو اُٹھے تو انہیں اپنا دایاں ہاتھ اور پاؤں سُن محسوس ہوا۔ فراش خانہ والے حکیم سراج الدین کا ہمارے ہاں علاج ہوتا تھا۔ حکیم جی کو بُلوایا گیا۔ انہوں نے بتایا کہ فالج کا اثر ہے۔ بہت توجہ سے حکیم جی نے علاج کیا۔ منضج دیئے، ہفت مطبوخ کے جُلاب دیئے۔ پھر تبریدیں پلائیں۔ مگر اثر کم نہ ہوا۔ ابا کہتے تھے کہ موت کا پیام آگیا، اس کا کوئی غم نہیں ہے۔ مرنا برحق ہے غم اس کا ہے کہ میرا پڑھنا لکھنا سب بند ہو گیا۔ کتنے کام ادھورے رہ گئے۔ حکیم سراج الدین کے بعد حکیم بھورے میاں اور حکیم ظفر خاں کا علاج بھی کیا گیا، حالت گرتی ہی گئی۔ بنارس سے ایک وید کو بھی بُلایا تھا۔ اس کے علاج سے بھی افاقہ نہ ہوا۔ دو سال تک یہی کیفیت رہی۔ اللہ کا اتنا کرم ضرور رہا کہ چل پھر لیتے۔ اور اپنے چھوٹے موٹے کام خود کر لیتے۔ آخر آخر میں ڈاکٹر انصاری کو ہم نے بُلوایا۔ اچھے طبیب اور اچھے آدمی تھے ڈاکٹر انصاری۔ ابا کو دیکھ کر رنجیدہ ہوئے۔ ابا سے تو انہوں نے یہی کہا کہ آپ اچھے ہو جائیں گے مگر باہر نکل کر ہم سے کہا کہ اُمید بچنے کی نہیں ہے۔ بھائی نے اُن کی فیس پیش کی تو قبول نہیں کی۔ اور بولے "میرے لئے یہ فخر کیا کم ہے کہ بڑے ڈپٹی صاحب کا علاج بھی میں نے کیا اور چھوٹے ڈپٹی صاحب کا بھی۔" ابا کو جب تک ہوش رہا پلنگ پر نہیں پڑے۔ نماز پابندی سے پڑھتے رہے۔ آخر کے دو تین دن ایسے گزرے کہ بے سُدھ پڑے رہتے۔ کبھی ہوشیار ہوتے تو بولنے کی کوشش کرتے مگر زبان نہیں اُٹھتی تھی۔ غذا بالکل بند ہو گئی تھی۔ تیمار دار خود دُعائیں مانگنے لگے تھے کہ یا اللہ ان کی مُشکل آسان کر۔ اور ایک دن

رات کے دو بجے ہمیں بتایا گیا کہ ابّا جا رہے ہیں۔ ہم سب دوڑ کر ان کے پاس پہونچے۔ سسکیاں آ رہی تھیں۔ عجیب بے کسی کا وقت تھا۔ سب کھڑے تکتے رہے۔ ماموں جان یٰسین سُنا رہے تھے۔ دو تین ہچکیاں آئیں اور گردن کا منکا ڈھلک گیا۔

اور دُنیا ہماری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

مولانا عنایت اللہ

مولانا عنایت اللہ دہلوی ترجمہ کرنے میں غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔ یوں تو اُن کے والد شمس العلماء منشی ذکاء اللہ دہلوی بھی اپنے وقت کے مشہور مُترجم تھے اور انہوں نے بھی بہت ترجمے کئے مگر اُن کے ترجموں میں وہ روانی اور بے ساختگی نہیں ہے جو مولانا عنایت اللہ کے تراجم میں پائی جاتی ہے۔ ان کی اس صلاحیت کا احساس سب سے پہلے سر سید احمد خاں کو ہوا۔ منشی ذکاء اللہ عمر میں سر سید سے بہت چھوٹے تھے۔ مگر انہیں سر سید کے رُفقاء میں سب سے زیادہ قُربت حاصل تھی۔ اسی وجہ سے مولانا عنایت اللہ ایم۔ اے۔ او کالج کے زمانۂ طالب علمی میں سر سید سے بہت قریب رہے۔ بلکہ اُن کے کاموں میں اُن کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ سر سید نے اُن سے آرنلڈ کی کتاب "دی پریچنگز آف اسلام" کا ترجمہ کرایا اور مولانا کا ترجمہ دیکھ کر سر سید پھڑک گئے۔ اپنے کسی خط میں انہوں نے منشی ذکاء اللہ کو لکھا تھا کہ "میاں تم اپنے لڑکے سے ترجمہ کرنا سیکھو۔" مولانا کا یہ ترجمہ اُن کی شُہرت کا سنگِ بُنیاد ہے۔ سر سید کی ہم جلیسی میں اس جوہر قابل پر اور جلا ہوئی اور اس میں وہ چمک دمک پیدا ہوئی جو عمر کے ساتھ بڑھتی گئی۔ اور اُن کا نام نامی رہتی دُنیا تک آفتاب بن کر چمکتا رہے گا۔

مولانا کا نام میں نے پہلی مرتبہ اُس وقت سُنا جب میں کالج میں پڑھتا تھا اور مولانا کا ترجمہ "تائیس" دارالاشاعت لاہور سے شائع ہوا۔ اس کو کم و بیش پچیس سال ہو گئے

ہوں گے۔ اُردو میں "تائیس" پڑھنے میں عجیب لطف آیا۔ یہ کتاب سرے سے ترجمہ ہی معلوم نہیں ہوئی۔ مجھے تو اناطول فرانس کا نام بھی مولانا کی اسی کتاب سے معلوم ہوا تھا۔ مولانا کا ترجمہ پڑھنے کے بعد انگریزی میں THAIS پڑھی۔ مگر وہ لطف نہ آیا جو اردو میں آیا تھا۔ ایک بار پھر اُن کا ترجمہ پڑھا تو یہ محسوس ہوا کہ مولانا کا ترجمہ اصل کتاب سے زیادہ دلکش اور زیادہ مؤثر ہے۔ کہانی کا موضوع اُردو کے مزاج سے زیادہ میل کھاتا تھا۔ مصرِ قدیم کی بازاری حسینہ تائیس کی داستانِ تعیّش اور پھر راہب پفناطوس کا تائیس کا پیچھا لینا، فلسفیوں کی علمی بحثیں، تائیس کا بے پناہ حُسن، راہب کا فریبِ نفس، جس کا حُسن نگاہ بھر کے دیکھنے سے میلا ہوتا ہوئے یسوع کی دلہن بنانے کی کوشش، اس میں کامیابی اور آخر میں پفناطوس کے جلال کا تائیس کے جمال سے شکست کھانا، اور نفس کا روح کے شکنجے کو توڑ کر پفناطوس پر چھا جانا، اُس کی ساری عمر کی ریاضت کا ایک لمحہ میں خاک میں مل جانا اور مردود و ملعون ہو کر خون آشام خفاش بن جانا۔ ایک ایسی داستان ہے جو اُردو کے قالب میں ڈھل کر ایک خاصہ کی چیز بن گئی ہے۔ سر سیّد کے پوتے راس مسعود فرماتے تھے کہ "فرانسیسی میں بھی جس میں کہ اناطول نے یہ ناول لکھا ہے اس کہانی کا وہ لطف نہیں آتا جو اردو میں آتا ہے۔"

میں نے اس کی وجوہ پر غور کیا تو یہی اندازہ کر سکا کہ مولانا اعلیٰ درجے کی ٹکسالی اردو لکھتے تھے اردو زبان و بیان میں محاورے اور روزمرہ کی وہ ساری خوبیاں برقرار رکھتے تھے جو دلّی کے خاص خاص گھرانوں کے لئے مخصوص تھیں۔ ان کے ترجمے میں گنجلک فقرے کہیں نہیں آنے پاتے۔ ان کے ترجمے میں دریا کی سی روانی ہے۔ جب لفظ پر لفظ جماتے ہیں تو گویا انگوٹھی میں نگینہ بٹھاتے ہیں۔ میں نے انہیں ایک ایک لفظ کے لئے دنوں سرگرداں دیکھا ہے۔ اپنے چھوٹوں سے پوچھنے میں انہیں کوئی عار نہ ہوتی تھی۔ لفظوں کے نازک فرق کو اوّل تو خود خوب سمجھتے تھے اور اگر کہیں شبہ ہو جاتا تو دوستوں سے، عورتوں سے یا خط کے ذریعے کسی اہلِ زبان سے پوچھ لیتے تھے۔ اُردو کے بے شمار پرانے لفظ پرا باندھے اُن کے ذہن میں کھڑے رہتے اور وہ انہیں خوب جانچ پرتال کے بعد انتخاب کرتے۔ ایک دفعہ خنگا، خنگر، خنگلا اور دلّی خنگر کے بارے میں مجھے لکھ کر پوچھا اور میں نے دلّی کے بڑے بوڑھوں سے پوچھ کر اُن کو جواب لکھا۔ اس ایک چھوٹی سی مثال سے اُن کی تلاش کا پتہ چلتا ہے اور اس کا کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی بے ساختگی کس قدر خون جلانے کے بعد پیدا ہوتی ہو گی۔

مولانا سے میرا غائبانہ تعارف "تائیس" کے ساتھ ہوا اور جبھی سے اُن سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا مگر یہ آرزو ۱۹۳۲ء تک پوری نہ ہوئی۔ مولانا اس وقت دار الترجمہ حیدرآباد دکن کے ناظم تھے۔ ۱۹۳۰ء میں ساقی جاری ہوا تو ادیبوں اور شاعروں سے رابطہ قائم ہونے لگا۔ ستمبر ۱۹۳۱ء میں ساقی کا "دلّی نمبر" شائع ہوا۔ اس میں صرف دلّی والوں کے مضامینِ نظم و نثر شامل کئے گئے تھے۔ اُس وقت مولانا سے کچھ خط و کتابت ہوئی تھی۔ "ساقی کا" دلّی نمبر "کئی سال تک چھپتا رہا اور اس میں مولانا کا مضمون بھی ہوتا تھا۔ یوں اُن سے نصف ملاقات ہو چکی تھی۔ ۱۹۳۲ء میں میں حیدرآباد گیا تو مولانا سے پہلی دفعہ ملاقات ہوئی۔ شہر کے باہر وہ ایک عالی شان کوٹھی میں رہتے تھے۔ کوٹھی میں نہایت نفیس فرنیچر لگا ہوا تھا۔ اور اس کے سارے کمرے سجے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹے کمرے میں مولانا کی رہائش تھی۔ اسی میں اُن کی مسہری بھی لگی ہوئی تھی۔ چھٹی کا دن تھا، اور مولانا سفید قمیص اور سفید اکہرا پاجامہ پہنے کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سر پہ سُرخ مخمل کی کامدار ٹوپی تھی۔ عمر ساٹھ سے اوپر مگر چہرہ سُرخ و سپید۔ گورا رنگ، کشادہ پیشانی۔ آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک جس میں آنکھیں ہیرے کی طرح چمکتی تھیں۔ پتلی سُتواں ناک۔ موزوں دہانہ۔ اس پر سفید کتروان مونچھیں۔ اکہرا جسم۔ بڑے نازک سے آدمی دکھائی دیتے۔ وزیر حسن صاحب نے میرا تعارف کرایا تو بڑی محبت سے ملے۔ نیچی اور ہلکی آواز میں بولتے رہے۔ اسی زمانے میں انہیں اُن کی ایک کتاب "جغرافیۂ اندلس" پر حکومت دکن نے غالباً دس ہزار روپے انعام یا معاوضہ کے دیئے تھے۔ فرماتے تھے کہ "میں نے اس کتاب پر اپنی ساری عمر صرف کی ہے اور ایک ایک شہر اور مقام کا پُرانا نام معلوم کرنے کے لئے بیسیوں کتابیں دیکھی ہیں۔

پھر اس کتاب کو کئی کئی بار خوشخط لکھوایا۔ جتنا انعام ملا ہے اس سے زیادہ اس پر میرا روپیہ خرچ ہو چکا ہے۔ چلئے یہی کیا کم ہے کہ میری محنت ٹھکانے لگی اور کتاب چھپنے کی نوبت تو آئی۔" وہ کتاب مولانا نے اپنی باقی تمام کتابوں کے ساتھ مجھے تحفتہً بعد میں دی تھی۔ مجھے اُس کے پڑھنے کا تو بھلا دماغ کہاں تھا، البتہ اُسے جستہ جستہ میں نے دیکھا تھا۔ مولانا نے اس میں بڑی جانکاہی کی تھی۔ واقعی ایسے کام کیلئے ایک عمر تو درکار ہوتی ہی ہے، کام کرنیکا عشق بھی درکار ہوتا ہے۔

تائیس کے ترجمے کا بھی اسی ملاقات میں ذکر ہوا۔ اپنی تعریف سُنکر خوش ہوئے مگر اناطول ہی کی تعریف کرتے رہے کہ کس غضب کا لکھنے والا ہے۔ کہتے تھے کہ اُس کی اور کوئی کتاب اس پایہ کی نہیں ہے۔ تراجم کے سلسلے میں انہوں نے اپنا ایک اور ترجمہ دکھایا۔ یہ فلسکیپ سائز کے کوئی پانسو صفحے کا ٹائپ کیا ہوا مسودہ تھا۔ مولانا نے کہا "یہ رائیڈر ہیگرڈ کی کتاب "دی مارننگ اسٹار" کا ترجمہ "نجم السحر" ہے۔ اس کی کہانی مجھے تائیس سے زیادہ پسند ہے۔ اس میں بھی مصر کی قدیم تہذیب پیش کی گئی ہے۔ فراعنہ کے زمانے کی۔" معلوم ہوا کہ یہ کتاب مسودے کی صورت میں اسلئے رکھی ہوئی ہے کہ اس کے لئے چھاپنے والا کوئی موزوں ادارہ نہیں ملتا۔ اور مولانا خود چھپوانے کے جھکنڈوں میں پڑنا نہیں چاہتے۔ میں نے اُن سے کہا "میں اسے ساقی بک ڈپو سے شائع کر دوں گا۔" مولانا نے تعجب و مسرت سے میری طرف دیکھا اور بولے "اس پر کیا لاگت آئے گی؟" میں نے کہا "پانچ چھ سو روپے۔" کہنے لگے "میرے پاس تو اس وقت اتنا روپیہ نہیں ہے۔" میں نے کہا "روپیہ تو میں لگاؤں گا۔ آپ یہ بتا دیجئے کہ رائلٹی آپ کیا لیں گے؟" انہوں نے پھر استعجاب سے دیکھا اور بولے "روپیہ بھی آپ لگائینگے اور رائلٹی بھی دینگے! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ بس یہ کتاب چھپ جائے۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے، اور نہ میں نے اب تک کسی سے کچھ لیا اور نہ کسی نے مجھے کچھ دیا۔" اسکے بعد مجھے یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ ہمارے دو نہایت ذمہ دار اداروں نے مولانا سے روپیہ لیکر

اُن کی کتابیں چھاپیں اور انہیں رائلٹی دینا تو کیسا اصل رقم بھی واپس نہیں دی۔ اور ایک صاحب نے تو انہیں اسامی ہی بنا رکھا تھا کہ مولانا سے کتاب بھی لے جاتے اور روپیہ بھی۔ اور دو چار سو روپیہ واپس دینے کے بعد نقصان کی بشارت دے کر روپیہ معاف کرا لیتے۔ خیر تو "نجم السحر" کا مسودہ میں ان سے لے آیا۔ اس کے چند باب پہلے ساقی میں چھپے اور پھر پوری کتاب چھپی۔ مولانا بہت خوش ہوئے کہ اُن کی محنت ٹھکانے لگی۔

اُسی دن کی ملاقات کا ایک لطیف واقعہ بھی سُن لیجئے۔ مولانا کچھ بے چین دکھائی دیتے تھے۔ حکومت کی بدنظمی کا کچھ تذکرہ ہوا تو فرمایا کہ یہاں تو پارٹی بندیاں رہتی ہیں۔ آج اُس پارٹی کا زور ہے، کل اُس پارٹی کا۔ رعایا میں لوٹ کھسوٹ مچی ہوئی ہے۔ خود اعلیٰ حضرت کو روپیہ جمع کرنے کا ہوکا ہو گیا ہے۔ دورے کرتے ہیں، پائیگاہوں اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں سے چھکڑے بھر بھر کے سونا چاندی لاتے ہیں۔ رئیسوں میں مسابقت ہو رہی ہے۔ ایک کہتا ہے کہ اگر اعلیٰحضرت یہاں تشریف لائیں تو دس لاکھ کی نذر گزاروں گا۔ دوسرا کہتا ہے میرے یہاں تشریف لائینگے تو میں گیارہ لاکھ پیش کروں گا۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت پہلے دس لاکھ والے سے دس لاکھ وصول کرتے ہیں اور پھر گیارہ لاکھ والے سے گیارہ لاکھ۔ اس طرح گویا دونوں کو خوش کر دیتے ہیں۔ یہ روپیہ کیسے جمع کیا جاتا ہے؟ رئیس اپنے تعلقداروں سے کہتا ہے کہ دس لاکھ روپیہ جمع کرو۔ تعلقدار تحصیلداروں سے کہتے ہیں، تحصیلدار پٹواریوں سے کہتے ہیں اور پٹواری رعایا کی کھال اُدھیڑتے ہیں۔ پندرہ سولہ لاکھ روپیہ نیچے سے جمع کیا جاتا ہے اور اپنا اپنا حق رکھ کر اُوپر پہنچا دیا جاتا ہے۔ پانچ چھ لاکھ روپیہ کٹوتیوں میں غائب ہو جاتا ہے۔ باقی دس لاکھ اعلیٰ حضرت کی بھینٹ چڑھ جاتا۔ رعایا "گھگھو ہوتی" چلی جا رہی ہے اور اعلیٰ حضرت کے خزانے اَٹتے چلے جاتے ہیں۔ ایک خزانہ بھر جاتا ہے تو اُس کے مُنہ پر تیغہ کرا دیا جاتا ہے اور خزانے میں بجلی کی رَو چھوڑ دی جاتی ہے۔ جن لوگوں نے ان خزانوں کو بچشم خود دیکھا ہے اُن کا بیان ہے کہ جن گاڑیوں میں روپے اور اشرفیوں کے توڑے لاد کر لائے جاتے اُن پر سے انہیں اتارنے کی زحمت بھی نہیں

کی جاتی۔ گاڑیاں یوں کی یونہی گردوں میں کھڑی کردی جاتیں۔ انہی دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ بوجھ سے گاڑیوں کے پہیے زمین میں دھنس گئے تھے۔ اعلیٰ حضرت کی یہ زراندوزی دیوانگی کی حد کو پہونچ گئی تھی۔ اس میں انہیں بُرے بھلے کی تمیز نہیں رہی تھی۔ انہیں روپیہ ملنا چاہئے تھا۔ کسی طرح بھی ہو۔ رئیسوں اور اُمراء کی شادی شد میں اُس وقت شریک ہوتے جب پہلے نذر کھول لیتے کہ کتنا روپیہ ملے گا۔ بیٹے والے سے الگ لیتے اور بیٹی والے سے الگ لیتے۔ اس طرح دونوں گھروں کو شاد و آباد کرتے۔ اس جنون کی آخر یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ اگر کوئی غریب کوئی تحفہ یا نادر چیز اس اُمید پر بارگاہِ خسروی میں پیش کرتا کہ اُسے مالی منفعت ہو تو اُسے اُلٹے لینے کے دینے پڑجاتے۔ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ ایک شخص اپنے باغ سے پانسو عمدہ آم اپنے بادشاہ کے لئے لایا۔ بادشاہ انہیں دیکھ کر باغ باغ ہوگیا۔ آموں کی بہت تعریف کی۔ پوچھا "کہاں سے لائے، کس باغ سے لائے۔ ان کی قیمت کیا ہے؟" لانے والے نے کہا "خداوند! اِن کی قیمت کیا؟ نذر قبول ہوجائے بس۔" ارشاد ہوا "نہیں نہیں، پھر بھی کتنے کے ہوں گے یہ آم؟" غریب نے سوچا کہ قسمت نے یاوری کی، نصیب کھلنے کا وقت آپہنچا۔ بولا "سرکار! ہے کوئی پانچ پانچ روپے کا ایک۔" فرمایا: "ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ بہت عمدہ آم ہے۔ ضرور ہوگا پانچ پانچ روپے کا۔ مگر میں کہاں کھاسکتا ہوں اتنے آم! لے جاؤ تم ہی انہیں۔ مجھے تو ان کا روپیہ بھیج دے بس۔" لو صاحب! حکمِ حاکم، مرگِ مفاجات۔ پران ڈھیلے ہوگئے۔ ڈھائی ہزار روپیہ شاہی خزانے میں قرض دام کرکے بھرا اور اپنے نصیبوں کو کوستا، روتا پیٹتا، گھر واپس آیا۔

بازاروں میں سودا بیچنے والوں نے بیٹھنا چھوڑ دیا تھا کہ اعلیٰ حضرت من مانی قیمت پر ضرورت کی چیزیں خرید لیتے تھے۔ جس دُکان یا بزاز خانے میں گھستے تہلکہ مچ جاتا۔ ہزار روپے کی چیز دس روپے میں لے جاتے اور اُن دس روپوؤں کو بھی دُکاندار جھینکتا پھرتا۔ نیلام میں سب سے پہلے بولی سرکار خود لگادیتے۔ کس کی ماں نے دھونسا کھایا ہے کہ بڑھ کر بولی

لگائے؟ زن بچہ کو لہو پلوا دیا جاتا۔ غرض جہاں جاتے اُلٹا پڑ جاتا۔

اعلیٰ حضرت نے اُس زمانے میں تحفگی بھی کر رکھی تھی کہ جس کسی کے ہاں سے کوئی تحفہ آتا اُس کو کئی حصوں میں بانٹ کر عہدہ داروں کو بھیج دیتے اور عہدہ داروں کا فرض ہو جاتا کہ اگلے دن ڈیوڑھی مبارک پر حاضر ہوں اور باریاب ہو کر سرفرازی کی نذر گزرانیں۔ جتنے تحفے حضور کے پاس آتے سب کا یہی حشر ہوتا۔ کسی جنگ دول نے اپنے باغ کے آم سرکار کو بھیج دیئے تھے۔ اور سرکار نے پانچ پانچ دانوں کا تورہ بنا کر اُمرا اور عہدہ داروں میں تقسیم کرادیا تھا۔ مولانا کی بے چینی کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ عمر میں پہلی مرتبہ انہیں یہ سعادت آج صبح نصیب ہوئی تھی کہ چار شاہی خاصہ دار اور ایک عصابردار ٹیکسی میں تورۂ عثمانی لے کر نازل ہوئے۔ مولانا سیدھے سادے آدمی تھے۔ ان کی آمد کی اطلاع سے گھبرا گئے۔ انہیں فوراً اندر بلوایا۔ تعظیم و تکریم سے پانچ پانچ روپے ہر ایک کی خدمت میں پیش کئے۔ کپکپاتے ہاتھوں سے پانچ ثمرِ بہشت عطیۂ عثمانی کے لئے ٹیکسی کا کرایہ دے کر خاصہ داران عثمانی کو رخصت کیا۔ صبح یہ حادثہ پیش آچکا تھا۔ اور مولانا سوچ سوچ کر پریشان ہو رہے تھے کہ دیکھئے کل کیا گزرتی ہے۔ فرمانے لگے کہ "میں اعلیٰ حضرت کی پیشی میں پہلے کبھی نہیں گیا۔ سُنا ہے کہ وہاں بڑی بے عزتی ہوتی ہے۔ بارگاہ میں داخل ہونے سے پہلے تین جگہ رُک رُک کر سات سات فرشی سلام کرنے پڑتے ہیں۔ نظر اُونچی کرنا یا اعلیٰ حضرت کو دیکھنا سوءِ ادب ہے۔ اندھے بھینسے کی طرح آگے بڑھ کر ایک اشرفی اور پانچ روپے زرد ریشمی رومال پر رکھ کر نذر گزرانی جاتی ہے۔ رُکنے کا کام نہیں، بات کا نام نہیں، ذرا ٹھٹکے کہ چوبدار وہ گردنی دیتا ہے کہ نذر گزار بارگاہ کے باہر اپنے آپ کو پاتا ہے۔" ہم نے مولانا کو دلاسا دیا اور جھوٹا یقین دلایا کہ آپ کے ساتھ ایسا غیر انسانی سلوک نہیں کیا جائیگا۔ مگر مولانا بے چین اور پریشان ہی رہے۔

مولانا کے بارے میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ انہوں نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ اُن کی

زندگی پرانے فلسفیوں کی سی زندگی تھی۔ اُن کا سارا وقت پڑھنے لکھنے ہی میں گزرتا تھا۔ لیکن جس کوٹھی میں میں گیا تھا اُس میں عورتیں بھی تھیں اور دو تین نوجوان بھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مولانا کے ایک دوست تھے جو چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر جوانی ہی میں انتقال کر گئے۔ مولانا اُن کی بیوہ اور بچوں کی کفالت کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ وہ خاتون مع بچوں کے مولانا کے گھر ہی میں آ کر رہنے لگیں اور پھر گھر کا سارا انتظام بھی انہوں نے اپنے ذمّہ لے لیا۔ اس سلسلے میں طرح طرح کی روایات مولانا سے وابستہ ہو گئی تھیں۔ لیکن میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مولانا گنہگار تو کیسے تصوروار بھی نہیں تھے۔ میں نے اُن خاتون کو مولانا کے آخری وقت تک اُن کے گھر میں دیکھا۔ مولانا اُن سے بالکل بے نیاز رہتے تھے مگر خُلق و مروّت سے اتنے مجبور تھے کہ ساری عمر انہیں اپنے گھر میں رہنے دیا اور اُن کا پورا خرچ اُٹھایا۔ یکجائی کے باوجود علیحدہ ہی رہے۔

حیدرآباد کی اس مُلاقات کے کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ مولانا ناظم دارالترجمہ کے عہدے سے مُستعفی ہو کر چلے آئے ہیں۔ میں اُن سے ملنے اُن کے آبائی گھر گیا۔ یہ گھر کوچہ چیلان میں اب بھی ہے۔ مولانا ایک بڑے کمرے میں بیٹھے کتاب پڑھ رہے تھے۔ اُن سے بہت باتیں ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ ریاستی سازشوں کی وجہ سے انہوں نے ملازمت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ کئی ہزار روپیہ وہاں سے یکمشت ملنے والا تھا، اس کے ملنے کا بھی انتظار نہیں کیا۔ سخت دل برداشتہ اور مُتنفّر ہو کر وہاں سے آ گئے تھے۔ گھر کا سارا سامان نیلام گھر میں ڈلوا دیا تھا۔

میں نے پوچھا "آئندہ تو دلّی ہی میں رہنے کا ارادہ ہے نا؟" بولے "نہیں دہرہ دُون میں۔ میاں رضا اللہ (چھوٹے بھائی) نے بھی وہاں ایک کوٹھی لے رکھی ہے۔ انہوں نے وہاں میرے لئے قریب ہی ایک اور کوٹھی خرید لی ہے۔ دہرہ دُون کی آب و ہوا مجھے پسند ہے اور یوں بھی جتنے بڈھے ریٹائرڈ لائف گزارتے ہیں دہرہ دُون ہی جاتے ہیں۔"

مولانا کی اور باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ دلّی سے بیزار ہیں اور بیزار انہیں ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ وہ بڑی بڑی کُشادہ کوٹھیوں میں رہنے کے عادی ہو چکے تھے۔ دلّی کی تنگ گلیاں اور گندے محلّے اور اُن کا شور مولانا برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کا آبائی گھر بہت بڑا اور کھُلا تھا مگر اُس میں وہ نہیں رہ سکے۔ اس کے بعد ایک بار پھر دلّی آئے تو قطب صاحب (مہرولی) میں ڈپٹی فضل اللہ صاحب کی کوٹھی میں ٹھہرے۔

دہرہ دُون میں اُنہیں کام کرنے کی بہت فرصت ملی۔ DANTE کی "طربیہ خداوندی" میں نے مولانا کو بھیجی۔ مولانا نے اُس کے ایک حصّے INFERNO کا ترجمہ "دانتے کا جہنم" کے نام سے کیا۔ یہ پورا ترجمہ ساقی کے ایک خاص نمبر کی صورت میں چھپا۔ یہ ترجمہ بہت دماغ سوزی چاہتا تھا اور مولانا اپنے کچھ اور ترجمے بھی مکمل کرنا چاہتے تھے، اس لئے "اعراف" اور "جنّت" کے ترجمے کرنے کی مُہلت نہیں ملی۔ میں مولانا سے ملٹن کی "فردوسِ گم گشتہ" کا ترجمہ بھی کرانا چاہتا تھا اور وہ اس کے لئے آمادہ بھی ہو گئے تھے لیکن اُن کی ضعیفی اور بیماری مانع ہوئی۔ فلابیر کے ایک طویل افسانے "ہیرودیاس" کا ترجمہ ساقی کے ایک خاص نمبر کے لئے کیا۔ اُسی زمانے میں ڈوزی کی تاریخ کا ترجمہ دو ضخیم جلدوں میں انہوں نے کیا تھا۔ اسے اُنکے ایک پُرانے دوست مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی نے مولانا ہی کی لاگت سے شائع کیا۔ آخر دم تک اُن کے ہاتھ سے قلم نہیں چھوٹا۔ گھنٹوں بیٹھے ترجمہ کرتے رہتے تھے۔

مولانا مجھ پر بزرگانہ شفقت فرماتے تھے۔ اُنہیں غالباً زندگی میں بڑی مایوسیاں ہوئی تھیں اس لئے آدم بیزار سے ہو گئے تھے۔ وہ بے لوث ملتے تھے اور چاہتے تھے کہ لوگ بھی اُن سے بے غرض ملیں لیکن کسے ضرورت پڑی ہے کہ بے مطلب دوسروں سے ملتا پھرے۔ میرا بھی اُن سے ملنا خود غرضی ہی پر مبنی تھا کہ میں اُن سے ساقی کے لئے مضامین لکھواتا اور اُن سے کتابوں کے تراجم کراتا۔ لیکن مولانا اس قدر خلوص سے ملتے کہ کیا کوئی اپنا بھی ملے گا۔ بعد میں حُسنِ اتفاق سے وہ کچھ اپنے بھی ہو گئے تھے۔ اُن کے سب سے

چھوٹے بھائی فرحت اللہ کی صاحب زادی سے میرے بھائی کی شادی ہوئی۔ مولانا اس شادی میں شریک ہونے دہرہ دُون سے آئے تھے۔ نکاح ڈپٹی فدا اللہ صاحب کی حویلی میں پڑھایا گیا۔ مولانا برات میں ملے تو بہت خوش تھے کہ یہ رشتہ ہو گیا۔ فرماتے تھے کہ اس سے دو شمس العلماؤں کے خاندان مل گئے۔ ڈپٹی نذیر احمد اور منشی ذکاء اللہ میں بڑی دوستی تھی۔ دونوں نے ایک ساتھ دلّی کالج میں پڑھا تھا۔ دونوں ہم عمر تھے اور دونوں کی وفات میں بھی کچھ زیادہ وقفہ نہ رہا۔

۴۷ء کے بعد مجھے اکثر گرمیاں دہرہ دُون اور مسوری گزارنے کا موقع ملا۔ ڈالن والا میں مولانا کی کوٹھی میرے مکان کے قریب ہی تھی۔ اس لئے اُن سے روزانہ گھنٹوں ملاقات رہتی۔ وہ صبح بہت سویرے اُٹھ جاتے اور کام کرنے بیٹھ جاتے۔ اُنہیں ترجمہ کرنے کی عادت ہو گئی تھی۔ بلکہ ترجمہ کرنے سے محبت ہو گئی تھی۔ نام یاد نہیں آرہا کسی فرنگی نے مغلوں کی تاریخ چار ضخیم جلدوں میں لکھی تھی۔ انگریزی میں بھی اس کتاب کا محدود ایڈیشن شائع ہوا تھا اور دوبارہ اُس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ مولانا سالہا سال سے اُس کا ترجمہ کر رہے تھے۔ ہزار ہزار صفحے کی تین کاپیوں میں ترجمہ کر کے مولانا نے مسودے کی جلد بندی کرا دی تھی۔ چوتھی جلد کا ترجمہ جب بھی وقت ملتا، کرتے رہتے تھے۔ مولانا کی یہ بڑی آرزو تھی کہ اس کا ترجمہ مکمل ہو جائے۔ فرماتے تھے کہ "دیکھئے ترجمہ پہلے ختم ہوتا ہے یا زندگی۔" مولانا اُس وقت ستّر سے اُوپر ہو چکے تھے اور اُن کے قوا خاصے مضمحل ہو گئے تھے۔ میں نے ان سے کہا "مولانا اِسے کون چھاپے گا؟ آپکی یہ محنت تو بیکار ہی جاتی دکھائی دیتی ہے۔" مولانا نے فرمایا "اس کے چھپنے کی نوبت تو کبھی نہیں آئے گی لیکن اگر مکمل ہو جائے تو مسودے کی جلد بندھوا کر علی گڑھ یونی ورسٹی کو دے دوں گا کہ اپنی لائبریری میں رکھ لے۔" وہ ترجمہ جلد ہی ختم ہو جاتا لیکن مولانا اس کے ساتھ ساتھ دوسری کتابوں کے تراجم بھی کرتے رہے۔ میری

فرمائش پر انہوں نے فلابیر کے تاریخی ناول "سلامبو" کا ترجمہ دو جلدوں میں کیا۔ ڈاکٹر جانسن کی "رسیلاس" کا ترجمہ کیا اور پھر اپنے ہی ذوق سے شیکسپیر کے ڈراموں کے ترجمے کرنے لگے۔ بارہ چودہ مشہور ڈراموں کا اُنہوں نے ترجمہ کر دیا جو ساقی کے خاص نمبروں میں ایک ایک کر کے چھپتے رہے۔ مُشکل سے مشکل کتاب کا ترجمہ کرنے کی صلاحیت میں نے مولانا کے علاوہ اور کسی میں نہیں دیکھی۔

دہرہ دُون میں میں نے مولانا کو کبھی بیکار بیٹھے نہیں دیکھا۔ وہ یا تو لکھتے رہتے تھے یا کوئی کتاب پڑھتے رہتے۔ شام کو کبھی کبھی تھوڑی دُور کا چکر اپنی کار میں لگاتے۔ اُن کے زیادہ دوست بھی نہیں تھے۔ اُن کے پاس دلچسپی کا کوئی سامان بھی نہیں تھا کہ لوگ اُن کے پاس آتے۔ بات بھی وہ کم ہی کرتے تھے اس لئے ڈالن والا کے پڑوسی تک اُن کے ہاں نہیں آتے تھے۔ بڑی سی ڈھنڈار کوٹھی تھی جس میں مولانا اکیلے رہتے تھے۔ اکثر وہ خاتون بھی آ کر رہتی تھیں جو دوست کی بیوہ تھیں۔ ایک برآمدے میں بڑا سا پنجرہ تھا جس میں رنگ برنگ چھوٹے چھوٹے طوطے تھے۔ کوٹھی کے سامنے پائیں باغ تھا جسے مالی بناتا سنوارتا رہتا تھا۔ مولانا کرسیاں بچھوا کر اس میں بھی بیٹھتے تھے۔ پُرانی پُرانی باتیں سُناتے رہتے۔ میں نے اُن سے بارہا کہا کہ آپ جو باتیں سُناتے ہیں اُنہیں لکھ دیجئے۔ انہوں نے لکھنے کی کوشش بھی کی مگر اُنکا جی نہیں لگا، اور وہ نہیں لکھ سکے۔ یہ ایک بہت بڑا خزینہ تھا جو اُن کے سینے کا دفینہ بن گیا۔

آخری بار جب اُن سے دہرہ دُون میں ملاقات ہوئی تو وہ بہت بیمار تھے۔ کھانسی اور سانس کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔ اس کے علاوہ مثانے کے غدود کی تکلیف بڑھ رہی تھی۔ اکثر لیٹے رہتے تھے۔ میں ملنے گیا تو اطلاع پاتے ہی باہر آ گئے اور ناقابلِ برداشت تکلیف کے باوجود دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر اُن سے ملنا نہیں گیا اور بڑے

دل شکستہ ہو کر رخصت ہوئے۔ یہ اُن سے میری آخری ملاقات تھی۔

دہرہ دُون کے اگلے پھیرے میں معلوم ہوا کہ مولانا دلّی گئے ہوئے ہیں۔ آپریشن کرانے کی ضرورت تھی مگر اُن میں اس کا دم نہ تھا۔ دہرہ دُون واپس آ کر موت کا انتظار کرنے لگے۔

ایک دن پائیں باغ میں آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کھانسی اٹھی اور طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی۔ بہت دیر بعد بوڑھا مالی اُدھر آیا تو مولانا کے ڈھلکے ہوئے سر کو دیکھ کر ٹھٹکا۔ قریب جا کر دیکھا تو مولانا ابدی نیند سو رہے تھے۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی

اللہ بخشے مرزا عظیم بیگ چغتائی بھی عجب خوبیوں کے آدمی تھے۔ سدا کے مرجیوڑے۔ پیدا ہوئے تو اتنے نحیف و کمزور کہ رُوئی کے پہلوں پر رکھے گئے۔ بڑے ہوئے تو روگی مرجبین۔ اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ موجود تھا۔ ددھیال بھی جاندار تھی اور ننھیال بھی ساد تی۔ ان کے والد قسیم بیگ چغتائی یو۔ پی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ آبائی وطن آگرہ تھا۔ یہیں ان کی جدّی جائداد بھی تھی۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی کے نانا منشی اُمراؤ علی تھے۔ جو اب سے نصف صدی پہلے کے مشہور ناول نگار تھے۔ ان کی تصانیف "رزم بزم" اور "البرٹ بل" ایک زمانے میں بہت مقبول تھیں۔ مرزا صاحب کے والد بڑے ٹھاٹ کے آدمی تھے۔ سر سیّد کی آنکھیں دیکھے ہوئے علی گڑھ کے ابتدائی گریجوئیٹس میں سے تھے۔ اپنے زمانے کے اچھے کھلاڑیوں میں شمار ہوتے تھے۔ ورزش کا بھی شوق تھا۔ سواری کے لئے مُنہ زور سے مُنہ زور گھوڑے تلاش کر کے رکھتے تھے۔ بڑے طاقتور آدمی تھے۔ ایک بلّی نے گھر والوں کو بہت عاجز کر رکھا تھا۔ ایک دن وہ ان کے ہاتھ آ گئی۔ ہاتھ اس کی کمر پر پڑا۔ چاہتے تھے کہ اسے گھر سے باہر اُچھال دیں مگر وہ کم بخت کلائی میں لپٹ گئی۔ انہیں بھی تاؤ آ گیا۔ اسنے اپنے پنجوں اور دانتوں سے اُن کی کلائی ادھیڑ دی مگر انہوں نے بھی اپنے پنجے کی گرفت اتنی سخت کی کہ اس کی ہڈی پسلی ایک ہو گئی اور اسے اُس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک اُس کا دم نہ نکل گیا۔ ویسے وہ بڑے

خوش مزاج آدمی تھے اور چھوٹے بڑے سب سے اچھی طرح پیش آتے تھے۔

چغتائی صاحب چونکہ پیدائشی کمزور رہے تھے اس لئے اور بچوں کے مقابلے میں ان کی طرف والدین کی توجہ زیادہ رہتی تھی۔ لاڈ پیار میں پلے۔ کچھ گھر پر پڑھا، کچھ اٹاوہ کے اسکول میں۔ اس کے بعد علی گڑھ سے بی۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی کے امتحانات پاس کئے۔ کالج ہی کے زمانے میں نواب مزمل اللہ خاں کے ہاں ملازمت بھی کرلی تھی۔ کیونکہ شادی ہوگئی تھی اور اخراجات پورے نہ ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں مضمون نگاری بھی شروع کردی تھی۔ بلکہ بچوں کی کہانی "قعرِ صحرا" کا پہلا حصہ میٹرک پاس کرنے سے پہلے ہی لکھ چکے تھے۔ اس کے باقی دو حصے بعد میں لکھے۔ محنتی اور ذہین بہت تھے۔ جسمانی کمزوری کی تلافی دماغی قوت سے ہوگئی تھی۔ کالج کے زمانے میں اسلامی تاریخ کے سلسلے میں مذہب کا بھی مطالعہ کر ڈالا۔ اور حدیث و فقہ سب چاٹ گئے۔ علی گڑھ والوں کی طرح یہ بھی آزاد خیالی اور مغربیت کے دلدادہ تھے۔ قدامت پسندوں اور مذہبی خیال والوں سے ان کے مباحثے رہنے لگے۔ انہیں اس میں بھی مزہ آتا تھا کہ دوسروں کو چھیڑیں، ستائیں، جلائیں۔ حدیثیں ازبر تھیں۔ مستند کتابوں کے حوالے یاد تھے۔ بڑے دھڑلے سے قائل کردیتے تھے۔ اس کے بعد یہ نوبت آگئی کہ شرط لگاکر بحث کرتے تھے۔ مثلاً کسی مولانا قسم کے آدمی سے ڈاڑھی رکھنے نہ رکھنے پر بحث ٹھنتی تو شرط لگاتے کہ "اگر تم جیت گئے تو ہم ڈاڑھی رکھ لیں گے اور اگر ہم جیت گئے تو تمہاری ڈاڑھی مونڈ لیں گے۔" بہت سے تو شرط کی نوعیت ہی سے گھبرا کر بھاگ جاتے اور اگر کوئی ہمت کرکے جم گیا تو سمجھو کہ اس کی شامت آگئی۔ سب لڑکوں کو نیوتا دے دیا جاتا۔ شام کو ایک جمِ غفیر کی موجودگی میں بحث شروع ہوتی۔ کتابیں کھولی جاتیں، دلیل کی تصدیق یا تردید کی جاتی۔ آخر میں نہ جانے کیا ہوتا کہ چغتائی ہی ہمیشہ جیت جاتے۔ پھر کسی منچلے کے ہاں سے شیو کا سامان منگایا جاتا اور نہایت احتیاط

ڈاڑھی مونڈ کر محفوظ کرلی جاتی۔ اس طرح انہوں نے کئی ڈاڑھیاں جیتی تھیں۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ جیتی ہوئی ڈاڑھی بیچ دی جاتی تھی۔ وہ اس طرح کہ ہارے ہوئے مولانا سے اس کی مناسب قیمت لے لی جاتی اور اُن کی ڈاڑھی بخش دی جاتی۔ اس "قصاص" سے یار لوگ مٹھائی منگاتے اور سب کو شیرینی تقسیم کی جاتی۔ ایسے ہی ایک مُباحثے میں چغتائی صاحب ایک دفعہ ہار گئے۔ انہیں ڈاڑھی رکھنی پڑی۔ اس وقت کی ایک تصویر بھی تھی جسے میں نے "کامران" کے سرورق پر چھاپا تھا۔ خدا جانے پھر کیا کفارہ ادا کرکے اس سے نجات پائی۔

چغتائی صاحب کی شادی رام پور کے ایک پٹھان گھرانے میں ہوئی تھی جو مذہب کا بڑی سختی سے پابند تھا۔ چغتائی صاحب نے شادی کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ بیوی کا بُرقعہ اُتروادیا اور انہیں اپنے ساتھ کھلے بندوں لانا لے جانا شروع کردیا۔ اسی دھج سے انہیں اپنی سُسرال رام پور بھی لے کر پہنچے تو وہ لوگ بہت بگڑے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اُن کی اور سُسرال والوں کی تناتنی ہوگئی۔ مصیبت بے چاری بیگم چغتائی کی! باپ بھائیوں کو یہ زعم کہ ہماری لڑکی بھلا ہمارے کہنے سے باہر کیسے ہوسکتی ہے۔ اِدھر بگڑے دل مرزا کہ چاہے جان چلی جائے آن نہ جانے پائے۔ اَڑ گئے کہ صاحب وہی ہوگا جو ہم کہتے ہیں۔ سر پھرے پٹھانوں نے کہا۔ ایسا ہرگز ہو ہی نہیں سکتا۔ کُنبے برادری کے سب بڑے بُوڑھے جمع ہوئے۔ صلاح ہوئی کہ لڑکی کو گھر بٹھا لیا جائے اور داماد صاحب کو بیک بینی و دو گوش روانہ کردیا جائے۔ چنانچہ مرزا صاحب سے کہہ دیا گیا کہ ٹھنڈے ٹھنڈے چلتے پھرتے نظر آئیے۔ مرزا کھول گئے مگر کیا کرتے۔ بولے "میری بیوی سے اور پوچھ لیجئے۔ اگر وہ بھی یہاں رہنا چاہتی ہیں تو خوشی سے رہیں میں چلا جاؤں گا، اور اگر وہ میرے ساتھ چلنا چاہتی ہیں تو آپ تو آپ دُنیا کی کوئی طاقت انہیں نہیں روک سکتی۔" بات معقول تھی۔ سمجھ میں آگئی۔ لڑکی سے پوچھا

تو وہ نیک بخت چادر اوڑھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس غریب کو تو مرنا بھرنا تھا۔ ماں باپ کے پکھوے سے لگی کب تک بیٹھی رہتی؛ گھر والوں نے کہا: ”بی بی! ہماری بات نیچی کر کے جا رہی ہو تو پھر کبھی اس دہلیز پر نہ آنا۔ آج سے تم ہمارے لئے اور ہم تمہارے لئے مر گئے۔“ وہ بچاری دھاروں روتی میاں کے ساتھ ہو لی اور مدتوں میکے نہ گئی۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد چغتائی صاحب نے کتاب ”قرآن اور پردہ“ لکھی پھر چند سال بعد ”حدیث اور پردہ“ اور اسکے کچھ عرصہ بعد ”رقص و سرود“۔ اسی عرصے میں کچھ لوگوں کے سمجھانے اور کچھ اپنے تلخ تجربات کی وجہ سے انہوں نے مذہب کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر ادب کی طرف کر لی اور ۱۹۲۶ء سے ان کے ادبی مضامین اور افسانے شائع ہونے لگے۔

جنوری ۳۶ء میں ان کا افسانہ ”انگوٹھی کی مصیبت“ نیرنگِ خیال کے سالنامہ میں شائع ہوا۔ اس افسانے کے چھپتے ہی ہمارے ادبی حلقوں میں ایک بھونچال سا آگیا۔ جس کو دیکھو اس کی زبان پر اسی کا ذکر۔ بعد میں چغتائی صاحب نے وہ بے شمار خطوط مجھے دکھائے جو اس افسانے کے بارے میں ان کے پاس آئے تھے۔ بیشتر خطوط توصیفی تھے لیکن بعض خطوط میں نفسیاتی کیفیات کی روشنی میں افسانے کے بعض مقامات کی توضیح چاہی تھی۔ بعض میں شعور اور لاشعور کی بحث کی گئی تھی۔ ایک خاتون نے پوچھا کہ ہیرو جب ہیروئن سے پوچھتا ہے ”بھولو گی تو نہیں..... بھولو گی تو نہیں..... بھولو گی تو نہیں.....؟“ تو اس میں جو وقفے ہیں کیا آپ بتائیں گے کہ یہ لذتِ التشام سے مغلوب ہونے کے ہیں؟ چغتائی صاحب بولے: ”ہمیں آج تک یہی معلوم نہیں کہ لذتِ التشام کیا ہوتی ہے۔“ چنانچہ ہم دونوں نے لغت میں اس کے معنی دیکھے اور چغتائی صاحب ہنسے کہ میرے تو وہم میں بھی یہ بات نہ آئی تھی۔ لوگ بھی کیسی کیسی توضیحیں کر لیتے ہیں۔

اس افسانے کے بعد چغتائی صاحب کے چند اور افسانے دوسرے رسالوں میں چھپے مگر وہ اس طرز کے نہیں تھے۔ اس سال اس سے بہتر اور کوئی افسانہ چھپا ہی نہیں حالانکہ اس زمانے میں بڑے بڑے افسانہ نگار تقریباً سبھی زندہ تھے اور لکھ رہے تھے۔ اس کے کوئی ایک سال بعد میرے پاس ایک خط علی گڑھ سے آیا۔ اس میں چغتائی صاحب کا خط اور دو افسانے تھے۔ خط میں بڑا خلوص تھا اور کسرِ نفسی بھی۔ ساقی دیکھنے کی خواہش بھی ظاہر کی تھی۔ ان کا خط پا کر بے حد خوشی ہوئی اور اسی دن سے ان سے ملنے کو جی چاہنے لگا۔ یہ افسانے تھے ”سخت چکر“ اور ”کولتار“۔ دوسرا افسانہ بہت مشہور ہوا، اور جب ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو ہم نے منصوبہ بنایا کہ ”کولتار“ کا پورا ناول کیسے مُرتب کیا جائے۔

مرزا صاحب کا پہلا خط ملنے کے بعد ان سے دس سال تک خط و کتابت کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ شاید ہی کوئی ہفتہ ناغہ ہوتا ہو۔ ان خطوں میں دُنیا زمانے کی باتیں ہوتی تھیں، اور جب خطوں سے جی نہ بھرتا تو وہ دلّی چلے آتے یا مجھے اُن کے پاس جانا پڑتا۔

پہلا خط بھیجنے کے دو تین مہینے بعد اُن کا خط آیا کہ میں دلّی آ رہا ہوں اور رات کی فلاں گاڑی سے، بیوی بھی ساتھ ہوگی۔ مرزا صاحب کی تصویر ہم سب دیکھ چکے تھے۔ رات کو میں، انصار ناصری اور فضل حق قریشی انہیں لینے اسٹیشن پہنچے۔ ریل آئی، ایک ایک ڈبہ چھان مارا۔ چغتائی صاحب کا کہیں پتہ نہ چلا۔ جب گاڑی بالکل خالی ہوگئی تو ہم اسٹیشن سے باہر نکل آئے۔ سامنے سڑک پر سے ایک تانگہ گذرا۔ اس میں ایک خاتون اور ایک صاحب دکھائی دیئے۔ فضل حق نے کہا: ”وہ جا رہے ہیں چغتائی صاحب!“ میں نے اور انصار نے چونک کر انہیں دیکھا۔ کوئی بڈھا چڑمڑایا سا آدمی تھا۔ موٹی سی عینک لگائے۔ پھر ہم سب ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑے۔ اگلے دن صبح میں گھر

ہی میں تھا کہ اطلاع پہنچی۔ "چغتائی صاحب مردانے میں آ بیٹھے ہیں۔" میں لپک کر پہنچا تو دیکھا کہ بیٹھک میں وہی تانگے والا بڈھا بیٹھا ہے۔ غور سے دیکھا تو اسے تصویر سے کچھ مشابہ پایا۔ اس نے کہا: "آپ ہیں شاہد صاحب؟" میں نے کہا: "جی ہاں۔" اور وہ مجھ سے چمٹ گئے۔ بولے "اماں میں تو سمجھا تھا کوئی خوفناک شکل کا مولوی ہوگا۔ مولوی شاہد احمد تم تو اچھے خاصے آدمی ہو۔" پھر خوب ہنسے تو میں نے دیکھا کہ نیچے کے چار دانت غائب۔ زرد چہرہ، آنکھوں کے کونوں پر بے شمار جھریاں، گلے پچکے ہوئے۔ ہونٹوں کے دونوں طرف قوسیں۔ لبوں پر لاکھا سا جما ہوا۔ چھوٹی چھوٹی کتری ہوئی مونچھیں، ڈاڑھی صاف، دبلا پتلا سا شخص عینک کے موٹے موٹے شیشوں میں سے مجھے جھانک رہا ہے۔ میں نے کہا: "مرزا صاحب! آپ اپنی تصویر سے بالکل نہیں ملتے۔ کل رات کو آپ کو تانگے میں جاتے دیکھا مگر ہم نے آپ کو نہ پہچانا۔ کہاں ٹھہرے؟ بھائی کہاں ہیں؟ میرے گھر کا پتہ تو آپ کو معلوم ہی تھا۔ یہاں سیدھے کیوں نہ چلے آئے؟" بولے۔ "میں نے بھی تمہیں اسٹیشن پر دیکھا تھا مگر تمہیں جانتا نہ تھا۔ طیبہ کالج میں میری ایک بہن ہیں، ان کے ہاں چلا گیا۔ اب تمہارا گھر دیکھ لیا، شام کو آجاؤں گا بیوی کو لے کر۔" اسکے بعد ان سے رسالوں اور مضمون نگاروں اور مضمونوں کی باتیں ہوتی رہیں۔ اندازہ ہوا کہ مرزا صاحب کی قوتِ گویائی بھی بہت بڑھی ہوئی ہے۔ دوسرے کو ہاں ہوں سے آگے بڑھنے کی زحمت نہیں دیتے۔ مگر باتیں اتنی دلچسپ کہ گھنٹوں سنو اور جی نہ بھرے۔

شام کو مرزا صاحب حسبِ وعدہ مع بیگم کے آ گئے۔ رات کو سب احباب جمع ہوئے اور خوب قہقہے چہچہے رہے۔ رات گئے احباب رخصت ہوئے تو ہم سونے کے لئے لیٹے، مرزا صاحب میں اور میرے منجھلے بھائی۔ مرزا صاحب بولتے رہے۔ میں سنتا رہا۔ وہ بولتے رہے، میں سو گیا۔ صبح اذانوں کے وقت انہوں نے آپ ہی آپ پھر بولنا شروع کر دیا۔ دیکھا کہ ہوں ہاں بھی غائب ہے تو میرا شانہ ہلا کر بولے: "ارے بھئی توبۃ النصوح کا پوتا آخر

کب تک خواب دیکھتا رہے گا؟" ناچار جاگ کر ان کی باتیں سننے لگا۔ بولے "سنتے ہو؟ میں ابھی بیت الخلاء گیا تو ایک افسانے کا پلاٹ سمجھ میں آ گیا۔ آج جانے سے پہلے تمہیں ہم وہ افسانہ لکھ کر دے جائیں گے۔ تو بس اب اٹھ بیٹھو، منہ ہاتھ دھو ڈالو۔"

اتنے میں کہ میں تیار ہوں اور ناشتہ آئے چغتائی صاحب نے آدھا افسانہ لکھ ڈالا۔ ناشتے کے بعد کوئی صاحب ان سے ملنے آ گئے۔ میں ٹل گیا۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد آیا تو ان کے پاس افسانہ مکمل تھا اور وہ میرے منجھلے بھائی سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وہ پولیس کے آدمی' ادب کے جھمیلوں سے اللہ نے انہیں محفوظ رکھا تھا۔ بولے۔ "لو میاں سنبھالو انہیں۔ خوب آدمی ہیں تمہارے چغتائی صاحب بھی۔ میاں غضب خدا کا ساری رات باتیں کرتے رہے تم دونوں!" وہ جب سوئے تھے تو ہم باتیں کر رہے تھے، جب جاگے تو ہم باتیں کر رہے تھے۔ سمجھے کہ ہم ساری رات ہی باتیں کرتے رہے۔ مرزا صاحب اس لطیفے سے بہت محظوظ ہوئے۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے افسانے کی شانِ نزول بتائی کہ "کل جو تم نے مجھے اسٹیشن پر نہیں پہچانا تو خاصی پریشانی ہوئی۔ مگر واقعی میری تصویر مجھ سے نہیں ملتی اور بھئی وہ تصویر کس کام کی جو اصل سے مل جائے! یہ افسانہ اپنی تصویر پر لکھا ہے۔ اس کا عنوان ہے "یہ کس کی تصویر ہے؟" اسکے بعد انہوں نے افسانہ سنایا۔ حیرانی ہوئی کہ قلم برداشتہ ایسا شگفتہ افسانہ! اور اس کے بعد تو میں نے ان کی یہ کیفیت دیکھی کہ باتیں بھی کرتے جا رہے ہیں اور افسانہ بھی لکھ رہے ہیں۔ عدالت میں مقدمہ بھی پیش کر رہے ہیں اور افسانہ بھی لکھا جا رہا ہے اور بعد میں معلوم ہوا کہ اس افسانے کے کچھ ورق تو گھر آ گئے اور کچھ ملزم کی مسل میں لگ کر عدالت کے فائل میں چلے گئے۔

ایک دفعہ اپنی وکالت کے زمانے میں مجھے جودھپور بلایا۔ میں نے لکھا "اگلے ہفتے آؤں گا۔ کچھ دلّی سے منگانا ہو تو لکھئے۔" خط آیا: "اور کچھ لاؤ یا نہ لاؤ، پان ضرور لانا۔"

مدتیں ہو گئیں کھائے ہوئے۔" دلی سے جودھپور کوئی چوبیس گھنٹے کا راستہ تھا۔ میں نے سوچا کہ پائے لے جاؤں گا، جاڑے کے دن ہیں، خراب نہیں ہوں گے۔" اتفاق سے ایک عزیز جے پور کے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا: "اسٹیشن ہی پر دھر لئے جاؤ گے۔ جے پور، جودھ پور، کسی ہندو ریاست میں گائے نہیں ہوتی۔ اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔" اس لئے ارادہ ملتوی کر دیا۔ مگر جودھ پور پہنچتے ہی مرزا صاحب نے پہلا سوال یہی کیا۔

"پائے لائے ہمارے لئے؟" میں نے نہ لانے کی وجہ بتائی تو بولے۔ "ارے بھئی ہم وکیل ہیں، اگر تم پکڑے جاتے تو ہم تمہیں جرمانہ دے کر چھڑا لاتے، ابھی ہمارے ایک مؤکل کی کار کی ٹکر ایک گئو ماتا سے ہو گئی تھی۔ اُن محترمہ کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ عدالت نے بارہ روپے جُرمانہ کیا۔" میں نے کہا۔ "آپ کی وکالت یہاں کچھ چل بھی رہی ہے؟" کہنے لگے۔ "کیوں نہیں؟ ہمارا رجسٹر دیکھو۔" یہ کہہ کر اپنا رجسٹر نکال کر دکھانے لگے۔ کسی سے پیشگی پانچ، کسی سے دس وصول ہوئے تھے۔ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ باقی میں ڈال رکھے تھے۔ بہت چہک کر بولے "پچھلے مہینے چالیس روپے کی آمدنی ہوئی، چھ سو بقایا میں ہیں۔" میں نے کہا: "ماشاء اللہ خوب چل رہی ہے۔" بولے "میاں تم یافت کو دیکھتے ہو، بقایا کو دیکھو۔ ہزاروں پہ نوبت ہے، ہزاروں پر۔" کوئی مؤکل آ گیا تو جودھ پوری منشی کو بُلا کر کہا: "اس سے کہہ دو کہ وکیل صاحب کے پاس کام بہت ہے۔ کل کچہری میں ملے۔ ارے تم دیکھتے نہیں ہمارے دوست دلی سے آئے ہوئے ہیں، مؤکل تو اور بھی آ جائے گا۔ یہ کب کب ہاتھ آتے ہیں۔" اور پھر مرزا صاحب کی دلچسپ باتیں شروع ہو جاتیں اور باتیں ختم ہونے نہ پاتیں کہ وہ اپنے کسی ناول کا مسودہ سُنانا شروع کر دیتے۔ اس زمانے میں انہوں نے اپنا ناولٹ "ویمپائر" لکھا تھا۔ بولے "میں پڑھتا ہوں، تم اس کی زبان ٹھیک کرتے جاؤ۔" میں نے کہا "آپ کی زبان ایسی نہیں ہوتی کہ میں اسے ٹھیک کروں" کہنے لگے۔ "نہیں، مجھے اپنی کمزوری معلوم ہے۔ میں زبان کا بالکل خیال نہیں رکھتا۔ بس لکھے چلا جاتا ہوں۔" میں نے کہا "تو آپ یہ مسودہ

مجھے دے دیجئے، میں اس کی نظر ثانی کر دوں گا۔" کہنے لگے۔ "اچھا سُن تو لو۔ ابھی مکمل کہاں ہوا ہے۔ پلاٹ آکر ایک جگہ اڑ گیا ہے۔ آگے نہیں چلتا۔" پھر دو گھنٹے تک وہ سُناتے رہے اور مسودہ ختم ہو گیا۔ پوچھنے لگے: "بتاؤ اب اسے ختم کیسے کریں؟" میں نے کچھ بتایا، ان کی سمجھ میں آ گیا، بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے: "بس بھئی کل کی روانگی ملتوی کر دو تو ہم اپنا یہ ناول مکمل کر کے تمہیں دیدیں گے۔" اس قدر لجاجت سے روکتے تھے کہ مجھے شرمندگی ہونے لگی تھی۔ انہیں نیند بہت کم آتی تھی۔ رات کو بارہ ایک بجے تک جاگتے تھے۔ اس لئے میں صبح سات آٹھ بجے تک اُٹھتا تھا۔ پھر دوپہر کو مزید سوتا تھا۔ غرض میں تو سوتا ہی رہا اور انہوں نے "ویمپائر" مکمل کر دیا اور ایک دو افسانے بھی لکھ کر تھما دیئے۔

چغتائی صاحب کے اور سب عزیزوں کو دیکھ کر کہنا پڑا کہ "ایں خانہ تمام آفتاب است۔" بڑے بھائی ملے، خوب تندرست و توانا۔ معلوم ہوا کہ آپ بھی تھرڈ کلاس وکیل ہیں۔ نیچے کے چار دانت غائب۔ مرزا صاحب سے چھوٹے بھائی ملے۔ قوی الجثہ، مرنجا صوفی۔ نیچے کے چار دانت غائب۔ ان سے چھوٹے بھائی بالکل چغتائی صاحب کی شکل کے مگر اچھی صحت۔ "آپ کیا کرتے ہیں؟" فرمایا: "رہتا ہوں۔" نیچے کے چار دانت غائب۔ سب سے چھوٹے بھائی قد میں سب سے بڑے، ماشاء اللہ دیو زاد، یہ لمبا تڑنگا جوان۔ معلوم ہوا کہ آپ کو دق ہے۔ نیچے کے چار دانت غائب۔ مجھ سے نہ رہا گیا میں نے مرزا صاحب سے پوچھا "یہ کیا مصیبت ہے کہ سب کے چار چار دانت غائب؟" کہنے لگے: "ایک دانتوں کے ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ انہی چار دانتوں سے پائیوریا ہوتا ہے۔ بس سب نے اکھڑوا ڈالے۔" جب عصمت چغتائی ملیں تو سب سے پہلے میں نے یہی دیکھا کہ کہیں ان کے بھی چار دانت تو غائب نہیں؟ بحمد اللہ ان کے سارے دانت برقرار تھے۔

ایک دفعہ پھر خط لکھا کہ "ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ آ جاؤ۔ کسی کے ذکر تھوڑی ہو۔ تم آؤ گے تو تم سے ڈسکس کر کے کئی افسانے لکھیں گے۔" میں پہنچا۔ صحت پہلے سے بدتر

تھی۔ کھانسی زیادہ تھی۔ میں نے کہا آپ اپنی صحت کی طرف سے غفلت کر رہے ہیں کہنے لگے: "ڈاکٹر کہتے ہیں تمہیں دق ہے۔ میں کہتا ہوں مجھے دق نہیں، دمہ ہے۔" ان کی ضدی طبیعت نے ڈاکٹروں کی رائے ماننے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ من مانی دوائیں کھاتے رہتے تھے۔ گھر والوں میں سے بھی کسی کی نہ سنتے تھے بلکہ جو کچھ کوئی کہتا تو ادبدا کر اسکے خلاف کرتے اور تکلیف اُٹھاتے۔ بھابی بھی ان کی ضد سے پریشان ہوتی تھیں مگر ان کی ایک بھی پیش نہ جاتی تھی۔ بچاری خاموشی سے سارے گھر کا کام بھی کرتیں، بچوں کی نگرانی اور پرورش بھی اور شوہر کی خدمت بھی۔ اور کیا مجال جو کبھی پیشانی پر شکن تک آجائے۔

دو تین افسانے تو چغتائی صاحب نے میرے لئے پہلے ہی سے لکھ رکھے تھے۔ کئی افسانوں کے انہوں نے پلاٹ سُنائے۔ سب اچھے، ایک سے ایک عمدہ۔ ایک مارواڑ کا رومان سُنایا — سوانگ کی روحیں — یہ سب سے زیادہ مجھے پسند آیا۔ کہنے لگے "تو لاؤ پہلے اسی کو لکھ ڈالیں" اور کاغذ قلم لے کر لکھنا شروع کر دیا۔ میں بیٹھا واقعی مکھیاں مارتا رہا کیونکہ اس سال وہاں ساری دُنیا کی مکھیاں آگئی تھیں۔ ایک گھنٹہ میں انہوں نے کئی صفحے لکھ ڈالے پھر بولے: "میاں پٹہ کھیل چکے۔ لو ذرا اب تم قلم لو۔ میرا ہاتھ تھک گیا۔" میں نے قلم سنبھالا۔ وہ بے تکلف بولتے رہے۔ میں لکھتا رہا۔ دو تین صفحے لکھ کر میں نے کہا: "بس جی میں تو لکھ چکا۔ مجھے تو نیند آرہی ہے۔ مرغن کھانے کھلاتے ہو تو سونے بھی دو۔" کہنے لگے: "اچھا تو مچھر دانی لگا کر سو رہو۔" عصر کے وقت انہوں نے جگایا: "کیا آج چائے نہیں پیو گے؟" اُٹھنا پڑا۔ بولے: "افسانہ ختم ہو رہا ہے۔ شام تک ختم ہو جائیگا۔" میں تو چا پی کر کسی کے ساتھ نکل گیا۔ مرزا صاحب بیٹھے لکھتے رہے۔ چراغ جلے گھر واپس پہنچا تو بڑے خوش خوش بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے: "لو بھئی یہ افسانہ" اور کوئی چالیس فل اسکیپ کا پلندہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے کہا "شاباش ہے مرزا صاحب آپ کی ہمت کو۔ بس کل صبح کی گاڑی سے میں چلا جاؤں گا۔" جانے کے نام سے ان کا مُنہ

اُتر گیا۔ کہنے لگے "نہ جانے کیا بات ہے تم آجاتے ہو تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں بیمار نہیں ہوں۔ کل نہ جاؤ، ہم تمہیں دو افسانے اور لکھ دینگے۔" انہوں نے یہ بات کچھ ایسے اندوہ ناک لہجے میں کہی کہ میرا دل بھر آیا۔ میں نے کہا اچھا پرسوں چلا جاؤں گا۔" بچوں کی طرح خوش ہونے لگے۔ مجھے تھوڑی دیر بعد خیال آیا کہ میرے پاس چغتائی صاحب کے تقریباً سو صفحے کے مضامین تو ہو ہی جائیں گے، اگر سو صفحے کے اور ہو جائیں تو "چغتائی نمبر" ہی کیوں نہ چھاپ دیا جائے۔ اتنے بڑے مضمون نگار اور ایسے پیارے دوست کی ایک اچھی یادگار ہی قائم ہو جائے گی۔ میں نے ان سے کہا کہ "مرزا صاحب! تو پھر آپ یوں کیجئے کہ کل تو آپ مجھے جو کچھ لکھ کر دے سکیں دے دیں، اس کے بعد پندرہ بیس دن میں مجھے چند مضامین اور لکھ دیجئے۔ میں "چغتائی نمبر" چھاپے دیتا ہوں۔" یہ تجویز انہیں پسند آگئی۔ پوچھا "کب نکل جائے گا؟" میں نے کہا: "نہ نکلنے کی کوئی وجہ نہیں۔" کہنے لگے: "ایک ہفتے میں تمہیں سب مضامین پہنچ جائیں گے۔" میں نے چند تجویزیں انہیں بتائیں کہ اس طرح کے مضامین ضرور لکھئے مثلاً ایک آدھ غمناک افسانہ، دو ایک مکالمے یا ڈرامے اور ایک مضمون یہ کہ "میں مضمون کیسے لکھتا ہوں"۔ کہا: "یہ سب ہو جائے گا۔"

اگلے دن دو مضمون تو انہوں نے لکھ کر دے دیئے اور بیسیوں پلاٹ سُنائے۔ پھر کہنے لگے: "لکھتے لکھتے میرا ہاتھ تھک جاتا ہے۔ اگر کوئی شارٹ ہینڈ میں لکھنے والا مل جائے تو میں کئی ناول بول دوں۔"

اگلے دن صبح سویرے میں اُٹھ بیٹھا۔ بستر لپیٹنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ مرزا صاحب آگئے۔ افسردگی چہرے سے ظاہر تھی۔ کہنے لگے: "ارے بھئی سُنتے ہو آج اور نہ ٹھہر جاؤ۔ سارے مضامین ساتھ ہی نہ لیتے جاؤ؟" دل کٹ گیا ان کے اس خلوص کو دیکھ کر۔ میں نے کہا: "اگر آپ کو میرے ٹھہر جانے سے خوشی ہو گی تو میں ضرور ٹھہر جاؤں گا۔ مگر مجھے یہ گوارا نہیں کہ آپ میرے لئے مرتے رہیں۔ پندرہ دن میں تو یہ مضامین لکھے جائیں گے جو میرے پاس ہیں۔ باقی آپ

پھر بھیجتے رہئے گا۔" بولے: "ارے بھئی تم نہیں جانتے کہ تمہارے یہاں ہونے سے میری کیا کیفیت ہے۔ سچ کہتا ہوں میں بالکل تندرست ہو گیا ہوں۔ بھوک لگنے لگی، خوراک دُگنی ہو گئی۔ جی چاہتا ہے کہ لکھوں اور لکھتا ہی رہوں۔ میں اس وقت سے ڈر رہا ہوں کہ تم چلے جاؤ گے تو مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں لکھا جائے گا اور پھر بیماری مجھے دبوچ لے گی۔" میں نے اُن کو بہلانے کے لئے کہا: "اب تو آپ پہلے سے بہت اچھے ہیں۔ میں دلّی جا کر چند یونانی مرکبات آپ کو بھیجوں گا، ان سے رہی سہی کمزوری بھی جاتی رہے گی۔" مگر وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر رہ گئے اور بولے: "بس تو آج تم نہیں جا رہے؟" میں نے کہا: "نہیں۔" جلدی جلدی بھابی سے جا کر کہا: "شاہد صاحب آج نہیں جا رہے۔ آج انہیں جودھ پور کی سیر کرائی جائے گی۔ ذرا تگڑا ناشتہ کرا دو آج۔" ناشتے کے بعد کسی دوست کی کار منگوائی۔ شہر کا ایک چکر اس میں لگایا پھر ایک پُرانا قلعہ دکھایا۔ ایک نیا محل تیار ہو رہا تھا، وہ دکھایا۔ ایک عزیز تھے، ان سے ملوایا۔ دوپہر کو گھر آ گئے کھانا کھایا۔ باتیں کرتے کرتے میں تو سو گیا اور انہوں نے اتنی دیر میں دو چھوٹے چھوٹے مضمون لکھ لئے۔ کہنے لگے: "آج رات کو تمہیں گانا بھی سُنوایا جائے گا۔" میں نے کہا "آپ کو تو اس سے نفرت ہے۔" بولے: "مجھے تو نہیں ہے۔ ایک ہندو پکّا گانا گاتا ہے، اسے بلوایا ہے۔" وقت اچھا گذرا۔ صبح ناشتہ پر پھر کچھ روکنے کی تمہید اُٹھائی تھی کہ بھابی نے کہا: "کیوں آپ انہیں پریشان کرتے ہیں۔ گھر والے پریشان ہوں گے کہ تین دن کو کہہ کر گئے تھے، آج چھ دن ہو گئے۔" کہنے لگے: "ارے صاحب یہ کسی کے نوکر تو ہیں نہیں کہ ان کی حاضری ہو۔ ہم یہاں سے ان کے گھر تار دئیے دیتے ہیں۔ انہیں آخر کس بات کا فکر ہے؟" بھابی شاید کچھ اور کہتیں مگر بیچ میں مرزا صاحب کا چھ سال کا بچہ تجو بول پڑا: "اماں یہ دلّی میں کیا کرتے ہیں؟" بھابی نے کہا: "کچھ بھی نہیں۔" بچے نے کہا: "تو پھر یہ کھاتے کہاں سے ہیں؟" ہم سب ہنس پڑے اور وہ بات بھی اُڑ گئی۔ چلتے وقت مرزا صاحب نے کہا: "وعدہ کرو کہ پھر جلدی آؤ گے۔" میں نے کہا: "جب آپ یاد فرمائیں گے حاضر ہو جاؤں گا۔"

نواب صاحب جاورہ خبر نہیں کب سے چغتائی صاحب کی قدر دانی پر مائل تھے۔ کچھ عرصہ بعد سُنا کہ نواب صاحب نے اُنہیں جاورہ بلا کر چیف جج بنا دیا۔ مرزا صاحب نے جاورہ بُلایا۔ میں وہاں بھی گیا۔ بنہایت عالی شان کوٹھی انہیں ملی ہوئی تھی۔ چغتائی صاحب بہت بڑے عہدہ دار تھے اور نواب صاحب کے مزاج پر بھی چڑھے ہوئے تھے۔ مجھ سے کہا کہ "نواب صاحب سے کب ملو گے؟" میں نے کہا: "میں اتنے بڑے آدمیوں سے نہیں ملتا جن سے مل کر مجھے ذلّت محسوس ہو۔" مرزا صاحب نے کہا: "ارے بھئی تمہارے دادا کے تو بڑے قدر دان ہیں یہ نواب۔ میں نے یہاں لوگوں سے سُنا ہے کہ نواب صاحب ایک دفعہ ایسے بیمار پڑے کہ ان کے جینے کی آس نہ رہی۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی بزرگ کہہ رہے ہیں: "مولوی نذیر احمد کا ترجمۂ قرآن شائع کرو تم اچھے ہو جاؤ گے۔ انہوں نے تمہارے والد سے اجازت منگوائی اور دو جلدوں میں صرف ترجمہ اپنے چھاپہ خانہ سے شائع کیا اور واقعی اچھے ہو گئے۔ تو وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔" میں نے کہا: "اور کچھ خیرات بھی مجھے دینگے۔" مرزا صاحب نے کہا: "تو پھر کیا ہوا؟" میں نے کہا "مجھے معاف فرمائیے، میں تو صرف آپ سے ملنے آیا ہوں۔ میرے تو نواب یا بادشاہ جو کچھ ہیں آپ ہیں۔" مگر مرزا صاحب نے میری اس بات کو کچھ پسند نہیں کیا اور دل میں شاید کچھ ناراض بھی ہوئے۔

جاورہ میں مرزا صاحب کی صحت اور بھی زیادہ خراب رہنے لگی۔ وہاں کی مرطوب آب و ہوا سے ان کی سانس کی شکایت اور بڑھ گئی اور صحت گرتی ہی چلی گئی۔ شاید مشکل سے دو سال جاورہ میں رہے ہوں گے۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ آپ جودھ پور واپس چلے جائیے ورنہ آپ یہاں بہت جلد مر جائینگے۔ مرزا صاحب بیماری کا عذر کر کے جودھ پور چلے آئے اور یہاں سے استعفےٰ بھجوا دیا۔ وکالت کا کام پھر شروع کیا مگر بدن میں جان نہ ہونے کی وجہ سے وکالت پھُس ہی رہی۔ اس لئے اپنی کتابیں چھاپنے کا کام خود شروع کر دیا تھا۔

اب سے کوئی پچاس سال پہلے مولوی نذیر احمد صاحب نے ایک کتاب "اُمہات الامۃ" لکھی تھی۔ یہ کتاب ایک دریدہ ذہن پادری کی کتاب کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اس نے آنحضرت صلعم پر بعض بڑے بیہودہ اعتراضات کئے تھے جن میں خاص طور پر ازواجِ مطہرات کے سلسلے میں ناگفتہ بہ باتیں کہی تھیں۔ اس کتاب کا ایک جواب سر سید احمد خاں نے لکھا تھا اور ایک مولوی نذیر احمد نے۔ یوں تو یہ کتاب شروع سے آخر تک ایک علمی اور تاریخی کتاب ہے اور اپنے مواد کے لحاظ سے نہایت قابلِ قدر بھی۔ لیکن مولوی صاحب نے احترام کے الفاظ کسی نام کے ساتھ اس میں نہیں لگائے ہیں اور بعض جگہ فقرے بھی ایسے لکھ گئے ہیں جو زبان کے اعتبار سے چاہے کتنے ہی ٹکسالی کیوں نہ ہوں، رسولِ مقبولؐ و اہلِ بیت کے ادب و احترام کے لحاظ سے قابلِ اعتراض سمجھے گئے۔ مولوی صاحب اس پیرایۂ بیان کا جواز یوں پیش کرتے تھے کہ چونکہ ایک عیسائی پادری اس کتاب کا مخاطب ہے، اس لئے ان کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ یہ توضیح صحیح ہو یا غلط یہاں اس سے بحث نہیں۔ ہوا یہ کہ ہمارے علماء نے اس کتاب کو سوختنی اور مولوی صاحب کو کافر قرار دیا۔ مسلمانوں کے ایک بڑے ذمہ دار لیڈر نے رفعِ شر کے لئے اس کتاب کے سارے نسخے مولوی صاحب سے اپنی تحویل میں لے لئے۔ اور مولوی صاحب کی بغیر اجازت انہیں علماء کے جلسے میں لے جا کر جلوا دیا۔ قصہ مختصر اس ناگوار واقعہ کے بعد مولوی صاحب تین چار سال زندہ رہے مگر انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ شامتِ اعمال اس کتاب کا نسخہ کہیں سے میرے ہاتھ لگ گیا اور میں نے یہ سوچ کر ایک اچھی کتاب سے مسلمان کیوں محروم رہیں، اسے جوں کا توں چھاپ دیا۔ اس کا چھپنا تھا کہ پھر ہمارے علماء نے اسکے خلاف تحریک شروع کر دی۔ حکومت پر زور ڈالا کہ کتاب ضبط کر لی جائے۔ حکومت کو بھلا کیا غرض پڑی تھی کہ خواہ مخواہ اس جھگڑے میں پڑے؟ جب ادھر سے کامیابی نہ ہوئی تو مجھ پر بزرگوں سے دباؤ ڈلوایا گیا۔ یہ بھی ناکام رہا تو قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔

اور ہر شہر میں اور دلّی میں اس کے خلاف جلسے ہونے لگے۔ چغتائی صاحب نے مجھے جودھپور سے لکھا کہ ساری کتاب مجھے بھیج دو اور اعلان کر دو کہ کتاب میرے پاس ہے جس کو ہمت ہو مجھ سے لے لے۔ میں نے انہیں دو سو جلدیں بھیج دیں کہ محفوظ ہو جائیں۔ اور کتاب کی اشاعت روک دینے کا اعلان کر دیا۔ مسلمانوں نے مجھے نہ صرف معاف کر دیا بلکہ خوش بھی ہوئے کہ چلو غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے۔ یہ کیا کم ہے کہ کتاب کی اشاعت بند کر کے اسنے اپنا مالی نقصان کر لیا۔ اُدھر مرزا صاحب کی ضدی طبیعت نے زور مارا اور انہوں نے ایک مُراسلہ "انقلاب" لاہور میں چھپوا دیا کہ "اُمہات الامۃ" شاہد کے پاس اب نہیں ہے' میرے پاس ہے جس میں ہمت ہو مجھ سے لے لے، بلکہ مسلمانوں کو چاہئے کہ مجھے کاٹ کر میرا پلاؤ پکائیں اور مُلّاؤں کو کھلا دیں"۔ اس کے چھپتے ہی بس آگ ہی تو لگ گئی۔ پندرہ دن بعد مرزا صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ جودھپور کے مسلمانوں نے ان کے گھر کو گھیر لیا اور زبردستی ان سے ساری کتابیں لے گئے۔ اس کے بعد وہ ایکدن کچہری جا رہے تھے تو دو چار بدمعاشوں نے ان پر لاٹھیوں سے حملہ کیا اور ان کے ایک ہاتھ میں سخت ضرب آئی۔ مرزا صاحب نے لکھا: "بھائی بڑی رُسوائی ہوئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ یا تو مسلمانوں کے جلسۂ عام میں توبہ کرو اور اقرارِ اسلام کرو ورنہ تم کافر ہو اور قتل کر دئیے جاؤ گے۔ سارے شہر میں آگ پھیلی ہوئی تھی۔ لاکھ میں سب سے کہتا ہوں کہ کتاب میں نے نہیں لکھی، دلّی والے نذیر احمد نے لکھی تھی مگر سب یہی کہتے کہ نہیں تم نے لکھی ہے اور اس میں تم نے سب کو گالیاں دی ہیں۔ چنانچہ مصلحت اسی میں سمجھی کہ اپنے آپ کو یہاں کے علماء کے حوالے کر دوں۔ علماء مجھے ایک بڑے جلسے میں لے گئے۔ مجھ سے سب کے سامنے توبہ کرائی۔ مجھے کلمہ پڑھوایا اور دوبارہ مجھے مشرف بہ اسلام کیا۔ تب کہیں جان بچی۔ خیر مجھے اس تکلیف اور رُسوائی کا بھی اتنا افسوس نہیں، مگر بے حد رنج ہوا اور شرم آئی یہ دیکھ کر کہ وہ دو سو جلدیں جو تم نے مجھے بھیجی تھیں وہ مجھ سے مولوی زبردستی چھین لائے تھے، اس جلسے میں جلائی

گئیں۔ افسوس کہ پچیس تیس سال میں مسلمانوں نے کوئی ذہنی ترقی نہیں کی۔"

ایک دفعہ مرزا صاحب کا سخت اصرار ہوا کہ خود بھی آؤ اور بھابی کو بھی لے آؤ۔ تعمیلِ ارشاد کی گئی۔ اب کے جو انہیں دیکھا تو بڑا دکھ ہوا۔ ان کے پاؤں رہ گئے تھے اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ بخار ہر وقت رہتا تھا۔ کھانسی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ سوکھ کر تانت ہو گئے تھے۔ مگر دماغ اسی طرح روشن اور مزاج اسی طرح بشاش تھا۔ خوش تو ہمیشہ ہی ہوتے تھے۔ اب کے بہت خوش ہوئے۔ بولے "دیکھو! ابھی تم آئے ہو اور ابھی ہماری بیماری جاتی رہی۔" مزے مزے کی باتیں کرتے رہے۔ ہنستے رہے، ہنساتے رہے۔ ایک ناول "شراب" لکھنا شروع کیا تھا مگر چند باب ہی لکھ سکے تھے۔ اس کے کچھ حصے سنائے اور چھاپنے کے لئے مجھے دیئے۔ رات کو جب دستر خوان بچھا تو کھسک کر ساتھ بیٹھ گئے۔ بھابی وہیں سے چیخیں کہ آپ کچھ نہ کھائیے گا۔ کہنے لگے: "کھائیں گے ہم ضرور۔ اب ہم بالکل اچھے ہیں، کوئی بیمار تھوڑی ہیں۔" مجھ سے کہتے جاتے تھے: "ارے بھئی یہ بھی دو۔" بھابی جھلاتی تھیں مگر وہ اپنا کام کئے جاتے تھے۔ کھایا تو خیر اُن سے کیا جاتا، تھوڑا تھوڑا سا سب چکھ لیا۔ بارہ ایک بجے تک باتیں کرتے رہے۔ صبح جب مرزا صاحب کو دیکھا تو اُن کی حالت غیر تھی۔ معلوم ہوا کہ سخت بدہضمی ہوئی۔ رات بھر اوکتے اوڈالتے رہے۔ پلیتھن نکل گیا۔ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ آواز بھی نہ نکلتی تھی۔ دو دن میں طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی۔ ہم بازار سے گھوم پھر کر آئے تو تکئے کے سہارے پلنگ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بولے "لو یہ افسانہ تمہارے لئے لکھا ہے۔" پڑھ کر سنایا۔ عنوان تھا "برقعہ کتر ڈول۔" میں ہنس رہا تھا، مرزا صاحب بھی ہنستے جاتے تھے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ ان کا آخری افسانہ ہے، اور میرے لئے اُن کی یہ ہنسی بھی آخری!

اگلے دن ہمیں دلی واپس جانا تھا۔ رات کو باتیں کرتے کرتے میری بیوی سے بولے: "آپ کا آنا ایسے وقت میں ہوا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔" پھر ایک اپنا چھپا ہوا لیٹر فارم نکالا اور اس پر کچھ لکھ کر انہیں دیا کہ "اسے قبول کر لیجئے۔" انہوں نے پڑھ کر میری طرف

بڑھا دیا۔ مرزا صاحب نے کتاب "کولتار" کا حقِ تصنیف ان کے نام منتقل کر دیا تھا۔ میں نے کہا: "یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ آپ کے بچوں کی حق تلفی ہے۔" کہنے لگے: "تم خاموش رہو جی۔ تمہیں تھوڑی دے رہے ہیں۔" نہیں مانے اور زبردستی وہ کاغذ میری بیوی کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

مرزا صاحب کی صحت گرتی ہی چلی گئی۔ اُن کے خطوں سے اُن کا حال معلوم ہوتا رہتا تھا۔ اس کے بعد ایسے خط آنے شروع ہوئے جو اُن کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے نہیں ہوتے تھے۔ پھر ایک دن اُن کا خط ملا کہ "آخری بار آ کر مل جاؤ۔ کچھ روپے لیتے آنا۔" میں نے روانگی کا تار دیا اور رات ہی کی گاڑی سے چل پڑا۔ اسٹیشن پر اُن کے چھوٹے بھائی آئے تھے۔ میں نے پوچھا: "چغتائی صاحب کا کیا حال ہے؟" بولے: "وہی ہے!" سمجھ میں نہ آیا کہ وہی ہے کا کیا مطلب ہے۔ گھر پہنچے تو دیکھا کہ اُن کے حصے کے کمروں میں سناٹا! نہ بھابی نہ بچے۔ ایک کمرے میں پلنگ پر لحاف اوڑھے چغتائی صاحب پڑے تھے۔ پاس کوئی نہ تھا۔ میں نے آواز دی اور سلام کیا تو مُنہ پر سے لحاف ہٹایا۔ مجھ پر بجلی گر پڑی۔ مرزا صاحب کے بدلے ایک سکھ دکھائی دیا۔ کھڑی ڈاڑھی مونچھیں اور بڑھے ہوئے سر کے بالوں پر ایک رومال بندھا ہوا۔ پیلا چہرہ، پھٹی پھٹی آنکھیں۔ لحاف ہلا تو اس میں سے بدبو کا ایک بھبکا آیا۔ پایوں کے نیچے پانی کے پیالے رکھے ہوئے تھے مگر پلنگ پر ٹانکے کے چیونٹے پھر رہے تھے۔ میں رونے لگا۔ وہ بھی آب دیدہ ہو گئے۔ میں نے کہا: "یہ کیا حالت ہو گئی؟" بولے: "بس اب ختم سمجھو۔" پھر ایک دم سے مُسکرائے اور کراہتے ہوئے بولے: "ارے ارے آپ کو دیکھئے۔" اور لحاف میں سے ایک چیونٹا چٹکی میں پکڑ کر نیچے پھینکا۔ "مرنے سے پہلے ہی اپنا حصہ لینے چلے آئے۔" اتنے میں اندر کے رُخ کا ایک دروازہ کھلا اور اُن کی والدہ اندر آئیں۔ بولیں: "مُنے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟" مرزا صاحب نے کہا: "یہ شاہد صاحب آئے ہیں، انہیں پہلے چائے پلوائیے۔" اماں چلی گئیں تو اُن کی

باتوں سے معلوم ہوا کہ اب صرف اماں ہی ان کا خیال رکھتی ہیں۔ ماشاءاللہ بھرا پُرا گھر تھا مگر کوئی اُن کے پاس نہ آتا تھا۔ میں نے کہا: "بھابی اور بچے کہاں ہیں؟" بولے "رام پور۔" میں نے کہا: "وہ کیوں؟" کہنے لگے: "بیوی کو میری خدمت کرتے کرتے خود دق ہو گئی۔ میں نے اُن سے بارہا کہا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ ورنہ تم بھی مر جاؤ گی۔ مگر وہ نہ مانیں۔ جب میں نے دیکھا کہ میں تو مر ہی رہا ہوں اور اگر یہ نہ چلی گئیں تو یہ بھی مر جائیں گی، تو میں نے ان سے کہا، اگر تم یوں نہیں جاؤ گی تو ہم تمہیں طلاق دے دیں گے۔ وہ پھر بھی نہ گئیں۔ میں نے اُن سے کہہ دیا کہ آپ کو ہم نے طلاق دے دی، آپ یہاں سے تشریف لے جائیے۔ تو انہوں نے کہا آپ کے طلاق دینے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم نے تو طلاق نہیں لی۔ ہم یہاں سے نہیں جائینگے۔ آخر میں نے تنگ آ کر اُن کے میکے والوں کو خط لکھا کہ اپنی لڑکی کو آ کر لے جاؤ، میں نے اسے طلاق دے دی ہے۔ خط کے پہنچتے ہی اُن کا بھائی آ دھمکا اور زبردستی اپنی بہن کو یہاں سے لے گیا۔" میں نے کہا: "یہ آپ نے اچھا نہ کیا۔ ساری عمر کی خدمت کا آپ نے یہ صلہ دیا اُنہیں۔" کہنے لگے: "بھائی اگر وہ یہاں رہتیں تو واقعی مر جاتیں۔ اُن کے بچانے کی اور کوئی صورت ہی نہیں تھی، اور ہاں سنو، اصل میں طلاق ہوئی نہیں ہے مگر اُن کے گھر والوں کو میں جانتا تھا کہ ایک خط میں ہی آ کر لے جائیں گے۔ بیوی نے بہت کہا بھی یہ طلاق نہیں ہے مگر اُن کے بھائی نے کہا: جب انہوں نے ہمیں لکھ کر ہی بھیج دیا تو اگر نہیں ہوئی تب بھی ہو گئی۔"

اس کے بعد ان کی اماں اور بھائیوں اور عصمت چغتائی سے باتیں کرنے پر معلوم ہوا کہ بیماری نے مرزا صاحب کے دماغ پر عجب طرح کا اثر ڈالا ہے کہ انہیں دوسروں کو تکلیف پہنچا کر لطف آتا ہے۔ مثلاً بھائیوں بھائیوں کو لڑوا دیں گے۔ کسی پر چوری کا الزام لگا دیں گے۔ طبیعت سے گھبرا کر کوئی ایسی بات کرینگے کہ دو آدمی اُلجھ جائیں۔ ہم سب نے تنگ آ کر اُن کی طرف جانا ہی چھوڑ دیا۔ بس ماں کی ہی مامتا ہے جو برداشت کر رہی ہے۔" میں

نے کہا: "مگر اب تو ان کا آخری وقت ہے۔ کے دن جئیں گے بچارے۔" "مگر سارے بھائی بہن یہی کہتے تھے کہ "یہ نہیں مریں گے۔ کتنی ہی دفعہ ہو چکا ہے کہ سُنتے بھائی مر رہے ہیں، سُنتے بھائی مر رہے ہیں۔ سب بھاگے بھاگے گئے۔ اور وہ نہ مرے نہ ڈرے پھر اچھے خاصے ہو گئے۔" اس گھر میں تین دن رہنا مجھے اجیرن ہو گیا۔ عجیب بے کسی کی زندگی تھی۔ گرم گرم بخار چڑھتے، پنڈا جھلستا رہتا۔ ہڈیاں تک سُوکھ گئی تھیں۔ کھانسی کے مارے سینے میں سانس نہ سماتا تھا۔ پاؤں بالکل بے کار ہو چکے تھے۔ مگر دماغ روشن تھا۔ کوئی تیماردار نہیں۔ پیسہ کوڑی پاس نہیں۔ نہ جانے کس وقت دم نکل جائے۔ گھر والے تو مطمئن ہیں کہ یہ مرنے ہی کے نہیں! میں نے جی میں کہا: "اللہ تیری شان ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے دُنیا کو ہنسایا اور مرنے کے بعد بھی ہنساتا رہے گا۔ اور اس عذاب میں مبتلا! تو ہی اپنی مصلحتوں کو خوب جانتا ہے۔" جب میں اُن سے رخصت ہونے لگا تو ہاتھ بڑھایا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میں رو رہا تھا۔ وہ بھی رو رہے تھے۔ میں نے کہا "یہ روپے رکھ لیجئے۔" پوچھنے لگے: "کتنے ہیں؟" میں نے کہا: "دو سو ہیں۔ اگر زیادہ کی ضرورت ہو تو میں دلّی پہنچ کر اور بھیج دوں گا۔" بولے: "بہت ہیں۔ تکئے کے نیچے رکھ دو۔" خدا حافظ کہہ کر میں آنسو پونچھتا باہر نکل آیا۔ پھر اُن کی صورت دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔ شاید دو ہفتے گزرے ہوں گے کہ ان کے انتقال کی خبر ملی۔ میں نے کہا: "تو بھئی وہ مر گیا جو مرتا نہ تھا۔"

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

میراجی

دلّی اور لاہور ہمارے لئے گھر آنگن تھا۔ جب جی چاہا مُنہ اُٹھایا اور چل پڑے۔ کھانے دانے سے فارغ ہو رات کو فرنٹیئر میل میں سوار ہوئے اور سو گئے۔ آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ گاڑی لاہور پر کھڑی ہے۔ سال میں کئی کئی پھیرے لاہور کے ہو جاتے تھے۔ لاہور ادیبوں کی منڈی تھا۔ سرسیّد نے انہیں "زندہ دلانِ پنجاب" کہا اور واقعی یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس خطّے میں زندگی اُبلتی ہے اور گنگناتی گاتی پھرتی ہے۔ کتنا خلوص تھا یہاں کے لوگوں میں۔ اور کتنی محبت! ٹوٹ کر ملتے، ہاتھوں ہاتھ لیتے اور سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب ایک ہی تھیلی کے چٹّے بٹّے تھے۔ ان میں تیر میر نہیں آئی تھی۔ ادیب اور شاعر نرے ادیب و شاعر ہی تھے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ آرٹسٹ کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، اس کی تصدیق لاہور ہی میں ہوتی تھی۔ اور سچ بھی ہے، آرٹسٹ کا مذہب تو آرٹ ہی ہوتا ہے۔ اب کی مجھے خبر نہیں، یہ کوئی سترہ اٹھارہ سال اُدھر کی باتیں ہیں۔ اب تو زمین آسمان ہی بدل گئے تو بھلا ادب و شعر کی قدریں کیوں نہ بدلی ہوں گی؟ خیر کچھ ہو گا۔ یہ وقت اس بحث میں پڑنے کا نہیں۔

ہاں تو پہلے وقت تھے، اچھے لوگ تھے۔ اُن سے مل کر جی خوش ہوتا تھا، ایک بار ملے دوبارہ ملنے کی ہوس! اور سچ تو یہ ہے کہ ان میں سے بعض کے ساتھ برسوں یکجائی رہی اور جی نہیں بھرا۔ بلکہ ان سے بے ملے چین نہیں پڑتا تھا۔ بے غرض ملتے، جی کھول کر ملتے، اُجلی

طبیعتیں تھیں۔ بعض دفعہ بڑی ناگوار باتیں بھی ہو جاتیں مگر کیا مجال جو آنکھ پر ذرا بھی میل آ جائے۔ تم نے ہمیں کہہ لیا ہم نے تمہیں کہہ لیا۔ ایلو دل صاف ہو گئے۔ اچھے لوگوں میں یہی ہوتا ہے۔ زمانہ سدا ایک سا نہیں رہتا۔ جب تک بندھن بندھا ہوا ہے بندھا ہوا ہے۔ جب ٹوٹا ساری تیلیاں بکھر گئیں۔ جو دم گذر جائے غنیمت ہے۔ اب وہ دن جب بھی یاد آتے ہیں تو سینے پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے۔ یہی کیا کم عذاب تھا کہ ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ اب ان کی سُنائونی سننے کو کہاں سے پتھر کا دل لاؤں۔ بُڈھے مرے، اُنہیں تو مرنا ہی تھا۔ میر ناصر علی مرے، ناصر نذیر فراق مرے۔ میر باقر علی داستان گو مرے، علامہ راشد الخیری مرے، مولانا عنایت اللہ مرے، کس کس کو گناؤں! ایک ہو تو بتاؤں۔ انہوں نے اچھی گذاری اور عمرِ طبعی کو پہونچ کر مرے۔ مگر جوانوں کا مرنا قیامت ہے۔

ابیلا رفیقی، ہنس مکھ چغتائی، عجوبہ افسانہ نگار رفیق حسین، اب آخیر آخیر میں رومانی اختر اور اب پُراسرار میراجی! ہائے کیسا کڑیل جوان تھا یہ کیسے لوٹ گیا؟ ہو نہ ہو اسے تو زمانے کی نظر کھا گئی ؎

گر پیر نود سالہ بمیرد عجبے نیست!
این ماتم سخت است کہ گویند جواں مُرد

بمبئی سے خبر آئی ہے کہ میراجی کسی ہسپتال میں مر گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ بے کسی کی موت! ماں، باپ، بھائی بہن، دوست احباب، سب کے ہوتے ساتے پردیس میں بے کسی کی موت! ؎

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

لیکن نہیں۔ میں تو جذبات کی رو میں بہہ گیا۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو تعجب ہوتا۔ جو یوں نہ ہوتا تو میراجی کی عظمت میں فرق آ جاتا۔ اس کی عظیم شخصیت کا ایسا ہی عبرتناک انجام ہونا چاہئے تھا۔ عبرتناک اُس کے لئے نہیں ہمارے لئے۔ زمانے کی یہی ریت ہے۔

رونا اس کا ہے کہ وہ عظیم شاعر، وہ عظیم نقّاد، وہ عظیم حسن کار اب ہم میں نہیں ہے۔ اب وہ وہاں ہے جہاں ہماری آرزوئیں رہتی ہیں ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

موت نے اُسے کس قدر پیارا بنا دیا ہے

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

سن تو ٹھیک یاد نہیں، ہاں پندرہ سولہ سال اُدھر کی بات ہے میں حسبِ معمول لاہور گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ "نیرنگِ خیال" گر رہا تھا اور "ادبی دنیا" اُبھر رہا تھا۔ کرشن چندر، اور راجندر سنگھ بیدی خوب خوب لکھ رہے تھے۔ صلاح الدین احمد اور میراجی کی ادارت میں "ادبی دنیا" اس نفاست سے نکل رہا تھا کہ دیکھنے دکھانے کی چیز ہوتا تھا۔ میراجی کی شاعری سے مجھے کچھ دلچسپی تو نہیں تھی مگر ایک عجوبہ چیز سمجھ کر میں اسے پڑھ ضرور لیتا تھا۔ اُسے سمجھنے کی اہلیت نہ تو اُس وقت تھی اور نہ اب ہے۔ اس کے مختصر سے مختصر اور طویل سے طویل مصرعے خواہ مخواہ جاذبِ نظر ہوتے تھے۔ چھوٹے سے چھوٹا مصرعہ ایک لفظ کا اور بڑے سے بڑا مصرعہ اتنا کہ "ادبی دنیا" کے جہازی سائز کی ایک پوری سطر سے نکل کر دوسری سطر کا بھی آدھا پونا حصہ دبا لیتا تھا۔ خیر تو مطلب وطلب تو خاک سمجھ میں آتا نہ تھا۔ البتہ میراجی کی نظم میں وہی کشش ہوتی تھی جو ایک معمّے میں ہوتی ہے مگر ان کی نثر میں بلا کی دل کشی ہوتی تھی۔ مشرق کے شاعروں اور مغرب کے شاعروں پر انہوں نے سلسلے وار کئی مضامین لکھے تھے اور سب کے سب ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر۔ اس کے علاوہ ادبی جائزے میں جس دقتِ نظر سے میراجی کام لیتے بہت کم سخن فہم اس حد کو پہونچتے۔ ہاں تو میں لاہور گیا تو مال روڈ پر "ادبی دنیا" کے دفتر بھی گیا۔ کمرے میں داخل ہوا تو صلاح الدین احمد نظر نہیں آئے۔ سامنے ایک عجیب وضع کا انسان بیٹھا تھا۔ زلفیں چھوٹی ہوئیں کھلی

پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں، سُتواں ناک، موزوں دہانہ، کترواں مونچھیں، مُنڈی ہوئی ڈاڑھی، ٹھوڑی سے عزم ٹپکتا تھا۔ نظریں بنفشی شعاعوں کی طرح آر پار ہو جانے والی۔ خاصی اچھی صورت شکل تھی، بگڑ نہ جانے کیا بات تھی کہ موانست کی بجائے رمیدگی کا احساس ہوا۔ گرمیوں میں گرم کوٹ! خیال آیا کہ شاید گرم چائے کی طرح گرم کوٹ بھی گرمیوں میں ٹھنڈک پہونچاتا ہو گا۔ دل نے کہا ہو نہ ہو میراجی ہو۔ یہ تو اس شخص کی شاعری ہی سے ظاہر تھا کہ غیر معمولی انسان ہو گا۔ پوچھا "صلاح الدین احمد صاحب کہاں ہیں؟" بولے "کہیں گئے ہوئے ہیں۔" پوچھا "آپ میراجی ہیں؟" بولے "جی ہاں۔" میں نے اپنا نام بتایا۔ تپاک سے ملے۔ کچھ دیر اُن سے رسمی سی باتیں ہوئیں۔ اُن کے بولنے کا انداز ایسا تھا جیسے خفا ہو رہے ہوں۔ نپے تُلے فقرے ایک خاص لہجے میں بولتے اور چُپکے ہو جاتے۔ زیادہ بات کرنے کے وہ قائل نہ تھے، اور نہ انہیں تکلّف کی گفتگو آتی تھی۔ پہلا اثر یہ ہوا کہ یہ شخص اکھل کھرا ہے، دماغ چوٹتا ہے۔ مختصر سی بات چیت کے بعد اجازت چاہی۔ باہر نکلے تو میرے ساتھی نے کہا "ارے میاں یہ تو ڈاکو معلوم ہوتا ہے۔ اس نے ضرور کوئی خون کیا ہے۔ دیکھا نہیں تم نے؟ اس کی آنکھیں کیسی تھیں؟" میں نے کہا "یہ تو اللہ ہی کو معلوم ہے کہ وہ کیا ہے۔ مگر آدمی اپنی وضع کا ایک ہے۔"

تھوڑے ہی عرصہ بعد اُن سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ اب کے دلّی میں۔ ریڈیو پر وہ تقریر کرنے آئے تھے۔ مجھ سے ملنے میرے گھر آئے۔ جب گئے تو بہت کچھ پہلا اثر زائل کر گئے۔ آدمی تو برا نہیں ہے۔ دماغ چوٹتا بھی نہیں ہے ورنہ ملنے کیوں آتا؟ پھر ایک دفعہ آئے اور بولے کہ "ریڈیو میں ملازمت کے لئے بُلایا ہے۔" مجھے کچھ تعجب سا ہوا کہ یہ شخص ریڈیو میں کیا کرے گا؟ بہرحال معلوم ہوا کہ گیت لکھیں گے اور نثر کی چیزیں بھی۔ تنخواہ ڈیڑھ سو ملے گی۔ میں نے کہا "تنخواہ کم ہے۔ ادبی دُنیا میں آپ کو کیا ملتا تھا؟" بولے "تیس روپے۔" میں نے حیرت سے کہا "بس!" کہنے لگے "مولانا سے دوستانہ تعلقات تھے۔" میں نے کہا "تو ٹھیک ہے۔"

حسابِ دوستاں دردل۔" معلوم ہوا کہ بیوی بچّے تو ہیں نہیں کیونکہ شادی ہی نہیں کی۔ اپنے خرچے بھر کو ڈیڑھ سو روپے بہت تھے۔ چنانچہ میراجی ریڈیو میں نوکر ہوگئے اور ان سے اکثر ملاقات ہونے لگی اور اُن کی نظمیں اور مضامین ساقی میں چھپنے لگے۔ ریڈیو میں اس وقت اچھے اچھے ادیب اور شاعر جمع ہوگئے تھے۔ ن۔ م۔ راشد۔ کرشن چندر، منٹو، چراغ حسن حسرت۔ اوپندر ناتھ اشک، انصار ناصری، میراجی۔ اختر الایمان وغیرہ سب خوب لکھ رہے تھے۔ اور دلّی ریڈیو کا طوطی بول رہا تھا۔ راشد صاحب کے مشورے سے میراجی نے دو ایک سوٹ بھی سلوائے تھے مگر اُنہیں کپڑے پہننے کا کبھی سلیقہ نہ آیا۔ عجیب اُو لو اُو لو معلوم ہوتے تھے۔ مارے باندھے سے کہیں کپڑے پہنے جاتے ہیں؟ کچھ مدت بعد میراجی پھر اپنی پُرانی دھج پر آگئے۔ نہایت موٹے اور بھدّے ٹّو کا اچکن نما کوٹ اور اُسی کا پتلون، جاڑا، گرمی، سب میں یہی گرم لباس چلتا تھا۔

ریڈیو کے مسودات لکھنے میں میراجی کو کافی مہارت ہوگئی تھی اور حسبِ ضرورت بے تکلف لکھ لیتے تھے۔ گیت ریڈیو ہی میں آکر لکھے اور اتنے کہ اُن کا مجموعہ "گیت ہی گیت" کے نام سے شائع ہوا۔ نثر میں بھی صاحبِ طرز تھے۔ اندازِ فکر فلسفیانہ اور طرزِ بیان انشا پردازانہ تھا۔ نظمیں جب کہنے پر آتے تھے تو کئی کئی کہہ لیتے تھے۔ مگر خدا جانے کب کہتے تھے اور کس کیفیت میں کہتے تھے۔ چند نظمیں خود اُن سے سمجھیں تو سمجھ میں آئیں اور بعض خود اُن کی سمجھ میں بھی نہیں آئیں۔ غزلیں بھی کہی ہیں اور بہت سُتھری۔

فی البدیہہ بھی کہتے تھے۔ اشعار کے معاملے میں میرا حافظہ کمزور ہے۔ صرف ایک مصرعہ اُن کا چپک کر رہ گیا، وہ بھی اپنے عجوبے کی وجہ سے۔ اور کچھ نہیں تو اس سے ان کی حاضر دماغی اور قادر الکلامی ضرور ظاہر ہوتی ہے۔ ہم چند دوست چائے پینے کسی ہوٹل میں داخل ہوئے۔ ایک صاحب نے چائے پینے سے انکار کر دیا یہ کہہ کر کہ اتنی تو گرمی پڑ رہی ہے۔ دوسرے صاحب بولے "گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہونچاتی ہے۔ پھر چائے والوں کے مقولوں

پر بات چل نکلی۔ کسی نے کہا "اگر اشعار میں مقولے باندھے جائیں تو بہتر" دوسرے بولے اشعار میں بھی ہیں مثلاً ؎

ایک پیسہ ماں سے لو + آنی چائے باپ کو دو
یا ؎ یہ شخص اور اس کا بھائی + پیتے ہیں روزانہ چائے

بھائی کے قافیے چائے پر سب سر دُھننے لگے۔ پھر کسی نے کہا "گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہونچاتی ہے" بھی دراصل چائے والوں کا مصرعہ ہی ہوگا۔ کسی نے کہا یہ تو مصرعہ کسی طرح بن ہی نہیں سکتا۔ میراجی اب تک چُپکے بیٹھے تھے۔ بولے۔ مصرعہ تو بن سکتا ہے۔ ع

گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈ پہونچاتی ہے۔ ڈک

اس پر خوب قہقہہ پڑا۔ واقعی نہ تو کوئی لفظ بڑھا اور نہ گھٹا۔ ہلدی لگی نہ پھٹکری رنگ چوکھا آگیا۔

میراجی مشاعروں اور محفلوں میں نہیں جاتے تھے۔ یوں بھی وہ بہت کم آمیز تھے اور بڑے آدمیوں سے ملنا تو عار سمجھتے تھے۔ بڑے آدمیوں کے بڑے پن کے وہ کبھی قائل نہیں ہوئے اور کسی سے مرعوب ہونا تو وہ جانتے ہی نہیں تھے۔ افسروں کے بارے میں وہ کہتے تھے کہ یہ دفتر میں تو افسر ہوتے ہی ہیں، دفتر کے باہر بھی افسری بنے رہنا چاہتے ہیں۔ دفتر کے ہوٹل تک میں ان کی کُرسیاں مخصوص ہیں۔ بخاری کی کُرسی پر بیٹھنا سوءِ ادب ہے۔ ادبی مجلسوں میں صدر مقام ان کے لئے خالی رکھے جاتے ہیں۔ افسر ہر جگہ افسر بنا رہتا ہے۔ آدمی کبھی نہیں بنتا۔

میراجی کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ سُنا ہے کہ لاہور کی دیال سنگھ لائبریری وہ چاٹ چکے تھے۔ دلّی آکر اُن کے مطالعہ کا شوق غرقِ مئے ناب ہوگیا تھا۔ نثر کی کتابوں میں الف لیلہ کے عاشق تھے۔ اردو صحیح بولتے تھے اور صحیح لکھتے تھے۔ غلطی کی پچ کبھی نہ

کرتے تھے۔ عروض سے خوب واقف تھے اور جملہ اصنافِ شعر پر حاوی۔ ایک دفعہ ایک اسٹیشن ڈائریکٹر نے ان کے کسی مصرعہ پر اعتراض کیا کہ ناموزوں ہے۔ اُسے تو تقطیع کر کے بتا دیا کہ ناموزوں نہیں ہے، باہر نکل کر کئی دن تک اسے گالیاں دیتے رہے کہ یہ اپنے آپ کو افسر تو سمجھتا ہی ہے شاعر بھی سمجھنے لگا۔ میراجی میں چاپلوسی کی عادت بالکل نہیں تھی۔ اور افسروں کا آگا تاگا لینا بھی وہ سخت معیوب سمجھتے تھے۔ افسروں میں راشد کے بہت گرویدہ اور مداح تھے یا پھر محمود نظامی کے۔ راشد نے میراجی کو بہت نبھایا۔ اس وقت بھی جب کہ مجھ سمیت سب نے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

شراب کی لت خدا جانے میراجی کو کہاں سے لگی؟ جب لاہور میں اُنہیں تیس روپے ملتے تھے تب بھی وہ پیتے تھے۔ اور جب دلی آئے اور پانچ گنی تنخواہ ملی تو اور زیادہ پینے لگے۔ پہلے رات کو پیتے تھے، پھر دن کو بھی پینے لگے، پھر ہر وقت پینے لگے۔ سوڈا یا پانی ملانے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ یونہی بوتل سے منہ لگا کر غٹاغٹ چڑھا جاتے تھے۔ جب ریڈیو اسٹیشن پر آتے تو ایک ہاتھ میں کاپیاں اور کتابیں ہوتیں اور دوسرے میں اٹاچی کیس۔ اس میں بوتل رکھی رہتی تھی۔ ذرا دیر ہوئی اور کہیں جا کر پی آئے۔ اس شراب نے میراجی کو تباہ کر دیا اور اُن میں وہ تمام خرابیاں آ گئیں جو بالآخر اُن کی اخلاقی موت کا باعث بن گئیں۔ اِدھر تنخواہ ملی اور اُدھر قرض خواہوں اور شراب میں ختم۔ پھر ایک ایک سے اُدھار مانگا جا رہا ہے۔ میراجی کے قدردانوں نے اُنہیں سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہیں مانے اور گرتے ہی چلے گئے۔ پھر یہ نوبت آئی کہ قرض ملنا بند ہو گیا۔ انہوں نے اپنے مضامین اور نظموں کی کتابیں مرتب کر کر کے بیچنی شروع کیں۔ اس میں مجھ سے سابقہ پڑا۔ ایک کتاب لے لی، دو لے لیں، گھر پر ہر مہینے یا دوسرے مہینے ایک مجموعہ لے کر پہونچ جاتے۔ میں انکار کرتا اور وہ اصرار۔ میں انہیں سمجھاتا کہ "میراجی میں آپ کی کتابیں نہیں چھاپ سکتا، میرے پاس بیسیوں مسودے خریدے ہوئے رکھے ہیں، اُن کے چھپنے

کی نوبت بھی نہیں آتی، کاغذ نایاب ہے۔ مگر وہ کچھ ایسے بہانے تراشتے کہ مجھے مجبوراً اُن سے مسودہ خریدنا پڑتا۔ کبھی باپ کی بیماری کی خبر سُناتے، کبھی بھائی کی تعلیم کی مجبوری بیان کرتے، کبھی کہتے والدہ کی آنکھیں جاتی رہیں، آپریشن ہو گا۔ میں انکار کرتا تو اتنے ہراساں ہوتے کہ اُن پر ترس آنے لگتا۔ کئی دفعہ اُنہیں یہ بھی سمجھایا کہ میراجی آپ اپنے مسودے مجھے سستے دے جاتے ہیں۔ آپ کسی اور کو دیجئے۔ تو روپے بھی زیادہ ملیں گے مگر اُنہیں ضد تھی کہ میں کسی اور کو اپنی کتاب نہیں دوں گا۔ میں نے اُن سے ایک ایک کر کے آٹھ مسودے لئے جن میں سے صرف تین شائع ہو سکے۔ باقی دلّی بُرد ہوئے۔ آخری قسط جب انہوں نے روپوں کی مجھ سے مانگی تو میں نے پوچھا اب کون سا مسودہ باقی رہ گیا۔ کہنے لگے "باتیں" جو ساقی میں لکھ رہا ہوں، یہ بھی کبھی ایک کتاب ہو جائے گی"۔ بہت حیل حجت کے بعد میں نے اُنہیں اس شرط پر روپے دیئے کہ آئندہ وہ مجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگیں گے۔ مگر اس کے بعد پھر انہیں روپے کی ضرورت ہوئی تو میں نے صاف انکار کر دیا اور انہیں کچھ سخت سُست بھی کہا۔ بہت افسردہ اور نادم ہوئے۔ کہنے لگے "الف لیلہ" کا ایک نایاب نسخہ بیس جلدوں میں بِک رہا ہے۔ ایک نا قدرے کا دادا مر گیا ہے۔ کُتب خانے کی کتابیں اونے پونے بیچ رہا ہے، آپ ایسا کیجئے کہ وہ جلدیں اپنے پاس گروی رکھ لیجئے اور ڈیڑھ سو روپے مجھے دے دیجئے۔ میں آپ کو روپے دے کر کتابیں آئندہ چھُڑا لوں گا"۔ میں نے کہا یک نہ شُد دو شُد۔ بھائی میں گروی گانٹھا نہیں کرتا مجھے تو تم معاف ہی کرو۔ کیوں رہی سہی دوستی پر پانی پھیرتے ہو، میں تمہارا کتنا بڑا قدردان ہوں۔ اب مجھے اس پر تو مجبور نہ کرو کہ مجھے تم سے نفرت ہو جائے"۔ یہ بات کچھ اُن کی سمجھ میں آ گئی اور وہ خاموش چلے گئے۔ بس اس کے بعد میراجی نے مجھ سے کچھ نہیں مانگا اور نہ کوئی اور مسودہ لے کر میرے پاس آئے۔ ویسے اُن سے جب تک وہ دلّی میں رہے برابر ملنا جلنا ہوتا رہا۔ اور اکثر گھر بھی آ جاتے تھے۔

کتابوں کی قیمت کے بارے میں اُن کی ایک خاص مت تھی۔ مثلاً میں نے کہا یہ کتاب تو بہت چھوٹی ہے اس کے میں دو سو روپے سے زیادہ نہیں دوں گا تو وہ کہتے "دو سو بالکل ٹھیک رقم ہے۔ بائیس روپے دو آنے اور دو پائی اور بڑھا دیجئے تاکہ رقم ہموار ہو جائے۔ یعنی دو سو بائیس روپے دو آنے، دو پائی" اسی طرح اُن کی سب کتابوں کی قیمتیں تجویز کی گئی تھیں۔ 333/3/3 - 444/4/4 - 555/5/5 روپے اور "اجنتے کے غار" جو ان کی نظموں کا دوسرا مجموعہ تھا اس کی قیمت 666/6/6 روپے دی گئی تھی۔

میراجی بڑے گندے آدمی تھے۔ وہ اُن میں سے تھے جو کہتے ہیں کہ یا نہلائے دائی یا نہلائیں چار بھائی۔ انہیں کبھی کسی نے نہاتے نہیں دیکھا، بلکہ مُنہ دھوتے بھی نہیں دیکھا۔ بال کٹوانے کے بڑے چور تھے۔ وحشیوں کی طرح ہمیشہ بڑھے رہتے۔ اور اُن میں کبھی تیل نہ ڈالتے اور نہ اُنہیں بناتے۔ جب دلی آئے تھے تو مونچھیں بھی مونڈ ڈالی تھیں۔ ایک دفعہ جانے دل میں کیا سمائی کہ چار ابرو کا صفایا کر کے گلے میں سادھوؤں کی سی کنٹھی بھی ڈال لی تھی۔ ہمیشہ سنجیدہ صورت بنائے رہتے تھے، اُنہیں قہقہہ مار کر ہنستے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ باتیں اکثر ہنسنے ہنسانے کی کرتے مگر خود کبھی نہ ہنستے تھے۔ بہت خوش ہوئے تو خندۂ دنداں نما فرمایا۔ ان کے گھنلے پن سے بڑی گھن آتی تھی۔ مگر یہ اُن گھناؤنی چیزوں میں سے تھے جنہیں اپنے سے دُور نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی قلندرانہ اور حرکتیں مجذوبانہ۔ دو چار آدمیوں نے مل کر ایک کمرہ کہیں باڑے کی طرف لے رکھا تھا مگر رات کو اگر کہیں گھاس میں پڑ رہے تو وہیں سو گئے اور اگر پٹری پر لیٹ گئے تو وہیں صبح ہو گئی۔ ایک دو دن نہیں برسوں یہی حال رہا۔

شراب کے نشے میں میراجی کو رونے کی دُھن سوار ہو جاتی تھی اور وہ ایسے بے سُدھ ہو جاتے کہ تن بدن کا بھی ہوش نہ رہتا۔ ایک دن ہم موری دروازے کے پُل پر سے

آ رہے تھے۔ جب نہر سعادت خاں کے سینما کے آگے پہنچے تو دیکھا کہ ایک مجمع سڑک پر لگ رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک آدمی ڈاڑھیں مار کر رو رہا ہے۔ اور دو ایک اُسے سڑک پر سے اُٹھا رہے ہیں۔ ہم نے سوچا کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ بچارے کے سخت چوٹ آئی ہے، اسے فوراً ہسپتال بھیجنا چاہیے۔ اتنے میں اخلاق نے گھبرا کر کہا "بھائی شاہد! یہ تو میراجی ہیں!" اور میراجی سڑک پر پڑے رو رہے تھے اور بڑبڑا بھی رہے تھے مگر زبان قابو میں نہیں تھی کہ بات سمجھ میں آتی۔ ایک صاحب جو انہیں اُٹھانے کی کوشش کر رہے تھے وہ بھی جاننے والے ہی تھے۔ ہمیں دیکھ کر اُن کی جان میں جان آئی۔ جھٹ ایک تانگہ منگا کر سب نے اُٹھا کر میراجی کو تانگے میں ڈالا مگر وہ پھسل کر پھر نیچے آ رہے۔ دوبارہ اُنہیں آگے کی سیٹ پر ڈالا اور اخلاق کو ساتھ بھیجا کہ اُن کے گھر پہنچا کر آئے۔ اگلے دن اخلاق نے بتایا کہ میراجی اپنی اماں کے لئے رو رہے تھے۔

یہ اخلاق احمد ریڈیو اناؤنسر تھے اور میراجی کے بڑے مداح۔ میراجی نے اپنی ایک کتاب بھی ان کے نام معنون کی ہے۔ دونوں میں بہت اخلاص تھا۔

ایک دن اُن کے چند دوست انہیں گھیر گھار کر ایک نستعلیق طوائف کے کمرے پر لے گئے۔ وہاں کچھ گانا سُنا، کچھ شراب پی اور بہکنے لگے۔ زینے سے اُتر کر سڑک پر آئے تو حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ سڑک پر لوٹنا اور چیخیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔ نظموں کا دوسرا ضخیم مجموعہ مسودے کی شکل میں ان کے پاس تھا اُسے اس بُری طرح اچھالا کہ رات کے اندھیرے میں اس کا ایک ورق بھی کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ دوستوں نے جو اُن کی یہ حالت دیکھی تو گھبرا گئے۔ لاکھ اُنہیں چمکارا پچکارا مگر وہ اپنے اوسانوں میں نہ آئے۔ اتنے ہی میں پولیس کے چند آدمی گشت کرتے آ گئے۔ دوست بچارے سب غتر بود ہو گئے کہ اب آوارہ گردی میں سب کے سب بند ہوتے ہیں۔ بھلا رات کے بارہ بجے اس بدنام بازار میں اور اس حالت میں دیکھ کر کون چھوڑے گا؟ مگر اخلاق احمد کے حواس قائم رہے۔ ہمت مردانہ تو اُن کی بھی

جواب دے چکی تھی۔ مگر جب پولیس والوں نے ٹوکا تو اُس نے جرأتِ رندانہ سے کام لیکر کہا۔ "بچارے کی ماں مرگئی ہے۔" یہ کہہ کر میراجی کو سمجھانے لگا کہ "ماں باپ سدا کسی کے جیتے نہیں رہتے۔ صبر کرو صبر۔ چلو اٹھو۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔ ارے بھئی تم تو بڑے بودے نکلے۔ بچّوں کی طرح رو رہے ہو۔ چلو اٹھو۔ گھر چلو۔ اور ہاں سنتری جی کوئی تانگہ ملے تو ادھر بھیج دینا۔" خدا خدا کرکے آئی بلا ٹلی اور سب کی جان میں جان آئی۔ نظموں کے دوسرے مجموعے کے ساتھ اُس مہینے کی تنخواہ کا تقاضا بھی میراجی اُسی بازار میں اُچھال آئے۔ چلو۔

جان بچی لاکھوں پائے ✦ خیر سے بُدھو گھر کو آئے

صبح انہیں کچھ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ رات کو اپنی جان پر اور دوستوں پر کیا مصیبت توڑ چکے ہیں۔

ایک دن ریڈیو اسٹیشن پر میراجی کو دیکھا کہ جگہ جگہ سے اُن کا منہ سُوجا ہوا ہے اور سارے چہرے پر زخم اور ٹُینٹے لگے ہوئے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔ "میراجی کیا کہیں گر پڑے۔" بولے "نہیں، مجھے مارا ہے۔" "آپ کو کیوں مارا؟ آپ تو لڑنا جانتے ہی نہیں۔" کہنے لگے "مجھے سوتے میں مارا ہے اُسنے۔" "کس نے؟" "میرا شبہ ہے ایک آدمی پر۔" اور آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ اُس بیہوش آدمی کو کس ملعون نے مارا تھا! میراجی کو زیادہ جاننے والوں میں سے بعض یہ بھی کہتے تھے کہ اسنے خود نشے میں اپنے آپ کو مارا ہے۔ واللہ عالم بالصواب!

میراجی پُراسراریت اور حیرت کے قائل تھے۔ اُن کی شخصیت بھی اُن کی شاعری کی طرح پُراسرار تھی۔ وضع قطع، لباس اور باتوں سے تو وہ پُراسرار نظر ہی آتے تھے وہ حرکتیں بھی کچھ ایسی کرتے تھے کہ لوگ اُنہیں حیرت سے دیکھیں۔ مثلاً ایک زمانے میں مرغی کے انڈے کے برابر لوہے کا گولا ہاتھ میں ہر وقت رکھتے تھے اور کوئی پوچھتا تھا کہ یہ کیا ہے تو کچھ نہ بتاتے تھے۔ پھر ایک کے دو گولے ہو گئے تھے اور یہ خاصہ ڈیڑھ پاؤ کا بوجھ خواہ مخواہ اُٹھائے پھرتے تھے۔ اسکے بعد ان گولوں پر سگریٹ کی پنّی چڑھائی جاتی تھی۔ لکھنؤ میں جب ہم

نے اُنہیں آخری بار راشد صاحب کے ہاں دیکھا تو گولے اُن کے پاس نہیں تھے۔

کھانے میں میٹھا اور نمکین ملا کر کھاتے تھے اور دیکھنے والے چہ میگوئیاں کرتے تھے۔ بعض جو انہیں جانتے تھے اُنہیں "باؤلا" کہتے تھے۔ منٹو انہیں فراڈ کہتا تھا۔

آواز بہت عمدہ اور بھاری پائی تھی۔ ریڈیو پر اکثر ڈراموں میں بولتے تھے۔ پنجاب کے رہنے والے تھے مگر اُن کی زبان یا ان کا لہجہ چغلی نہیں کھاتا تھا۔ انگریزی کی استعداد اعلیٰ درجے کی تھی مگر جہاں تک ممکن ہوتا بولنے سے گریز کرتے۔ موسیقی سے دلچسپی تھی۔ راگ جے جے وتی سُنتے تو وجد طاری ہو جاتا اور سر پھوڑنے لگتے۔ سمجھتے خاک نہ تھے۔

مذہب سے میراجی کو کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ہندو صنمیات سے اُنہیں شغف تھا۔ اسی کا رچا بچا تصور اُن کی شاعری میں بھی جھلکتا ہے۔ بس مسلمان اس لئے تھے کہ ایک مسلمان کے ہاں پیدا ہو گئے تھے۔ جو شخص اخلاقی ضابطوں کی پابندی کرنا بھی ضروری نہ سمجھتا ہو وہ بھلا مذہبی قید و بند کو کیسے گوارا کر لیتا؟ میراجی کے تو دل اور دماغ دونوں ہی کافر تھے۔

میراجی جنسی اعتبار سے ایک گنجلک تھے۔ ابتداً اُنہیں عورتوں سے رغبت تھی۔ اور یہ کوئی ہندو لڑکی "میرا" ہی تھی جس کی ناکام محبت میں اپنا نام انہوں نے "میراجی" رکھا تھا۔ ورنہ اصلی نام تو اُن کا ثناء اللہ تھا۔ خدا جانے استمنا بالید کا اُنہیں چسکا کہانسے لگا کہ جیتے جی نہ چھوٹا اور اُنہیں کسی جوگا نہیں رکھا۔ وہ اسے فخریہ بیان کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس کی بدولت میری سب تمنائیں پوری ہو جاتی ہیں۔ آپ ایک ایک کا منہ تکتے ہیں اور دل میں حسرت لئے رہ جاتے ہیں۔ میں کسی کو دیکھتا ہوں تو اُس کا لُطف بھی حاصل کر لیتا ہوں۔ ایک دن اپنے ایک ہم مذاق سے تعارف کرایا تو یہ کہہ کر کہ "یہ بھی دستکار ہیں۔" ان سے جب کہا گیا کہ یہ تو بڑی غلط چیز ہے تو جواب ملا کہ میں سائنٹفک طریقے کا دستکار ہوں۔ اس میں کوئی نقصان نہیں پہونچتا۔ اور دستکاری میں اُنہیں اتنا غلو تھا کہ قیدِ مقام سے بھی گذر چکے تھے۔ اُن کے پتلون کی بائیں جیب تو بنی ہوئی تھی مگر جیب کا کپڑا غائب تھا۔

میرا جی کی سیرت میں بیسیوں خرابیاں آ گئی تھیں لیکن طبعاً وہ ایک شریف انسان تھے۔ دوستوں کے لئے دامے، درمے، قدمے، ہر طرح خدمت کرنے کو تیار رہتے تھے۔ دانشوروں کے ایک خاص حلقے میں ایک صاحب نے ایک مضمون پڑھا جو پوری اردو شاعری پر حاوی تھا۔ اس مضمون کی بہت تعریف ہوئی۔ اچنبھے کی بات یہ تھی کہ صاحبِ مضمون یوں تو پڑھے لکھے تھے لیکن انہیں ادب و شعر کا کوئی خاص ذوق نہیں تھا۔ ہمارا ماتھا وہیں ٹھنکا تھا کہ یہ مضمون ان کا نہیں ہو سکتا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ مضمون میرا جی کا لکھا ہوا تھا۔ شروع شروع میں جب اُن کی شراب نہیں بڑھی تھی وہ روپے پیسے سے بھی بعض دوستوں کی مدد کرتے تھے۔ تنخواہ میں سے کچھ پس انداز کر کے اپنے والد اور چھوٹے بھائی کو بھی کچھ بھیجا کرتے تھے، اور یہ چھوٹے بھائی وہی صاحب تھے جنہوں نے میرا جی کی تمام نظمیں چند پیسوں میں بیچ ڈالی تھیں۔ ہوا یہ کہ انہوں نے سارے گھر کی ردّی کسی پھیری والے کے ہاتھ دو تین آنے سیر کے حساب سے بیچی اور اس میں میرا جی کی وہ دو ضخیم کاپیاں بھی تول دیں جن میں اُن کی نظمیں لکھی ہوئی تھیں۔ میرا جی نے لاہور کے تمام ردّی بیچنے والے چھان ڈالے مگر وہ مجموعے نہ ملنے تھے نہ ملے۔ اس کا انہیں بے حد رنج پہونچا، اتنا کہ انہوں نے اپنا گھر اور اپنے عزیزوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ جس گھر میں اُن کے ہُنر کی یہ توقیر ہو وہ وہاں کیسے رہ سکتے تھے اور جن کے ہاتھوں اُن کے حاصلِ عمر کا یہ حشر ہو بھلا وہ اُن سے ملنا کیسے گوارہ کر سکتے تھے! گھر تو گھر انہوں نے لاہور ایسا چھوڑا کہ پھر کبھی اُدھر کا رُخ نہیں کیا۔

میرا جی کو میں نے کبھی کسی سے بدزبانی کرتے نہیں دیکھا۔ وہ تو کسی سے مذاق تک نہیں کرتے تھے۔ اُن کا رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ کیا مجال جو کوئی اُن سے ناشائستہ بات کر لے۔ ادب آداب ہمیشہ ملحوظ رکھتے۔ اُن کی بھونڈی وضع قطع پر بے تکلّف دوست پھبتیاں کستے مگر وہ صرف مُسکرا کر رہ جاتے اور کبھی اُلٹ کر کوئی سخت جواب نہ دیتے۔ اس سے یہ ہوتا کہ معترض خود شرمندہ ہو جاتا۔

عجیب بات میرا جی میں یہ تھی کہ اُن کی جملہ خرابیوں کے باوجود سب اُن کی عزت کرتے تھے۔ انہیں دیکھ کر اندر سے دل کہتا تھا کہ یہ ایک عظیم انسان ہے اور عزت و احترام کا مستحق۔ نہ جانے اُس شخص میں کیا بات تھی کہ اتنی نفرت انگیزیوں کے باوجود دل اُس کی طرف کھنچتا تھا۔ ایسی مقناطیسی شخصیت کا انسان میں نے کوئی اور نہیں دیکھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اُن کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ انہوں نے کبھی اپنے عیبوں کو نہیں چھپایا اور نہ کبھی اپنی خوبیوں کو سراہا۔ ریاکاری اُن میں نام کو نہیں تھی۔ اُن کے لئے خلوت اور جلوت دونوں ایک تھے۔ اخلاقی قدریں اضافی تو ہوتی ہی ہیں، ان کے نزدیک مروّجہ اخلاق کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ بلکہ وہ انہیں بُرا سمجھتے تھے اور ان کی تحقیر کرتے تھے۔ یا شاید انہوں نے انتقاماً ظاہر کو تج دیا تھا اور اُن کا باطن ہی ظاہر بن گیا تھا۔ اور شاید یہی اُن کی عظیم شخصیت کا راز ہو!

منٹو

دبلا ڈیل، سوکھے ہاتھ پاؤں، میانہ قد، چمپئی رنگ، بے قرار آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک، کریم کلر کا سوٹ، سُرخ چمپاتی ٹائی، ایک دھان پان سا نوجوان مجھ سے ملنے آیا۔ یہ کوئی چوبیس پچیس سال اُدھر کا ذکر ہے۔ بڑا بے تکلف، تیز، طرار، چرب زبان۔ بولا۔
— "میں منٹو ہوں، سعادت حسن۔ آپ نے ہمایوں کا روسی ادب نمبر دیکھا ہوگا۔ اب میں ساقی کا فرانسیسی ادب نمبر نکالنا چاہتا ہوں۔"

پہلی ہی مُلاقات میں اُس کی یہ ضرورت سے بڑھی ہوئی بے تکلفی طبیعت کو کچھ ناگوار گزری۔ میں نے اُس کا پانی اُتارنے کے لئے پوچھا: "آپ کو فرانسیسی آتی ہے؟"

بولا: "نہیں!"

میں نے کہا: "تو پھر آپ کیا کرسکیں گے؟"

منٹو نے کہا: "انگریزی سے ترجمہ کر کے میں آپ کا یہ خاص نمبر ایڈیٹ کروں گا۔"

میں نے کہا: "اپنا پرچہ تو میں خود ہی ایڈیٹ کرتا ہوں۔ پھر ساقی کے چار خاص نمبر مقرر ہیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی نمبر فی الحال شائع نہیں ہوسکتا۔"

منٹو نے دال گلتی نہ دیکھی تو فوراً اس موضوع ہی کو ٹال گیا۔ اور رخصت ہونے سے پہلے مجھ پر واضح کر گیا کہ اگر کسی مضمون کی ضرورت ہو تو معاوضہ بھیج کر اُس سے منگایا جاسکتا ہے۔

اس زمانے میں منٹو ترجمے ہی کیا کرتا تھا۔ اُس کی کتاب "سرگزشتِ اسیر" چھپ کر آئی تھی۔ منٹو سے کبھی کبھی خط و کتابت ہوتی رہی۔ اور اُس کے چند مضامین ساقی میں چھپے بھی، مگر قلبی تعلقات اُس سے قائم نہ ہوسکے۔ مجھے یہی گمان رہا کہ یہ شخص بہت بہکا ہوا ہے، نخچی خورا اور چھچھورا سا آدمی ہے۔ اس میں "میں" سماگئی ہے۔ زمانے کی چھُری تلے آئے گا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔

معلوم ہوا کہ بڑا کٹر کمیونسٹ ہے اور مُسلم یونیورسٹی سے اسے یہ کہہ کر نکال دیا گیا ہے کہ تم کو دق ہے۔ علی گڑھ سے نکالے جانے کے بعد وہ اپنے گھر امرت سر چلا گیا۔ گھر والے بھی اس کے باغیانہ خیالات سے نالاں تھے اس لئے اُن سے بھی بگاڑ ہوگیا تھا، امرت سر میں اپنے چند ہم خیال دوستوں کے ساتھ اس نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ان کے لیڈر "کمپنی کی حکومت" والے باری (علیگ) تھے۔ مگر یہ سب لوگ تو کچھ دبے دبے سے رہے، اس لئے حکومت کی قید و بند سے بچے رہے۔ پھر باری رنگون چلے گئے۔ اور منٹو بمبئی جا کر اخبار "مصور" میں نوکر ہوگیا۔

کئی سال گزر گئے۔ منٹو سے ایک آدھ ملاقات اور ہوئی، مگر دل کی جواری اُن سے اب بھی نہ کھلی۔ جیسا اور بہت سے مضمون نگاروں سے تعلق تھا اُن سے بھی رہا۔ یہاں تک کہ پچھلی بڑی جنگ کے زمانے میں وہ دلّی ریڈیو میں آگئے۔ اور اب جو اُن سے پہلی ملاقات ہوئی تو انہوں نے چھُوٹتے ہی کہا۔

"اب میں آپ سے معاوضہ نہیں لوں گا۔"

میں نے پوچھا: "کیوں؟"

بولے "معاوضہ میں اس لئے لیتا تھا کہ مجھے پیسوں کی ضرورت رہتی تھی۔"

دلّی ریڈیو اسٹیشن پر جنگ کے زمانے میں ادیبوں اور شاعروں کا بڑا اچھا جمگھٹا ہوگیا تھا۔ احمد شاہ بخاری (پطرس) کنٹرولر تھے۔ خبروں کے شعبے میں چراغ حسن حسرت اور ڈاکٹر اختر حسین

رائے بہادری، پروگرام کے شعبے میں ن م۔ راشد۔ انصار ناصری، محمود نظامی اور کرشن چندر۔ ہندی کے مسودہ نویس اوپندر ناتھ اشک اور اردو کے منٹو اور میراجی تھے۔ اس زمانے میں منٹو کو بہت قریب سے دیکھنے کا مجھے موقع ملا۔

منٹو نے کچھ روپے جمع کر کے دو ٹائپ رائٹر خرید لئے، ایک انگریزی کا اور ایک اردو کا۔ اُردو کا ٹائپ رائٹر وہ اپنے ساتھ ریڈیو اسٹیشن روزانہ لاتے تھے۔ منٹو کے ذمے جتنا کام تھا اس سے وہ کہیں زیادہ کرنے کے خواہش مند رہتے تھے۔ روزانہ دو تین ڈرامے اور فیچر لکھ دیتے۔ لکھنا تو انہوں نے بالکل چھوڑ ہی دیا تھا، کاغذ ٹائپ رائٹر پر چڑھایا۔ اور کھٹا کھٹ ٹائپ کرتے چلے جاتے۔ فیچر لکھنا اس زمانے میں بڑا کمال سمجھا جاتا تھا، مگر منٹو کے لئے یہ بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ذرا سی دیر میں فیچر ٹائپ کر کے بڑی حقارت سے پھینک دیا جاتا کہ ——

"لو یہ رہا تمہارا فیچر!"

منٹو کی اس تیز رفتاری پر سب حیران ہوتے تھے۔ چیز بھی ایسی چچی تُلی ہوتی کہ کہیں انگلی دھرنے کی اُس میں گنجائش نہ ہوتی۔

دلّی آنے کے بعد منٹو کی افسانہ نگاری کا دَورِ جدید شروع ہوا۔ انہوں نے طبعزاد افسانے ایک اچھوتے انداز میں لکھنے شروع کئے۔ ساقی کے لئے ہر مہینے ایک افسانہ بغیر مانگے مل جاتا۔ "دھواں" اسی ریلے میں لکھا گیا، اور اس کی اشاعت پر دلّی کے پریس ایڈوائزر نے مجھے اپنے دفتر بلوایا۔ وہ پڑھا لکھا اور بھلا آدمی تھا۔ انگریزی ادبیات میں میرا ہم جماعت بھی رہ چکا تھا۔ بولا "بھائی، ذرا احتیاط رکھو۔ زمانہ بُرا ہے۔" بات آئی گئی ہوئی۔ میں نے منٹو سے اس کا ذکر کیا۔ حسبِ عادت بہت بگڑا۔ مگر ساقی کے باب میں کچھ احتیاط برتنے لگا۔

لیکن یہ ناسور دلّی میں بند ہوا تو لاہور میں پھوٹا اور "بُو" پر حکومتِ پنجاب نے منٹو کو دھر لیا۔ صفائی کے گواہوں میں منٹو نے مجھے بھی دلّی سے بلوایا تھا۔ عدالتِ ماتحت تو قائل

نہ ہو سکی۔ لیکن اپیل میں غالباً منٹو بری ہو گئے تھے۔ اس کے بعد رہا سہا خوف بھی منٹو کے دل سے نکل گیا، اور انہوں نے دھڑلے سے "فحش" مضامین لکھنے شروع کر دیئے۔ حکومتِ پنجاب کے پریس ایڈوائزر چودھری محمد حسین ایک عجیب و غریب بزرگ تھے۔ تھے تو علامہ اقبالؔ کے حاشیہ نشینوں میں سے۔ مگر انہیں یہ زعم تھا کہ اقبال کو اقبال میں نے بنایا ہے۔ یہ صاحب ہاتھ دھو کر منٹو کے پیچھے پڑ گئے۔ اور یکے بعد دیگرے انہوں نے منٹو پر کئی مقدمات قائم کرا دیئے۔ پھر اُن کا نشۂ اقتدار اتنا بڑھ گیا کہ انہوں نے مضمون نگاروں کے ساتھ ناشروں اور کتب فروشوں کو بھی لپیٹنا شروع کر دیا۔ مقدمات کے سلسلے میں منٹو کو بمبئی سے لاہور آنا پڑتا تھا۔ ادھر ہم بھی دلّی سے گواہوں کی برات لے کر پہنچتے تھے۔ چند روز لاہور کے ادبی حلقوں میں خاصی چہل پہل رہتی۔ شاید ایک آدھ ہی افسانے میں جرمانہ قائم رہا، ورنہ اپیل میں سب بری ہوتے رہے اور چودھری صاحب کلستے رہے۔ منٹو نے اپنے مقدمات کی رُوداد کسی کتاب کے دیباچے میں لکھی ہے اور اس کتاب کو چودھری صاحب ہی کے نام سے معنون کیا ہے۔

منٹو کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتی تھیں۔ انہیں ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ میں ہی سب سے اچھا لکھنے والا ہوں، اس لئے وہ اپنے آگے کسی کو گردانتے نہ تھے۔ ذرا کسی نے دُون کی لی اور منٹو نے اڑنگا لگایا۔ خرابیٔ صحت کی وجہ سے منٹو کی طبیعت کچھ چڑچڑی ہو گئی تھی۔ مزاج میں سہار بالکل نہیں رہی تھی۔ بات بات پر اَڑنے اور لڑنے لگتے تھے۔ جو لوگ اُن کے مزاج کو سمجھ گئے تھے وہ اُن سے بات کرنے میں احتیاط برتا کرتے تھے۔ اُن کا مرض بقول اُن کے کسی ڈاکٹر سے تشخیص نہ ہو سکا۔ کوئی کہتا دِق ہے۔ کوئی کہتا معدے کی خرابی ہے، کوئی کہتا جگر کا فعل کم ہو گیا ہے۔ اور ایک ستم ظریف نے کہا کہ تمہارا پیٹ چھوٹا ہے اور انتڑیاں بڑی ہیں۔ مگر منٹو ان سب بیماریوں سے بے پروا ہو کر ساری بدپرہیزیاں کرتا رہا۔

منٹو کی زبان پر "فراڈ" کا لفظ بہت چڑھا ہوا تھا ــ میراجی کے ہاتھ میں دو لوہے کے

گولے رہتے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا، اِن کا مصرف کیا ہے؟ منٹو نے کہا، فراڈ ہے — میراجی نے سیویوں کے مزعفر میں سالن ڈال کر کھانا شروع کر دیا۔ میں نے کہا، یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ منٹو نے کہا "فراڈ" — اوپندر ناتھ اشک نے کوئی چیز لکھی، منٹو نے کہا فراڈ ہے۔ اُس نے کچھ چیں چیں کی تو کہا "تو خود ایک فراڈ ہے۔"

یادش بخیر! ایک صاحب تھے دیوندر ستیارتھی۔ تھے کیا، اب بھی ہیں اور اردو اور ہندی کے بہت بڑے ادیب ہیں۔ لوک گیتوں پر انگریزی میں بھی ایک کتاب چھپوا چکے ہیں۔ اسی زمانے میں وہ دلّی آئے تو انہیں بھی افسانہ نگاری کا شوق چرّایا — خاصے جہاں دیدہ آدمی تھے مگر باتیں بڑی بھولی بھولی کرتے تھے۔ بھاری بھرکم۔ قد آور آدمی، چہرے پر بہت زبردست داڑھی۔ دراصل انہوں نے اپنی وضع قطع ٹیگور سے ملانے کی کوشش کی تھی۔ ٹیگور کے ساتھ انہوں نے ایک تصویر بھی کھنچوائی تھی جس کے نیچے لکھا ہوا تھا "گرو اور چیلا"۔ ایک طرف سفید بگلا استاد اور دوسری طرف کالا بھجنگ شاگرد۔

ہاں تو ستیارتھی صاحب نے افسانے لکھنے اور سنانے شروع کئے۔ ابتدا میں تو سب نے لحاظ مروّت میں چند افسانے سُنے پھر کنّی کاٹنے لگے۔ پھر انہیں دُور ہی سے دیکھ کر بھاگنے لگے۔ مگر منٹو بھاگنے والا آدمی نہیں تھا۔ منٹو نے ایک آدھ افسانہ تو سُنا۔ اس کے بعد ستیارتھی صاحب کو گالیوں پر دھر لیا۔ منٹو نے برملا کہنا شروع کر دیا "تو بہت بڑا فراڈ ہے۔ تیری داڑھی داڑھی نہیں ہے، پراپیگنڈا ہے۔ تو افسانے ہم سے ٹھیک کراتا ہے اور جا کر اپنے نام سے چھپوا لیتا ہے۔" اور اس کے بعد مغلّظات سنانا شروع کر دیں۔ مگر صاحب مجال ہے کہ ستیارتھی کی تیوری پر بل بھی آیا ہو! اُسی طرح مسکراتے اور بھولی بھالی باتیں کرتے رہے۔ میں کہتا تھا کہ اس شخص میں ولیوں کی سی صفات ہیں۔

منٹو کہتا تھا "یہ راسپوٹین ہے، ابلیس ہے!"

دراصل منٹو کو بناوٹ سے چڑ تھی۔ خود منٹو کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ اس لئے لگی لپٹی

نہ رکھتا تھا۔ جو کچھ کہنا ہوتا صاف کہہ دیتا، بلکہ منٹو بدتمیزی کی حد تک منہ پھٹ تھا۔

ایک دفعہ احمد شاہ بخاری نے بڑے سرپرستانہ انداز میں کہا "دیکھو منٹو، میں تمہیں اپنے بیٹے کے برابر سمجھتا ہوں۔"

منٹو نے جھلا کر کہا "مگر میں آپ کو اپنا باپ نہیں سمجھتا!"

مزہ تو اُس وقت آیا جب چراغ حسن حسرت سے منٹو کی ٹکر ہوئی۔ واقعہ دلّی ریڈیو کا ہے جہاں اتفاق سے سبھی موجود تھے اور چائے کا دَور چل رہا تھا۔ حسرت اپنی علمیت کا رعب سب پر گانٹھتے تھے۔ ذکر تھا سومرسٹ ماہم کا جو منٹو کا محبوب افسانہ نگار تھا اور مولانا جھٹ بات کاٹ کر اپنی عربی فارسی کو بیچ میں لے آئے اور لگے اپنے چڑاؤنے انداز میں کہنے "مقاماتِ حریری میں لکھا — آپ نے تو کیا پڑھی ہوگی، عربی میں ہے یہ کتاب۔ دیوانِ حماسہ اگر آپ نے پڑھا ہوتا — مگر عربی آپ کو کہاں آتی ہے۔" اور حسرت نے تابڑ توڑ کئی عربی فارسی کتابوں کے نام گنوا دیئے۔

منٹو خاموش بیٹھا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ بولا تو صرف اتنا بولا "مولانا ہم نے عربی فارسی اتنی نہیں پڑھی تو کیا ہے؟ ہم نے اور بہت کچھ پڑھا ہے۔"

بات شاید کچھ بڑھ جاتی" مگر کرشن چندر وغیرہ نے بیچ میں پڑ کر موضوع ہی بدل دیا۔

اگلے دن جب پھر سب جمع ہوئے تو حسرت کے آتے ہی بھونچال سا آ گیا۔ منٹو کا جوابی حملہ شروع ہو گیا "کیوں مولانا، آپ نے فلاں کتاب پڑھی ہے؟ مگر آپ نے کیا پڑھی ہوگی، وہ تو انگریزی میں ہے۔ اور فلاں کتاب؟ شاید آپ نے اس جدید ترین مصنف کا نام بھی نہیں سُنا ہوگا۔" اور منٹو نے جتنے نام کتابوں کے لئے اُن میں سے شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جس کا نام مشہور ہو۔ منٹو نے کوئی پچاس نام ایک ہی سانس میں گنوا دیئے اور مولانا سے کہلوا لیا کہ اِن میں سے ایک بھی کتاب نہیں پڑھی۔ ہم چشموں اور ہم نشینوں میں یوں سُبکی ہوتے دیکھ کر مولانا کو پسینے آ گئے۔

منٹو نے کہا: "مولانا اگر آپ نے عربی فارسی پڑھی ہے تو ہم نے انگریزی پڑھی ہے۔ آپ میں کوئی سرخاب کا پر لگا ہوا نہیں ہے۔ آئندہ ہم پر رعب جمانے کی کوشش نہ کیجئے۔"

مولانا کے جانے کے بعد کسی نے پوچھا: "یار تُو نے یہ اتنے سارے نام کہاں سے یاد کرتے ؟"

منٹو نے مُسکرا کر کہا: "کل شام یہاں سے اُٹھ کر سیدھا انگریزی کتب فروش جینا کے ہاں گیا تھا۔ جدید ترین مطبوعات کی فہرست اُس سے لے کر میں نے رٹ ڈالی۔"

سُنا کہ اس بدمزگی کو یوں دُور کیا گیا کہ احباب نے رات کو ایک COCK TAIL پارٹی برپا کی، اور جب چند دَور ہو گئے تو منٹو اور حسرت کو گلے ملوا دیا۔

منٹو نے کہا: "مولانا تم بھی فراڈ ہو اور میں بھی فراڈ ہوں۔"

حسرت نے کہا: "نہیں تم امام ہو۔"

منٹو نے کہا: "تم ابنِ خلدون ہو۔"

اور دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

منٹو بڑا ذہین آدمی تھا۔ اگر ذرا کوئی اپنی حد سے بڑھتا تو وہ سمجھتا کہ یہ شخص میری توہین کر رہا ہے یا مجھے احمق سمجھ رہا ہے۔ دل میں بات رکھنے کا وہ قائل نہیں تھا۔ اس کام کے لئے اوپندر ناتھ اشک بنا تھا۔ بڑی گُھنّی طبیعت کا آدمی تھا۔ منٹو مہینے میں تیس چالیس ڈرامے اور فیچر لکھ دیتا تھا، اور اشک صرف دو ڈرامے لکھتا تھا، اور وہ بھی رو رو کر۔ پھر بڑی ڈھٹائی سے کہتا پھرتا تھا کہ جتنی تنخواہ مجھے ملتی ہے اُس سے زیادہ کے یہ دو ڈرامے میں نے لکھے ہیں۔ منٹو اس کی بڑی دُرگت بناتا تھا۔ سب کے سامنے اسے فراڈ اور حرام زادہ تک کہہ دیتا تھا۔ اشک اُس وقت تو رُونکھا ہو جاتا لیکن منٹو کی باتیں دل میں رکھتا گیا، اور بعد میں بمبئی کی فلم انڈسٹری میں منٹو کی جڑ کاٹتا پھرا۔

شیخی کی باتیں منٹو کو سخت ناپسند تھیں۔ اور شیخی کرکری کرنے میں اُسے لطف آتا

آتا تھا۔ ن۔ م۔ راشد سے میں نے کہا: "یہ آپ کی چھوٹی بڑی شاعری ہمیں تو اچھی نہیں لگتی۔ آخر اس میں کیا بات ہے؟"

راشد نے RHYME اور RYTHYM پر ایک مختصر لکچر جھاڑنے کے بعد اپنی نظم "اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے" مجھے سنانی شروع کی اور کہا "دیکھئے! میں نے اس نظم میں ڈانس کا ردم رکھا ہے۔"

میں بڑی سعادت مندی سے سُنتا رہا مگر منٹو بھلا کب تاب لا سکتے تھے۔ چیخ کر بولے "کونسا ڈانس؟ والز، رمبا، سمبا، کتھا کلی، کتھک، منی پوری؟ —— فراڈ کہیں کا۔"

بچارے راشد کھسیانی ہنسی ہنس کر رہ گئے۔

منٹو کے دماغ میں نئی سے نئی بات آتی تھی۔ ایسی اُپج کسی اور میں دیکھی ہی نہیں۔ ایک میم صاحب کی حسین ٹانگوں کو دیکھ کر کہنے لگے: "اگر مجھے ایسی چار ٹانگیں مل جائیں تو انہیں کٹوا کر اپنے پلنگ کے پائے بنوا لوں۔"

ریڈیو اسٹیشن پر منٹو ایک دن بڑے بے زار بیٹھے تھے۔ میں نے کہا "خیریت تو ہے؟" بولے "سخت بدتمیز اور جاہل ہیں یہاں کے لوگ۔ ٹیلی فون RECEIVE کر کے کہتا ہوں "منٹو" تو اُدھر سے وہ حیران ہو کر پوچھتا ہے "ون ٹو؟" میں کہتا ہوں "ون ٹو نہیں، منٹو۔" تو وہ کہتا ہے "بھنٹو؟"

منٹو کو اپنی زبان دانی پر بڑا ناز تھا، اور واقع میں منٹو بہت صحیح اور عمدہ زبان لکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے کسی افسانے میں ایک عورت کا حُلیہ لکھنے کے سلسلے میں یہ بھی لکھا تھا کہ بچہ ہونے کے بعد اُس کے پیٹ پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔ میں نے شکنیں بدل کر چُرسیں کر دیا۔ جب افسانہ ساقی میں چھپ کر آیا تو منٹو اس لفظ پر اُچھل پڑے۔ بولے "میں نے جس وقت شکنیں لکھا تھا تو میں سوچ رہا تھا کہ یہ لفظ ٹھیک نہیں ہے۔ مگر میری سمجھ میں اور کوئی لفظ نہیں آیا۔ اصل لفظ یہی ہے جو میں لکھنا چاہتا تھا" اس کے بعد کُھلے دل سے انہوں نے سب کے سامنے

کہا کہ "میں صرف دو ایڈیٹروں کی اصلاح قبول کرتا ہوں، ایک آپ اور دوسرے حامد علی خاں۔ آپ دونوں کے علاوہ کسی اور کو میرا ایک لفظ بھی بدلنے کی اجازت نہیں ہے۔"

منٹو بظاہر بڑا اکھڑ اور بدتمیز آدمی نظر آتا تھا مگر دراصل اُس کے پہلو میں ایک بڑا حسّاس دل تھا۔ دُنیا نے اسے بڑے دکھ پہونچائے تھے۔ امیر گھرانے کا لاڈلا بچہ تھا۔ بگڑ گیا اور خوب پیٹ بھر کے بگڑا۔ دوست احباب، کنبہ دار، رشتہ دار، سب سے اسے تکلیفیں پہونچی تھیں۔ اِس لئے اُس میں نفرت کا جذبہ بہت بڑھ گیا تھا، مگر اُس کی انسانیت مرتے دم تک قائم رہی۔ منٹو کا گل گوتھنا سا بچہ اچھا خاصا کھیلتا مالتا ذرا سی بیماری میں چٹ پٹ ہو گیا۔ مجھے معلوم ہوا تو میں بھی اس کے گھر پہونچا، احتیاطاً سو روپے ساتھ لیتا گیا کہ شاید منٹو کو روپے کی ضرورت ہو۔ صفیہ کا روتے روتے بُرا حال ہو گیا تھا۔ غم کا گھر تھا، اس لئے میری بیوی کھانا لے کر پہونچیں۔ انہوں نے صفیہ کو سنبھالا۔ منٹو کی آنکھوں میں پہلی اور آخری بار میں نے آنسو دیکھے۔ بچہ دفنایا جا چکا تھا۔ میں نے منٹو کو رسمی دلاسا دیا اور چپکے سے روپے اُن کی طرف بڑھا دیئے۔ منٹو نے روپے نہیں لئے، مگر تھوڑی دیر کے لئے وہ اپنا غم بھول گیا اور حیرت سے میرا مُنہ تکتا رہا۔ بعد میں اس واقعہ کا تذکرہ اُس نے اکثر احباب سے کیا، اور مُتعجب ہوتا رہا کہ بے مانگے کوئی روپے کسی کو کیسے دے سکتا ہے۔

منٹو کو شراب پینے کی لت خدا جانے کب سے تھی۔ جب تک وہ دلّی رہے اُن کی شراب بڑھنے نہیں پائی تھی۔ بمبئی جانے کے بعد انہوں نے پیسہ بھی خوب کمایا اور شراب بھی خوب پی۔ جب پاکستان بنا تو وہ لاہور آ گئے۔ یہاں فلموں کا کام نہیں تھا، اس لئے انہیں قلم کا سہارا لینا پڑا۔ ہمارے ادب جیسی بنجر زمین سے روزی پیدا کرنا منٹو ہی کا کام تھا۔ صحت پہلے ہی کون سی اچھی تھی۔ رہی سہی شراب نے غارت کر دی۔ کئی دفعہ مرتے مرتے بچے۔ روٹی ملے یا نہ ملے، بیس روپے روز انہیں شراب کے لئے ملنے چاہئیں۔ اس کے لئے انہوں نے اچھا بُرا سب کچھ لکھ ڈالا۔ روزانہ دو ایک افسانے لکھنا ان کا معمول ہو گیا تھا۔ انہیں لے کر وہ کسی ناشر کے پاس پہونچ جاتے۔ ناشروں نے پہلے ضرورت سے انہیں خریدا۔ پھر بے ضرورت۔ پھر اُکتانے اور منہ چھپانے لگے۔ دُور سے دیکھتے کہ منٹو آ رہا ہے تو دکان سے ٹل جاتے۔ منٹو کی اب بالکل وہی حالت ہو گئی تھی جو آخر آخر میں اختر شیرانی، اور میراجی کی۔ بے تکلّف لوگوں کی جیب میں ہاتھ ڈال دیتے اور جو کچھ جیب میں ہوتا نکال لیتے۔ اس میں سے گھر کچھ نہیں پہونچتا تھا۔ شراب سے بچانے کی بہت کوشش کی گئی۔ خود منٹو نے اس سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو پاگل خانے میں داخل کرا لیا۔ منہ سے یہ کافر لگی چھوٹ بھی گئی تھی مگر اللہ بھلا کرے دوستوں کا ایک دن پھر پلا لائے۔ نتیجہ یہ کہ رات کو خون کی قے ہوئی۔ ہسپتال پہونچایا گیا۔ مہینوں پڑے رہے اور جینے کا ایک موقع اور مل گیا۔

اگست ۱۹۵۴ء میں کئی سال بعد لاہور گیا تھا۔ لاہور کے ادیب، شاعر، اڈیٹر اور پبلشر ایک بڑی پارٹی میں جمع تھے کہ غیر متوقع طور پر منٹو بھی وہاں آ گئے۔ اور سیدھے میرے پاس چلے آئے۔ اُن کی حالت غیر تھی۔ میں نے کہا: "آپ تو بہت بیمار ہیں، آپ کیوں آئے؟ میں یہاں سے اُٹھ کر خود آپ کے پاس آنے والا تھا۔"

بولے "ہاں بیمار تو ہوں، مگر جب یہ سُنا کہ آپ یہاں آ رہے ہیں تو جی نہ مانا۔"

اتنے میں ایک شامت کا مارا پبلشر ادھر آ نکلا۔ منٹو نے آواز دی "اوے اِدھر آ۔" وہ رُکتا جھجکتا آ گیا: "کیا ہے تیری جیب میں؟ نکال۔" اس نے جیب میں سے پانچ روپے نکال کر پیش کئے۔ مگر منٹو پانچ روپے کب قبول کرنے والے تھے۔ "حرام زادے دس روپے تو دے۔" یہ کہہ کر اُس کی اندر کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ اور دس روپے کا نوٹ نکال کر پھر مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ پبلشر نے بھی سوچا کر چلو سستے چھوٹے، وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ منٹو پندرہ بیس منٹ تک بیٹھے۔ باتیں کرتے رہے۔ مگر اُن کی بے چینی بڑھ گئی اور عذر کر کے رخصت ہو گئے۔ مجھ سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

پانچ مہینے بعد اخباروں سے معلوم ہوا کہ منٹو اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ انہوں نے

پھر چپکے سے شراب پی لی تھی، خون ڈالتے ڈالتے مر گئے۔ ہمیں تو منٹو کی عظمت کا اعتراف ہے ہی، خود منٹو کو بھی اس کا احساس تھا، چنانچہ جو کتبہ انہوں نے اپنی لوحِ مزار کے لئے خود لکھا تھا اُس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

> "یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے۔ اُس کے سینے میں فنِ افسانہ نگاری کے سارے اسرار و رموز دفن ہیں۔ وہ اب بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا؟"

جگر مراد آبادی

بعض چہرے بڑے دھوکہ باز ہوتے ہیں۔

کالا گھٹا ہوا رنگ، اس میں سفید سفید کوڑیوں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں، سر پر اُلجھے ہوئے پٹھے، گول چہرہ، چہرہ کے رقبے کے مقابلے میں ناک کسی قدر چھوٹی اور مُنہ کسی قدر بڑا، کثرتِ پان خوری کے باعث مُنہ اُگالدان، دانت شریفے کے بیج اور لب کلیجی کی دو بوٹیاں، بھرواں کالی ڈاڑھی، ایڈورڈ فیشن کی، سر پہ تُرکی ٹوپی، بوسیدہ اچکن، آڑا پاجامہ نیم ساق تک چوڑیاں پڑی ہوئیں، پاؤں میں پیٹنٹ کی گرگابی۔ بائیں ہاتھ میں ایک میانہ قدوقامت کا اٹاچی کیس۔ کوئی تیس سال اُدھر کا ذکر ہے جھانسی میں ایک صاحب سر جھکائے قدم بڑھائے اپنے دھن میں جھومتے چلے جا رہے تھے۔ میرے میزبان نے اشارے سے بتایا "یہ ہیں جگر صاحب۔" میں نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ ہوں گے کوئی، میں نے کبھی اُن کا نام بھی نہیں سُنا تھا۔ میرے میزبان نے کہا "آج رات مشاعرہ ہے۔ آپ کہے چلیں گے؟" میں نے کہا "کسی اور بُرے کام میں وقت کیوں نہ ضائع کیا جائے؟ کوئی گویا ہو تو اس کا گانا سُنا جائے۔" وکیل صاحب نے کہا: "اُس کا بھی انتظام کیا ہے ہم نے، کل ہم آپ کو یہاں کے ایک استاد کا گانا سنوائیں گے۔ مگر آج آپ مشاعرے میں ضرور چلئے۔ جگر صاحب کا کلام آپ نے غالباً سُنا نہیں ہے۔ سُننے کے لائق ہے۔" میں نے جی میں کہا۔ لو بھئی، آج کی رات تو

غارت ہوئی۔ قہرِ درویش بجانِ درویش۔ میزبان کی خواہش کا احترام بھی ضروری تھا۔ طوعاً و کرہاً رات کو مشاعرے میں چلنے کی حامی بھر لی۔

پنڈال کشادہ بنایا گیا تھا اور روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ اگلی صفوں میں ہمیں جگہ دی گئی۔ مشاعرہ شروع ہونے میں کچھ دیر تھی۔ وکیل صاحب سے باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ جھانسی میں آئے دن مشاعرے ہوتے رہتے ہیں اور ان مشاعروں کی جان جگر صاحب ہوتے ہیں۔ ہر پھر کے جگر صاحب ہی کی تعریف ہوئے جا رہی تھی۔ میں نے وکیل صاحب سے کہا "یہ تو بتایئے کہ جگر صاحب کون ہیں اور کیا ہیں؟" انہوں نے مجھے ایسی استعجابی نظروں سے دیکھا جیسے میں نے کوئی نہایت احمقانہ بات کہہ دی ہو۔ بولے "بہت اچھے شاعر ہیں، عینکوں کے ایجنٹ ہیں۔" میں نے کہا "اوہو! عینکیں بیچتے ہیں تو یقیناً بہت اچھے شاعر ہوں گے۔" وکیل صاحب کے چہرے پر خفت کے آثار نمودار ہوئے اور کسی قدر ناگواری کے بھی۔ میں نے اس تکدر کو ٹالنے کے لئے کہا "اندھوں کو آنکھیں دیتے ہیں، اور کیا چاہیئے۔" وکیل صاحب ہنسنے لگے۔

شعراء کی آمد آمد ہوئی۔ مشاعرے کے کارکنوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور ڈائس پر پہنچا دیا۔ تھوڑی دیر میں جنابِ صدر بھی تشریف لے آئے۔ ضلع کے حاکم تھے۔ اُن کے مسندِ صدارت سنبھالتے ہی مُشاعرہ شروع ہو گیا۔ پہلے چھٹ بھیّوں نے لہک لہک کر اپنا کلام سُنایا۔ پھر بیچ کی راس کے شاعروں نے۔ ان کے بعد جغادریوں نے۔ اتنے میں شور برپا ہوا "آگئے جگر صاحب آگئے۔" اُنہیں ڈائس پر پہنچایا گیا اور وہ سلام کر کے جنابِ صدر کے پہلو میں جا بیٹھے۔ پڑھنے والوں کے چہرے اُتر گئے۔ اب جو پڑھنے آتا، گھبرایا بَولایا آتا اور گھاس سی کاٹ کر چل دیتا۔ جب سب پڑھ چکے تو جنابِ صدر نے جگر صاحب سے درخواست کی اور سارا پنڈال تالیوں سے گونج گیا۔ جگر صاحب خندۂ دنداں نما کرتے آگے بڑھ آئے۔ وکیل صاحب نے زیرِ لب فرمایا "اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی۔" میں نے

پوچھا "یہ آپ مجھ سے فرما رہے ہیں یا جگر صاحب سے؟" وکیل صاحب کھسیانی ہنسی ہنس کر رہ گئے۔ جگر صاحب نے گنگنا کر سُر قائم کیا اور اپنے مخصوص ترنم میں غزل سُنانی شروع کی۔ مطلع سے مقطع تک غزل کا انداز ہی نیا تھا۔ اس پر خوش گلوئی! پنڈال اُڑا کر رکھ دیا۔ کئی کئی دفعہ ایک ایک شعر کو پڑھوایا گیا۔ میں نے جگر سے پہلے اتنا سُریلا شاعر اور کوئی نہیں سُنا۔ یا پھر گانے والے شاعر سُنے تھے جو باقاعدہ تان پلٹے کرتے تھے، مثلاً حفیظ، ساغر، روش صدیقی وغیرہ۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ جگر صاحب کا پڑھنا ترنم ہی رہتا تھا۔ گانا نہیں بنتا تھا۔ جگر صاحب کو اس مشاعرہ میں سُن کر میں بھی اُن کے مداحوں میں شامل ہو گیا۔

خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر
توچہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

میں [illegible]ء یا [illegible]ء میں حیدر آباد گیا تھا۔ واپسی پر دو دن کے لئے سید ابو محمد مرحوم کے ہاں بھوپال میں ٹھہرا تھا۔ سید صاحب بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ آپ انہیں یوں پہچانیے کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بڑے بھائی تھے۔ جگر صاحب اس زمانے میں بھوپال ہی میں تھے۔ خبر نہیں کہاں سے انہیں معلوم ہوا۔ تیسرے پہر کو مجھ سے ملنے چلے آئے۔ ان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ بڑے خلوص و محبت سے گلے ملے۔ میری خیریت پوچھی، ساقی کی کیفیت دریافت کی۔ خود ہی ساقی کے لئے اپنا کلام بھیجنے کا وعدہ کیا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی ایک غزل لکھ کر دی۔ بڑے خوش خط تھے جگر صاحب۔ جو انداز پُرانے زمانے کی وصلیوں کا ہوتا ہے اُسی انداز میں یہ غزل قلم برداشتہ لکھی تھی مگر "موتی" جڑ دیئے تھے۔ اختتام پر اپنے نام کا طُغرا بنا دیا تھا۔ مزاج کی نفاست زبانِ قلم سے بھی ٹپکتی تھی۔ کتنی خوبصورتی چھپی ہوئی تھی اس ظاہرہ بدشکل انسان کے اندر! میری فرمائش پر غزل پڑھ کر بھی سُنائی۔ نور کا گلا پایا تھا۔ اندھیرے میں سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ کیا آبِ حیواں کی طرح دُنیا کی تمام

بیش قیمت اور حسین چیزیں تاریکی ہی میں ہیں؛

میرے ہاں دلّی کے آخری زرت کا استاد اللہ دیئے خاں آیا کرتے تھے۔ عمر ستّر سے اُوپر ہی تھی۔ سُوکھ کر چرخ ہو گئے تھے، دانت ٹوٹے ہوئے، گال پچکے ہوئے۔ بڑی بڑی گھنی سفید مونچھیں، ڈاڑھی مُنڈی ہوئی مگر بقولِ مرزا چیونٹیوں کے انڈے موجود رہتے۔ بصورتِ موجودہ کوئی استاد کو اپنے پاس بٹھلانے تک کا روادار نہ ہوتا مگر جب وہ ٹھمری یا دادرے کا کوئی بول لگا کر بتانا شروع کرتے تو یہ معلوم ہوتا کہ اندر کے اکھاڑے کی کوئی اپسرا اُتر آئی ہے۔ اسی کریہہ منظر بوڑھے اُستاد کو گلے لگا لینے کو جی چاہنے لگتا۔ شاید فنکار کا فن ہمیشہ جوان وحسین رہتا ہے اور اس کی خوبصورت روح اُس کے بدصورت جسم کی پردہ پوشی ہو جاتی ہے۔ جگرؔ صاحب بھی جب اپنا کلام سُناتے تو حسین نظر آنے لگتے۔

بھوپال کی مختصر ملاقات کے بعد جگرؔ صاحب سے اکثر ملنا ہوتا رہا۔ اُن مختصر ملاقاتوں میں کبھی کبھی شعر و شاعری پر بھی بات چل نکلتی تو جگرؔ صاحب کیٹس اور شیلے تک کے نام لے جاتے۔ باتیں خاصی معقول کرتے تھے۔ اوچھے پن کی حرکتیں نہیں کرتے تھے اور نہ ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہوتے تھے۔ اُن کے مزاج کی شائستگی اُن کی غزل میں ڈھل گئی تھی۔ اُن سے کبھی کسی کی بُرائی نہیں سُنی اور نہ کبھی یہ سُنا کہ کسی کو دھوکہ دیا، یا کوئی بیہودہ بات کی۔ وہ صحیح معنوں میں ایک شریف النفس انسان تھے۔ کارڈینل نیومن نے GENTLE MAN جنٹل مین کی تعریف یوں کی ہے کہ وہ کسی کو دُکھ نہیں پہنچاتا۔ جگرؔ صاحب ایک PERFECT GENTLEMAN تھے۔

نیاز فتح پوری STUNTS کے قائل ہیں۔ وہ ہمیشہ چونکانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً آپ کہیں گے کہ جنت اور دوزخ ہے تو وہ کہیں گے نہیں ہے۔ آپ کہیں گے خدا ہے تو وہ کہیں گے نہیں ہے۔ آپ کہیں گے قرآن شریف کلام اللہ ہے تو کہیں گے کلام رسول

ہے۔ آپ کہیں گے یہ دن ہے تو وہ کہیں گے نہیں، رات ہے۔ برنارڈ شاہ کے ایک کردار کی طرح اختلاف ضرور کریں گے۔ اُس نے کہا "بیٹھ جاؤ" تو بولا "نہیں، میں کھڑا رہوں گا" کہا "اچھا تو کھڑے رہو" "نہیں، میں بیٹھوں گا" یہ کہہ کر بیٹھ گیا۔ تو اسی سے ملتی جلتی فطرت نیاز صاحب کی ہے۔ حال ہی میں انہوں نے "نگار" کا "جگرؔ نمبر" شائع کیا ہے۔ جگرؔ کے انتقال پر ہندوستان اور پاکستان میں بہت سوگ منایا گیا۔ اور کئی رسالوں نے جگرؔ نمبر شائع کئے۔ نیاز صاحب بھلا ٹھنڈے پیٹوں تعریف و توصیف کے اس پشتارے کو کیسے گوارا کر لیتے؛ چنانچہ انہوں نے بھی ایک جگر نمبر شائع کر دیا۔ جس میں سوائے جگرؔ کی بُرائی کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس نمبر کا حشر تو وہی ہو گا جو آسمان پر تھوکنے کا۔ مجھے یہاں ایک واقعہ کی وضاحت کرنی ہے جو اس نمبر میں درج کیا گیا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا کراچی میں ایک مشاعرہ ہوا تھا جس کی صدارت کے لئے جنابِ نیازؔ کو لکھنؤ سے بلوایا گیا تھا۔ کس نے بُلایا تھا اور کیوں بُلایا تھا؟ اس کو اس وقت چھوڑیئے۔ نیاز صاحب نے لکھا ہے کہ انہیں کراچی پہنچ کر معلوم ہوا کہ جگرؔ صاحب کراچی میں موجود ہیں مگر انہوں نے نیاز صاحب کی صدارت میں پڑھنے سے انکار کر دیا۔ نیازؔ صاحب نے جگرؔ کے انکار کی وجہ اُن تنقیدوں کو قرار دیا جو کبھی نگارؔ میں انہوں نے کلامِ جگرؔ پر لکھی تھیں۔ مگر ہوا یہ کہ جگرؔ صاحب مُشاعرے میں آئے، اور انہوں نے کلام بھی سنایا۔ اس واقعہ کو لکھ کر نیازؔ صاحب نے بتایا ہے کہ جگرؔ چونکہ پیسے لے کر پڑھتے تھے اس لئے وہ مشاعرے میں شرکت پر مجبور تھے۔ پھر اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ پیسے لے کر پڑھنے والے شاعر کا کلام گھٹیا ہوتا ہے۔ اسی مفروضہ پر نیازؔ صاحب نے اپنی جانب سے اس خاص نمبر میں کلامِ جگرؔ کے بخئے اُدھیڑ دیئے ہیں۔ مگر جب آپ ان کے اعتراضات پڑھیں گے تو آپ کو اس بوڑھے علامہ کے بچکانہ اعتراضات پر ہنسی آنے لگے گی۔ خیر، یہ ایک الگ لغویت ہے جس سے محظوظ ہونے کے لئے اگر آپ وقت نکال سکتے ہوں تو نکال

لیجئے۔ یہاں تو صرف اس مشاعرے والے واقعہ سے سروکار ہے۔ جگر اتنے چھوٹے دل کے آدمی نہیں تھے کہ نیاز صاحب کی تنقید سے چراغ پا ہو جاتے اور سالہا سال تک اُن سے دل ہی دل میں بُغض رکھتے۔ جگر صاحب کا ساری عمر یہ عمل رہا کہ اپنے بدخواہوں کو معاف کر دیتے تھے۔ اُن کے نزدیک یہی سب سے بڑی سزا تھی۔ اس کے علاوہ اخلاقی اعتبار سے جگر صاحب اتنے گرے ہوئے بھی نہیں تھے کہ کراچی کا مشاعرہ نہ پڑھتے تو اُن کے ہاں فاقے پڑ جاتے۔ جگر صاحب کراچی آ کر مہینوں رہتے تھے اور بغیر مشاعروں کے بھی رئیسوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ میں نے انہیں بیسیوں جگہ مفت پڑھتے سُنا ہے۔ اس مشاعرے میں بھی پڑھنے وہ نیاز صاحب کی طرح پورا خرچہ لے کر ہندوستان سے کراچی نہیں آئے تھے بلکہ یہاں پہلے سے موجود تھے۔ اور اُن کا مشاعرے میں شریک ہو جانا ہی نیاز صاحب کے بُہتان کی تردید کے لئے کافی ہے۔ جگر صاحب ایک شریف النفس انسان تھے اور جہاں تک ممکن ہوتا کسی کو دُکھ نہیں پہنچاتے تھے۔ جگر صاحب ایک سیر چشم آدمی تھے۔ روپیہ پیسہ اُن کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ میں نے اُن کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب وہ شراب کے نشے میں دُھت رہا کرتے تھے اور کوڑی کوڑی کو محتاج۔ مگر میں نے آج تک کسی سے نہیں سُنا کہ جگر نے کسی کے آگے ہاتھ پھیلایا ہو۔ مدہوشی میں بھی انہوں نے اپنی غیرت و خودداری کو ہاتھ سے نہیں دیا۔

مخشب جارچوی نے جگر صاحب کا ایک واقعہ سنایا تھا کہ کسی فلم کے لئے جگر صاحب کی ایک غزل ریکارڈ کرنی تھی۔ جگر صاحب کو اس کا معاوضہ ٹھیک یاد نہیں رہا، پانچ ہزار یا آٹھ ہزار پیشگی دے دیا گیا۔ جگر صاحب اس سے پہلے ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں سے اپنا کلام نشر بھی کر چکے تھے اور ریکارڈ بھی کرا چکے تھے۔ لہٰذا نہایت اطمینان سے فلم کے لئے بھی اپنی ریکارڈنگ کرانے کے لئے بیٹھ گئے۔ مگر جب اپنا ریکارڈ خود سُنا تو سٹپٹا گئے۔

اور اُسے ناپسند کر کے دوبارہ ریکارڈ کیا۔ مگر اس دفعہ بھی انہیں اپنا ریکارڈ نہایت بھدا معلوم ہوا۔ تیسری دفعہ اور چوتھی دفعہ بھی ناکام رہے۔ غرض چھ دفعہ یہی ماجرا پیش آیا۔ سخت بددل ہوئے۔ کمپنی والوں نے کہا: "گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ اب کل پھر تشریف لائیے۔" گھر پہنچ کر مخشب سے بولے: "خدا جانے کیا بات ہے کہ ریکارڈ اچھا نہیں بن رہا۔ تم ایسا کرو کہ یہ روپیہ واپس کر دو اور مجھے آج سوار کرا دو۔" مخشب صاحب نے انہیں تسلی دی اور ایک دن کے لئے اور انہیں روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ اگلے دن بھی کئی ریکارڈ لئے مگر سب ناقص رہے۔ جگر صاحب کی پریشانی اور شرمندگی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور ریکارڈنگ بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ مخشب صاحب کو ایک ترکیب سوجھی۔ مائیکروفون اُن کے سامنے سے ہٹا دیا اور بولے: "کچھ دیر توقف کیجئے، چائے وائے پیجئے، پھر دیکھا جائے گا۔" جگر صاحب نے جھنجھلا کر کہا: "میاں، تم اِن کا روپیہ واپس کرو اور مجھے گھر جانے دو۔" اُنہوں نے کہا: "بہت اچھا۔ روپیہ واپس کر دیا جائے گا۔ مگر آپ اطمینان سے بیٹھ کر چائے تو پی لیجئے۔" جگر صاحب خوش ہو گئے، جیسے منوں بوجھ اُن کے سر سے اُتر گیا ہو۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہنس ہنس کر کرنے لگے۔ چائے پی چکے تو مخشب نے کہا: "دراصل آپ کو مائیکروفون کا احساس ہو جاتا ہے۔ اب اگر آپ پڑھیں گے تو بالکل ٹھیک پڑھیں گے۔ ذرا پڑھئے تو۔" جگر صاحب پڑھنے لگے۔ جب پڑھ چکے تو اسی کا ریکارڈ اُنہیں سُنایا گیا۔ حیران ہو کر بولے "یہ کون ریکارڈ ہے؟ یہ تو ٹھیک ہے۔" مخشب نے بتایا کہ "ابھی جو آپ پڑھ رہے تھے اس کا ریکارڈ ہے۔" "مگر کب اور کیسے ریکارڈ کر لیا؟" "جی یہ ہمارے TRICKS OF THE TRADE ہیں۔ اب گھر چلئے۔ روپیہ واپس کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔"

جس شخص کا یہ کردار ہو وہ پیسے کا میت کیسے ہو سکتا ہے؟ جب وہ پانچ ہزار سے دست کش ہو سکتا ہے تو کیا پانچسو کے مشاعرے کو نہیں چھوڑ سکتا؟ وہ مشاعرے میں روپے کے لئے نہیں بلکہ اس لئے شریک ہوئے کہ ان کی عدم شرکت سے مشاعرے

کے کارکنوں کے ساتھ سامعین کی بھی دل آزاری ہوتی اور خود جنابِ نیازؔ کو خفت اُٹھانی پڑتی۔ جگرؔ صاحب کو جو بے پناہ مقبولیت حاصل تھی وہ کسی نے ہاتھ اُٹھا کر خیرات میں نہیں دی تھی۔ ادب دوستوں نے اُنہیں رئیس المتغزلین قرار دیا تھا۔ اگر انہیں شہنشاہِ تغزل کہا گیا (یہ نیازؔ صاحب ہی کا بیان ہے) تو شہنشاہیت کا تاج بھی خاصانِ ادب ہی نے اُن کے سر پر رکھا ہوگا۔ خدا کا شکر ہے کہ جگرؔ صاحب محسود تھے، حاسد نہیں تھے۔ شریف آدمی حاسد نہیں ہوتے۔

جگرؔ صاحب "شعلۂ طور" کی اشاعت سے پہلے بھی شاعر تھے۔ اور اُن کا ایک مجموعۂ کلام شائع ہو کر گمنام ہو چکا تھا۔ اس زمانے کے کلام میں بھی ایک تیکھا پن تھا۔ مگر سنا ہے کہ کسی معرکۂ عشق میں ناکام ہونے کے بعد اُن کے ساتھ اُن کے کلام کی بھی دُنیا بدل گئی۔ جگرؔ کی غزل میں جو نیا مزاج پایا جاتا ہے وہ اسی محرومی کا نتیجہ ہے۔ عشق کی آگ بھڑک کر شعلۂ طور بن گئی۔ "شعلۂ طور" کا پہلا ایڈیشن چھپتے ہی ختم ہو گیا۔ سید سلیمان ندوی مرحوم نے شاعر اور کلامِ شاعر کا تعارف کرایا تھا۔ میرے پاس جب یہ نسخہ ریویو کے لئے آیا تو میں نے اور انصار ناصری نے جگرؔ ہی کی دُھنوں میں لہک لہک کر پوری ایک رات اسے ختم کرنے میں صرف کر دی تھی۔ اس ایڈیشن میں ادیاما کا بنایا ہوا جگرؔ کا ایک پنسل اسکیچ بھی تھا جو اس قدر اعلیٰ درجہ کا تھا کہ ہم اسے کسی غیر ملکی آرٹسٹ کا کارنامہ سمجھتے رہے۔ بعد میں جامعہ ملیہ میں ادیاما سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ ہمارے ہی ملک کا ایک دھان پان سا نوجوان ہے جس کے دل میں آگ بھری ہوئی ہے۔ دو چار دفعہ کی ملاقات کے بعد جب اس سے پوچھا کہ یہ آپ نے اپنا نام کیا رکھا ہے تو اُس نے بتایا کہ ادیاما جاپانی زبان میں جوالا مکھی کو کہتے ہیں۔ بڑا پُراسرار سا آدمی تھا۔ دلّی سے غائب ہو گیا پھر سنا کہ مر گیا۔

جگرؔ صاحب ایک زمانے میں مچھلی کی طرح شراب پیتے تھے۔ ان کے قدردانوں نے یہ وطیرہ اختیار کر لیا تھا کہ جب اُن کا کلام سُننا ہوتا تو اُن کے لئے ایک بوتل منگا لیتے۔

سوکھے دھانوں میں پانی پڑ جاتا۔ گھنٹوں اپنا کلام سناتے رہتے۔ پھر لکا لپکا اتنا زیادہ ہو گیا کہ ہر وقت پینے لگے۔ جگرؔ صاحب کی زندگی کا یہ دَور ثقہ حضرات کے نزدیک خاصہ قابلِ اعتراض تھا۔ مگر مدہوشی کا یہی دَور اُن کی شاعری کے عروج کا دَور تھا۔ اُن کے قدردان اور مشاعرے والے جامِ مے کی مانند اُنہیں ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ روپیہ اُن پر برستا تھا۔ مگر وہ کل کے لئے آج شراب میں خسّت نہیں کرتے تھے۔ روپیہ اِدھر آیا اور اُدھر شراب بنکر اُڑا۔ خبر نہیں گھر کی زندگی اس شراب نوشی کی وجہ سے اُجڑی یا گھر کی اُجڑی ہوئی زندگی نے کثرتِ مے نوشی کے پَر لگائے۔ دنوں ہفتوں گھر کا رُخ نہ کرتے۔ آج اِس کے ہاں ٹھیکرے میں کل اُس کے ہاں۔ اصغرؔ گونڈوی اُن کے بڑے ہم زلف تھے۔ جب انہوں نے میاں بیوی میں نااتفاقی کی یہ صورت دیکھی تو جگرؔ سے کہا کہ اپنے ساتھ بیوی کی زندگی کیوں خراب کر رہے ہو؟ طلاق دے دو۔ اصغرؔ کا جگرؔ صاحب بہت ادب کرتے تھے۔ تعمیلِ ارشاد میں طلاق دے دی۔ شراب اور بھی بڑھ گئی، اتنی کہ مشاعروں کے اسٹیج پر بھی بوتل اور گلاس ساتھ رہنے لگا۔ غزل پڑھتے پڑھتے بھول جاتے اور سامعین خاصے بے لطف ہوتے۔ مگر اُن کے کلام اور اُن کے کمال کی وجہ سے اُن کی اِس لغویت کو نظر انداز کر دیتے۔ کچھ رسم ایسی پڑ گئی تھی کہ بغیر جگرؔ کے کوئی مشاعرہ کامیاب نہیں ہوتا تھا۔ میں نے بہت سے ذہین شاعروں کو شراب سے تباہ و برباد ہوتے دیکھا ہے۔ اخترؔ شیرانی، میرا جیؔ اور مجازؔ کا تو آخر میں یہ حال ہو گیا تھا کہ اسٹیج پر نہ صرف قے کر دیتے تھے بلکہ پیشاب بھی کر دیتے تھے اور لوگ اُنہیں اُٹھا کر اُن کے ٹھکانوں پر پہنچایا کرتے تھے۔ جگرؔ صاحب اتنے نہیں گرے تھے۔ انہیں پھر بھی ہوش رہتا تھا اور اُن کی طرح اَول فَول بکنے نہیں لگتے تھے۔ اُن لوگوں میں اور بہت سی اخلاقی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ جن کی وجہ سے لوگ اُن سے بھاگنے لگے تھے۔ جگرؔ صاحب نے کسی کی بہو بیٹی کو نہیں تاکا۔ کسی سے بھیک نہیں مانگی۔ تانگے والوں اور چھلّے والوں سے اُنہیں لڑتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اُلٹے پٹتے تھے۔

کبھی نہیں پائے گئے۔ اُن کی شراب خوری کے نقصانات اُن ہی کی ذات تک محدود تھے، دُوسروں کو اُن کا خمیازہ بھگتنا نہیں پڑتا تھا۔ اَوروں کی شاعری دَم توڑتی چلی گئی۔ جگر کی شاعری توانا سے توانا تر ہوتی چلی گئی۔ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔ جگر کی شرافتِ نفس میں فرق نہیں آیا اور اسی وجہ سے اُن کی نفاستِ شاعری بھی قائم رہی۔

اصغر صاحب کی بیوی کا جب انتقال ہو گیا تو اُنہوں نے اپنی سالی یعنی جگر کی مطلقہ سے شادی کر لی۔ یوں دو اجڑے گھر بس گئے۔ جگر صاحب نے اس نئے رشتے پر برہمی کا مطلق اظہار نہیں کیا، بلکہ اصغر صاحب سے اُن کی محبت اور عقیدت کچھ بڑھ ہی گئی۔ یار لوگوں نے اس واقعے کے افسانے تراش لئے مگر حقیقت یہ ہے کہ جگر صاحب نے اصغر صاحب کے ساتھ اُن کی بیوی کی عزت و تکریم بھی شروع کر دی۔ وہی ناپسندیدہ بیوی اب اُنکے لئے ایک لائقِ احترام خاتون بن گئی تھیں۔ اسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ جگر صاحب حفظِ مراتب کا کس قدر خیال رکھتے تھے ع

گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی

کچھ عرصہ بعد اصغر گونڈوی کا انتقال ہو گیا۔ جگر صاحب کو بڑا رنج پہنچا۔ اُن کی زندگی میں یہ ایک زبردست انقلابی نقطہ تھا۔ سُنا کہ جگر صاحب بہت بیمار ہیں، اتنے کہ مشاعروں میں شرکت کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ اُن کی بیماری تھی ترکِ شراب۔ سُنا تھا کہ یہ مُنہ لگ جائے تو پھر نہیں چھوٹتی۔ مگر جگر نے یک لخت شراب چھوڑ دی۔ اُن کے دل کی حالت بگڑ گئی۔ طبیبوں نے بہت کہا کہ رفتہ رفتہ کم کر کے چھوڑو ورنہ مر جاؤ گے۔ مگر جگر صاحب بڑے مضبوط کردار کے آدمی تھے۔ انہوں نے کہا: "جب چھوڑنی ہی ٹھہری تو بس چھوڑ دی۔ اب جان جائے یا رہے۔" اِس کا ردِّ عمل اتنا شدید ہوا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ جگر صاحب نے اپنے آپ کو اتنی سخت آزمائش میں آخر کیوں مبتلا کیا؟ معلوم ہوا کہ یہ بھی محبت کی کارفرمائی ہے۔ اصغر صاحب کے انتقال کے بعد جگر صاحب کو اُن کی بیوہ اور اپنی سابقہ بیوی سے

محبت ہو گئی۔ عدت پوری ہونے کے بعد حرفِ مطلب زبان پر لائے۔ انہوں نے فرمایا "شراب چھوڑ دو۔" اس اللہ کے بندے نے شراب چھوڑ دی۔ بڑی بڑی بُری حالتیں ہوئیں مگر نیت نیک تھی۔ ساحلِ مراد پر زندہ ہی پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ شادی کے بعد جگر صاحب نے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا۔ رندی و سرمستی رخصت ہو چکی تھی۔ اب وہ ایک زاہدِ خشک بن گئے تھے۔ مگر اس زُہد و اتقا میں اُن کا دلِ زندہ مرنے نہیں پایا تھا۔ طبیعت کی مُستقل خرابی کے باوجود وہ خوب ہنستے بولتے تھے۔ گھنٹوں برج کھیلا کرتے تھے۔ مُشاعروں اور ادبی محفلوں اور دوستوں کے ہاں آیا جایا کرتے تھے۔ اخلاق اور بھی نکھر گیا تھا۔ کھانا وہ پہلے بھی کم کھاتے تھے، اب تو دو لقموں پر آ گیا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان میں یکساں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بیوی سلیقہ مند خاتون تھیں۔ چند سال کے پھیر میں ہی مشاعروں کے روپے سے سُنا ہے کہ انہوں نے جگر صاحب کو صاحبِ جائداد بنا دیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد جگر صاحب نے یو پی کے مُسلمانوں کے لئے بہت مفید کام کئے۔ حکام اُن کی عزت کرتے تھے اور اُن کی بات نہیں ٹالتے تھے۔ پاکستان میں بھی اُن کا وقار قائم تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اُن کی شاعری بھی بہتر ہو گئی تھی مگر اس میں جو ایک قسم کی بے ساختگی اور ایک طرح کی والہانہ کیفیت تھی، ایک اچھوتا بانکپن تھا وہ یقیناً نہیں رہا تھا۔ اِس کے بدلے سنجیدگی اور رُوحانی بالیدگی دَر آئی تھی۔ پہلے دل سے شعر کہتے تھے اب دماغ سے کہنے لگے تھے ؎

بہیں کرامتِ بُت خانۂ مرا اے شیخ
کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

دل کی بیماری نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ آہستہ آہستہ جگر صاحب کی صحت جواب دیتی چلی گئی۔ دو سال ہوئے کراچی میں اُن سے ملاقات ہوئی تھی۔ ویسے ہی ہشاش بشاش تھے۔ اور اسی گرمجوشی سے ملتے تھے۔ اسی طرح پوری آواز سے اپنا کلام سُناتے تھے۔

وگ فرمائش کر کر کے اُن سے اُن کا پہلا کلام سُنتے تھے۔ خوش ہو کر سُناتے تھے۔ ایک مشاعرے میں دُور پیچھے سے آواز آئی "جگر صاحب" وہ سُنائیے جس میں ہرن ٹہل رہے ہیں"۔ یعنی ٹہل رہے ہیں۔ جگر صاحب نے ہنس کر اپنا مشہور فارسی کا سراپا سُنا دیا جس میں "آہو خرامے" آتا ہے۔ وطن واپس پہنچے تو دل کے شدید دورے پڑنے لگے۔ صاحبِ فراش ہو گئے۔ مہینوں زندگی اور موت میں ان پر چھینا جھپٹی ہوتی رہی۔ اسی بیماری دل نے آخر کام تمام کیا۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

حکیم کیف دہلوی

یادش بخیر، حکیم ہاشم جان کیف کو میں نے پہلی دفعہ ۱۹۳۰ء میں ایک مشاعرہ میں دیکھا۔ کیف کی عمر اس وقت پندرہ سولہ سال کی تھی۔ عجب طرح دار نوجوان تھا۔ چمپئی رنگ۔ کشادہ پیشانی۔ غلافی آنکھیں، ستواں ناک۔ ہونٹ گلاب کی پتیاں، جن پر کثرتِ پان خوری کے باعث لاکھے کی ہلکی سی تحریر میں بھیگ رہی تھیں۔ بوٹا سا قد۔ سر پر ترکی ٹوپی۔ سیاہ فراک کوٹ، چست پاجامہ، نصف ساق تک چوڑیاں پڑی ہوئیں۔ چال میں البیلا پن۔ باتوں میں لگاوٹ۔ سب کی نظریں اسی طرح دار نوجوان پر پڑ رہی تھیں۔ میں نے بھی اسے دیکھا تو کسی سے پوچھا کہ یہ کون صاحب زادہ ہیں؟ بتایا گیا کہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے نواسے ہیں، طبیہ کالج میں پڑھتے ہیں۔ مشاعرہ ایک بہت بڑی کشادہ حویلی میں تھا۔ چاوڑی بازار سے جو رستہ چوڑی والاں کو جاتا ہے اس میں کوئی سو قدم چلنے کے بعد دائیں ہاتھ کو اس حویلی کا پھاٹک ہے۔ مشاعرہ کا اہتمام صحن میں کیا گیا تھا۔ اُجلی اُجلی چاندنیوں کا فرش۔ ان پر قالین اور گاؤ تکیے لگے ہوئے۔ بجلی کے قمقموں سے حویلی پڑی جگمگا رہی تھی۔ یہ مشاعرہ دلّی کے اسکولوں کے طالبِ علموں کا تھا۔ کوئی رات کے نو بجے مشاعرہ شروع ہوا۔ صدارت پنڈت امرناتھ ساحر آنجہانی نے کی تھی۔ پنڈت جی اس زمانے میں دلّی کے سب سے بزرگ شاعر تھے۔ مشاعروں کی صدارت کرنے کا انہیں خاص سلیقہ تھا۔ مشاعرہ کے جملہ آداب اور جملہ روایات کو قائم رکھتے تھے۔ گھنٹہ پون گھنٹہ بعد کیف کی باری آئی۔ مجھے ڈر یہ تھا کہ یہ

رشیمین سے صاحبزادہ پھسڈی نکل جائیں گے اور اُن کی بڑی تھُڑی تھُڑی ہو گی۔ مگر جب کیف نے مطلع پڑھا تو مشاعرہ چمک اٹھا۔ دل کش ترنم۔ پاٹ دار آواز۔ موزوں زیر و بم۔ عمدہ شعر۔ وہ جم کر پڑھا کہ لطف آگیا۔ بار بار شعر مکرر پڑھنے کی فرمائش ہوتی تھی اور کیف کی آواز کی توانائی بڑھتی جاتی تھی۔ جب غزل ختم ہو گئی تو چاروں طرف سے ماشاء اللہ اور سبحان اللہ کی بارش ہو رہی تھی۔ کیف نے مشاعرہ لوٹ لیا۔ اس کے بعد کئی شاعروں نے پڑھا۔ مگر کسی کا رنگ نہ جم سکا۔ اور سب ٹھیکرے سے توڑ کر چلے گئے۔ کیف کو تو خیر مشاعرہ ختم ہونے پر داد مل ہی رہی تھی۔ اُن کے اُستاد حیدر دہلوی کو ان سے بھی زیادہ داد دی جا رہی تھی۔

ارے بھئی! یہ کیا معاملہ ہے؟ معلوم ہوا کہ یہ سب استادی کا تو فیض ہے جو میاں کیف ایسی ٹھکی ہوئی غزل پڑھ گئے۔ ورنہ سوائے ترنم کے اس میں کیف کا اور کچھ نہ تھا۔ مارتے کا ہاتھ پکڑا جاتا ہے۔ کہتے کی زبان نہیں پکڑی جاتی۔ جتنے مُنہ اتنی باتیں۔ مگر اس وقت تو کیف ہی نے مشاعرہ کو پھڑکایا تھا۔ اس لئے سہرا انہی کے سر رہا۔

کیف کی شاعری کا سلسلہ دو چار سال چلا۔ اس کے بعد اُستاد سے کچھ بگڑ گئی اور کیف نے شاعری چھوڑ کر مطب کرنا شروع کر دیا۔ کیف بہت اچھے طبیب تھے اور اللہ نے ان کے ہاتھ میں شفا بھی دی تھی۔ مگر انہوں نے کبھی بھی سنجیدگی سے اپنے پیشہ کی طرف توجہ نہیں کی مزاج میں لا اُبالی پن تھا۔ جم کر مطب کرنا اُن کے بس کا روگ نہیں تھا۔ گھر کے رئیس تھے اور دلی کے سارے ہی حکیم رئیس ہوتے تھے۔ اس لئے اور بھی بے پروا ہو گئے تھے۔ ویسے جب واقعی کسی کا علاج کرتے تو معجزے بھی کر دکھاتے۔ ورنہ یہ بھی دیکھا ہے کہ ٹالنے کے لئے نل میں سے بوتل میں پانی بھر کے مریض کو پکڑا دیا اور اللہ کی شان! کہ اسی سے بیمار اچھا ہو گیا۔

کیف پر جوانی ٹوٹ کر آئی تھی۔ حسین آدمی۔ اس پر چرباک۔ ہوا خواہوں کی کمی نہ رہی۔ بالاخانوں پر رسائی اور پذیرائی ہونے لگی۔ وہ تو کہو والدین زندہ تھے اور جائداد

ان کے قبضہ میں نہیں آئی تھی۔ ورنہ دیکھتے ہی دیکھتے سب خالصے لگ جاتی۔ مطب سے جو کچھ کماتے اور ہزاروں ہی کماتے۔ سب اسی عیاشی کی بھینٹ چڑھ جاتا۔ ان کی یہ موٹی آمدنی رئیسوں کے لئے نسخۂ خاص تیار کرنے سے ہوتی تھی۔ معجونیں اور طلے تیار ہوتے اور حکیم صاحب کو مُنہ مانگے دام مل جاتے۔ جوان کالے ناگ سانپ پکڑنے والوں سے منگوائے جاتے، ایسے کہ ہنڈیا پہ سے کپڑا ہٹتے ہی پُھوں کر کے سیدھے دُم کی نوک پر کھڑے ہو جاتے۔ ان کا زہر نکالا جاتا۔ طلائے مارِ سیاہ بنانے کے لئے سُرخ چیونٹے بوتلوں میں بھر کر لائے جاتے۔ طلائے مورچہ سُرخ بنانے کے لئے چڑی مار پنجروں میں چڑے بھر کر لاتے۔ معجون مغزِ کنجشک تیار کرنے کے لئے بھنگ، چرس، افیون، گانجا سب مہیا کئے جاتے۔ فلک سیر اور حبوب امساک بنانے کے لئے۔ غرض حکیم کیف کا مطب کیا تھا عیاشوں کا اڈا تھا۔ خود حکیم صاحب دونوں ہاتھوں سے جوانی لُٹاتے تھے۔ چاوڑی میں حکیم کیف کی دھوم مچی رہی تھی۔ فخریہ فرماتے تھے کہ لیلیٰ قیس قیس پکارتی پھرتی تھی۔ طوائفیں کیف کیف پکارتی پھرتی ہیں۔ چند بار انہیں سمجھایا بھی کہ میاں! اتنے بھاگ کرمت چلو کہ ٹھوکر لگے تو پڑے کے پڑے رہ جاؤ۔ مگر جوانی دیوانی بھلا کب مانتی تھی۔ جب تک تن درستی رہی یہی لیل و نہار رہے۔

پھر وہ وقت آگیا جب ان دونوں سِروں سے جلتی ہوئی شمع کا رشتۂ حیات منقطع ہونے لگا۔ امراضِ خبیثہ نے موقع پاتے ہی چھاپہ مارا۔ جسم تو کھوکھلا ہو ہی گیا تھا۔ آسانی سے شکار ہو گیا۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں مجھے کیف سے متعدد بار ملنے کا موقع ملا۔ وہ بہت بیمار تھے مگر ان کی طبیعت کی جولانی اور زبان کی روانی بدستور قائم تھی۔ اس مری ہوئی حالت میں بھی ایک طوائف جناب کی مُلازم تھی۔ میں نے کہا: "اب تو تائب ہو جاؤ تو انشاء اللہ اچھے ہو جاؤ گے" بولے۔ "آغا! مرنا تو ایک نہ ایک دن ہے ہی۔ آخری وقت میں کیا خاک مسلمان ہوں گے"! اس وقت تک کچھ چل پھر لیتے تھے۔ کچھ دنوں بعد پلنگ پر پڑ گئے۔ ان کے چھوٹے بھائی میاں حبیب اشعر نے بڑی سعادت مندی سے ان کی خدمت کی۔ بہترین یونانی اور ڈاکٹری

علاج کرائے۔ مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ایک دفعہ حالت بہت بگڑی تو انہیں میو ہسپتال میں بھی داخل کیا مگر ہسپتال والوں نے جواب دیدیا۔ گھر واپس لاکر ایک تپ دق کے ماہر کا علاج شروع کیا۔ دراصل یہ ڈاکٹر بھی ناامید ہو چکا تھا مگر بڑی پابندی سے وقت پر آتا اور روزانہ انجکشن لگاتا۔ دو مہینے اور اسی اُمید و بیم میں گذر گئے۔ حالتیں بنتی اور بگڑتی رہیں اور کوئی اذیت ایسی نہیں تھی جو مریض کو نہ پہنچ رہی ہو۔ پھیپھڑے گل گئے تھے شہ رگ پھول گئی تھی۔ دل کی رفتار میں فرق آگیا تھا۔ ڈھیروں خون تھوکتے تھے۔ آخر میں گلا بھی بند ہو گیا تھا۔ ناک میں سے ربڑ کی نلکی معدہ میں ڈال دی گئی تھی جس سے دودھ یا عرق کے دو چار چمچے پچکاری کے ذریعے داخل کئے جاتے۔ اُفوہ! مرنا کس قدر مشکل ہے۔ موت نہ جانے کہاں ٹل گئی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ انکی نبضیں چھوٹ جاتیں۔ تنفس رُک جاتا۔ آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ جاتیں اور گھر میں رونا پیٹنا مچ جاتا مگر وہ ایکدم سے چونک کر کہتے "کیا بات ہے؟" یہ حالت ان کی دنوں جاری رہی۔ بیسیوں مرتبہ یہ سمجھ کر کہ مر رہے ہیں انہیں یٰسین شریف سُنائی گئی۔ مگر ان میں پھر جان پڑ گئی۔ آخر آخر میں تو یہ گمان ہو چلا تھا کہ ان میں کوئی سما گیا ہے۔

مرنے سے تین دن پہلے ان سے میری آخری ملاقات ہوئی۔ ناک میں ربڑ کی نلی پڑی ہوئی تھی غفلت طاری تھی۔ میاں حبیب نے کہا "شاہد بھائی آئے ہیں!" آنکھیں کھولیں۔ چہرے پر خفیف سا رنگ آیا، مُنہ پھیر کر دیکھا اور بہت نحیف آواز میں بولے "آگا! ہمارا آخری وقت آپہنچا۔" میں نے دلاسا دیا "نہیں! تم اچھے ہو جاؤ گے!" لبوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی۔ پھر کچھ نہ بولے۔ تیسرے دن سُنا کہ رات کو پھولی ہوئی شہ رگ پھٹ گئی اور مُنہ سے خون بہنے لگا۔ بوڑھی ماں نے دوپٹے سے منہ صاف کیا۔ تکیہ پر گردن کا منکا ڈھلک گیا اور طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔ ہنگاموں بھری زندگی کے بعد اب وہ آرام سے سو رہا تھا۔ میر اطہر حداد زخون — حکیم ہاشم جان کیفؔ ع عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا۔

پروفیسر مرزا محمد سعید

صبح اخباروں میں یہ خبر پڑھ کر دل دھک سے رہ گیا کہ پروفیسر مرزا محمد سعید کا آج سوئم ہے! خاموش زندگی! خاموش موت! مرزا صاحب کی علالتِ مزاج یا مرضِ الموت کی اطلاع اس سے پہلے کہیں سے نہیں ملی۔ حدیہ کہ پرسوں وہ رحلت فرما گئے اور اُن کے سینکڑوں دوستوں اور قدر دانوں کو اس سانحۂ ارتحال کی خبر تک نہ ہوئی! افسوس! اتنا بڑا صاحبِ کمال ہم میں سے اُٹھ جائے اور اُس کی سُناونی ہم تک نہ پہونچے! کتنے بے خبر ہیں ہم لوگ! زندہ قوموں کا یہ شعار نہیں ہوتا کہ اپنے اہلِ کمال سے غافل ہو جائیں۔ ایسی غفلت مجرمانہ ہوتی ہے۔ شاید یہ ہماری غفلت ہی کی سزا ہے کہ مرزا صاحب کو یوں ایکا ایکی ہم سے چھین لیا گیا۔ عالِم کی موت عالَم کی موت ہوتی ہے۔ ابھی ہم کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا کہ مرزا صاحب کے رُخصت ہو جانے سے ہمارا کتنا بڑا نقصان ہو گیا ہے۔ اب ان کی عدم موجودگی رہ رہ کر ہمیں اُن کی یاد دلائے گی اور وقت کے ساتھ اُن کی جُدائی کا گھاؤ بڑھتا چلا جائے گا۔ مرزا صاحب بہت ہی خاموش کام کرنے والوں میں سے تھے۔ یعنی اتنے خاموش کہ خود اُن کے زمانے کے اکثر لوگ بھی ان کے علمی اور ادبی کارناموں سے واقف نہیں ہوئے۔ دراصل خود مرزا صاحب شُہرت سے گھبراتے تھے اور پبلک پلیٹ فارم پر آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ کام کرتے تھے ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز ہو کر۔ کام کرتے تھے

اپنی تسکین کے لئے۔ کام کرتے تھے اس لئے کہ اُنہیں کام کرنا ہوتا تھا۔ فرمائشی کام انہوں نے ساری عمر نہیں کئے۔ انہوں نے اب سے ۵۵ سال پہلے سر عبدالقادر کے رسالے "مخزن" میں مضامین لکھے۔ مگر شیخ صاحب کی فرمائش پر نہیں، بلکہ جب خود اُن کا جی لکھنے کو چاہا۔ مرزا صاحب کسی کو خوش کرنے کے لئے نہیں لکھتے تھے۔ مرزا صاحب پیسے کے لئے بھی نہیں لکھتے تھے۔ پیسے کی تو انہوں نے کبھی پروا ہی نہیں کی۔ بلکہ پیسے کے ذکر پر وہ چڑ جاتے تھے اور اُنہیں منانا مشکل ہو جاتا تھا۔ لاہور کے اکثر پبلشروں نے مرزا صاحب سے کتابیں لکھوانی چاہیں اور بڑی بڑی رقمیں پیش کیں مگر مرزا صاحب نے اُنہیں ایک لفظ بھی لکھ کر نہیں دیا۔ اور جب اپنا پہلا ناول "یاسمین" لکھا تو اپنے ایک شاگرد پبلشر کو بے مُزد دے دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد دوسرا ناول "خوابِ ہستی" لکھا اسے بھی بغیر کچھ لئے دیئے چھپوا دیا۔ ایک پبلشر صاحب لاہور سے دلی محض اس غرض سے آئے تھے کہ مرزا صاحب سے ناول لکھوائینگے۔ میں نے اُنہیں سمجھایا کہ مرزا صاحب نہیں لکھیں گے، مگر وہ بڑے بڑے مُصنّفوں کو خرید چکے تھے، نہ مانے۔ بولے "ہم انہیں ایک ناول کا ایک ہزار روپیہ دینگے تو وہ کیوں نہیں لکھیں گے!" یہ وہ زمانہ تھا کہ دو ڈھائی سو روپے میں اچھا خاصہ ناول پبلشر کو مل جاتا تھا۔ چنانچہ مجھے اپنے ساتھ لے کر مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں نے تعارف کرایا۔ مرزا صاحب کا ماتھا ٹھنکا۔ پبلشر صاحب نے چھوٹتے ہی ناول لکھنے کی فرمائش کی۔ مرزا صاحب بڑے ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے۔ بولے "آپ میرے ناول کے پانچ ہزار دے دیں گے، دس ہزار دے دیں گے۔ مجھے یہ منظور نہیں ہے کہ جو کام کر رہا ہوں اُسے چھوڑ کر آپ کے لئے ناول لکھوں۔" پانچ دس ہزار کی بات سُنکر پبلشر صاحب کی سٹی گم ہو گئی اور دو چار منٹ پہلو بدل کر رُخصت چاہی۔ مرزا صاحب اُس زمانے میں اپنی معرکتہ الآرا کتاب "مذہب اور باطنیت" لکھ رہے تھے۔ جسے مکمل ہونے کے بعد اُن کے

دوست پروفیسر تاجور نجیب آبادی اُن سے لے گئے اور لاہور سے وہ کتاب شائع ہوئی۔ مرزا صاحب کا یہی صرف ایک علمی کارنامہ ہے مگر ایسا کارنامہ کہ اردو کی اگر سو عمدہ کتابیں چھانٹی جائیں تو اُن میں "مذہب اور باطنیت" کو ضرور شریک کرنا پڑے گا۔

مرزا صاحب دلّی کے شرفا کے ایک مُتموّل خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ تیراہا بیرم خاں سے آگے بڑھ کر ایک راستہ سیدھے ہاتھ کو مُڑ جاتا ہے اسی کے نکڑ پر مرزا صاحب کا آبائی مکان تھا۔ اسی علاقے میں سر سید احمد خاں کا قدیم مکان بھی تھا۔ سر سیّد سے بھی مرزا صاحب کی عزیز داری تھی، اور منشی ذکاء اللہ سے بھی انکی قرابت داری ہو گئی تھی۔ پچاس ساٹھ سال پہلے دلّی کے مُسلمان شُرفا میں انگریزی تعلیم کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ مگر سر سیّد نے مسلمانوں کے اس غلط نظریئے کی بابت کچھ اصلاح کر دی تھی۔ اُسی زمانے میں دلّی کے دو نوجوانوں نے اعلےٰ تعلیم حاصل کر کے علمی حلقوں میں نمود حاصل کی۔ ایک پروفیسر مُشتاق احمد زاہدی تھے اور دوسرے پروفیسر مرزا محمد سعید۔ مرزا صاحب نے اس صدی کے آغاز میں لاہور کے گورنمنٹ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ اِن کے اُستادوں میں علامہ اقبالؔ بھی تھے جن سے اُن کے مُخلصانہ تعلقات آخر دم تک قائم رہے۔ انگریزی ادبیات میں ایم۔ اے کی سند لینے کے بعد مرزا صاحب نے ۱۹۰۷ء میں سال دو سال علی گڑھ میں پڑھایا اور اسکے بعد گورنمنٹ کالج لاہور ہی میں انگریزی کے پروفیسر ہو گئے۔ پنجاب کے بیشتر اعلیٰ عہدہ دار مرزا صاحب کے شاگرد تھے۔ پطرسؔ اور تاجؔ نے بھی مرزا صاحب سے اکتسابِ علم کیا۔ بعد میں پطرسؔ خود انگریزی کے پروفیسر ہو گئے تھے۔ مگر اپنی غیر معمولی قابلیت و ذہانت کے باوجود مرزا صاحب کی علمیت کے آگے اپنے آپ کو ہیچ سمجھتے تھے۔ میں نے بارہا پطرسؔ کو مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے دیکھا ہے۔ پطرسؔ کو میں نے کسی اور کا اتنا ادب و احترام کرتے نہیں دیکھا، یہاں تک کہ ویسرئے ہند کا بھی۔

پطرس کے سلسلے میں دو ایک دلچسپ واقعات یاد آگئے۔ پطرس آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل ہوگئے تھے مگر پرانے دوستوں سے رسم وراہ میں ذرا بھی فرق نہ آنے پایا تھا۔ مرزا صاحب کو انہوں نے کسی نہ کسی طرح آمادہ کرلیا تھا کہ ریڈیو سے کبھی کبھی تقریر نشر کیا کریں۔ دو ایک تقریروں کے بعد مرزا صاحب نے کانٹریکٹ واپس کرنے شروع کردیئے۔ شدہ شدہ بات پطرس تک پہونچی۔ حاضر ہو کر وجہ دریافت کی۔ مرزا صاحب نے فرمایا "تمہیں اصلاح دینے کے بعد مجھے یہ منظور نہیں کہ تمہارے شاگرد مجھے اصلاح دیں۔" پطرس نے بڑی معذرت کی مگر مرزا صاحب آئندہ نشر کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوئے۔ اگلے دن دفتر میں قیامت آگئی۔ پورے اسٹاف کو جمع کرکے انہوں نے براڈکاسٹنگ کے حسنِ اخلاق پر ایک طویل لکچر دیا۔ بات تو کھل ہی گئی تھی۔ اسٹیشن ڈائرکٹر نے تقریروں کے انچارج کو بلا کر کہا کہ "اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو مرزا صاحب کو منا کر لاؤ۔" اُسکو معلوم نہیں تھا کہ مرزا صاحب پطرس کے استاد ہیں۔ حسبِ دستور اپنی کارروائی دکھانے کے لئے اُس نے اُن کے مسودے میں سے دو ایک فقرے نکال دیئے تھے۔ اِن فقروں کا نکالنا اُس کا نوکری سے نکالے جانے کا پیش خیمہ ہوگیا۔ بھاگا بھاگا مرزا صاحب کی خدمت میں۔ معافی مانگی، ہاتھ جوڑے، مرزا صاحب نہ مانے۔ بولا: "تو حضرت میری نوکری گئی۔ بال بچے بھوکے مرینگے اور آپ کو دعائیں دینگے۔" مرزا صاحب کے کان کھڑے ہوئے۔ بولے: "یہ تو میں نہیں چاہتا۔" اُسنے کہا: "اگر آپ یہ نہیں چاہتے تو اس کانٹریکٹ پر دستخط کیجئے۔" مرزا صاحب نے فوراً دستخط کردیئے۔

جنگ کے زمانے میں حسنِ اتفاق سے دلی میں لاہور کے بیشتر ادیب اور شاعر ریڈیو میں یا دوسرے سرکاری محکموں میں جمع ہوگئے تھے۔ پطرس کی تحریک پر ایک محدود ادبی حلقہ قائم کیا گیا جس میں ڈاکٹر تاثیر، فیض احمد فیض، حامد علی خاں، حمید احمد خاں، چراغ حسن حسرت، محمود نظامی، غلام عباس، انصار ناصری وغیرہ شریک کئے گئے تھے۔

ہر مہینے اس کا ایک جلسہ ہوتا تھا، کبھی پطرس کے گھر پر اور کبھی ڈاکٹر تاثیر کے گھر پر۔ اس میں ایک مقالہ کسی ادبی موضوع پر پڑھا جاتا اور اس پر گفتگو ہوتی۔ ایک جلسے میں محمود نظامی نے مقالہ پڑھا۔ اس میں مرزا صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ ڈاکٹر تاثیر نے گفتگو کا آغاز کیا۔ پطرس خاموش رہے۔ مرزا صاحب سے درخواست کی گئی کہ کچھ فرمائیں۔ مرزا صاحب بحث مباحثے کو ناپسند کرتے تھے اس لئے بڑی محتاط رائے دیتے تھے۔ انداز کچھ ایسا ہوتا تھا: "نہیں یہ بات تو نہیں، مگر خیر ایسا بھی ہوتا ہے۔" پطرس کو شوخی سوجھی۔ فیض کو اشارہ کیا۔ وہ مرزا صاحب سے زیادہ واقف نہیں تھے، بات کاٹ کر فوراً شروع ہوگئے: "یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ رومی تہذیب یونانی تہذیب کے بعد ابھری۔" اتنا تو اُن کا کہنا اور مرزا صاحب کا جلال میں آجانا: "جی ہاں، میں یہ جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ . . . . . " پرانی تہذیبوں کی تاریخ کا ایک دریا تھا کہ اُمڈا چلا آتا تھا۔ اُس دن مجھے بھی اندازہ ہوا کہ مرزا صاحب کے سینے میں علم کی کتنی دولت بھری پڑی ہے۔ فیض پشیمانی سے بار بار مرزا صاحب کی طرف دیکھتے تھے۔ پطرس دل ہی دل میں ہنس رہے تھے کہ دیکھا اسے کہتے ہیں علم کا سمندر۔ ہم سب دم بخود ساکت بیٹھے مرزا صاحب کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے۔ پطرس نے مرزا صاحب کے جلال کو ختم کرنے کے لئے فوراً چائے کا سامان رکھوانا شروع کردیا۔ اور خدا خدا کرکے مرزا صاحب کا جلال رفع ہوا۔

مرزا صاحب گھنٹوں مطالعہ کرتے تھے۔ اُن کے کُتب خانے میں ہر علم کی کتاب موجود تھی۔ ملازمت درس و تدریس ہی کی تھی۔ اس لئے نئی سے نئی کتاب پڑھتے رہتے تھے۔ فرماتے تھے کہ "اگر میں اتنا مطالعہ نہ کروں تو اِن انگریز پروفیسروں کے آگے کیسے ٹھہر سکتا ہوں۔" پنشن لینے کے بعد بھی اُن کا واحد مشغلہ مطالعۂ کُتب ہی رہا۔ اُن کا یہ

شغل اب تک جاری تھا۔ پنشن کا بڑا حصہ کتابیں خریدنے میں صرف کر دیتے تھے۔

مرزا صاحب کی زندگی بڑی سیدھی سادی تھی۔ کرّوفر یا ٹھاٹ باٹ سے کبھی نہیں رہے۔ گھر کی سواری ہم نے اُن کے پاس کبھی نہیں دیکھی۔ معدے کے مریض تھے، پیدل زیادہ چلتے تھے۔ صبح ٹہلنے ضرور جاتے تھے۔ رات کو جلدی سو جاتے تھے کھیل تماشے، سینما، تھیٹر، کچھ نہیں دیکھتے تھے۔ خدا کے فضل سے گھر کا آرام اُنہیں میسر تھا۔ اُن کی بیگم بھی ادبی ذوق رکھتی تھیں۔ دو ایک ناول اُن کے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اولاد سعادت مند، بیوی سلیقہ شعار، پنشن اتنی کہ بڑھاپے میں کسی کی محتاجی نہیں۔ کھانا سادہ، لباس سادہ، رہن سہن سادہ۔ پھر احتیاج ہو تو کس بات کی؛ قلبِ مُطمئنہ کی دولت سے مالامال تھے۔

ریڈیو پاکستان، کراچی سے ۱۲ سال پہلے ایک پروگرام "دانشکدہ" شروع کیا گیا تھا جس میں چار دانشور بلائے جاتے تھے اور سُننے والوں کے سوالوں کے جواب فی البدیہہ دیا کرتے تھے۔ مَیں میرِ سوالات کی خدمت انجام دیتا تھا۔ میں نے سوچا کہ مرزا صاحب اگر اس پروگرام میں شرکت فرمانا منظور کر لیں تو اس پروگرام کو چار چاند لگ جائیں۔ چنانچہ میں مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرضِ مدعا سُنکر متبسم ہوئے۔ فرمایا "آدمی شہرت کے لئے کوئی کام کرتا ہے یا دولت کے لئے۔ مجھے نہ اِس کی ضرورت ہے نہ اُس کی۔" میں نے قُدری کرلی، مرزا صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔ مرزا صاحب بہت قاعدے قرینے کے آدمی تھے۔ جو کہہ دیتے اُس سے نہ پھرتے۔

قیامِ پاکستان سے پہلے جب مُسلم لیگ نے زور پکڑا تو مرزا صاحب نے سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا اور صوبائی مُسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے اور مُسلم لیگ کاؤنسل کے ممبر بھی چُنے گئے۔ کراچی یونیورسٹی قائم ہوئی تو اسکے مُشیر مقرر ہوئے، اور جب پاکستانی ادیبوں کو گلڈ ۱۹۵۹ء میں بنایا گیا تو مرزا صاحب ہی نے اسکے پہلے اجلاس کی صدارت فرمائی۔

مرزا صاحب بظاہر علیل نہیں معلوم ہوتے تھے۔ اکہرا ڈیل، اُجلا رنگ، کُشادہ پیشانی، گھنی بھوؤں کے سائے میں بڑی بڑی روشن آنکھیں، رُخساروں کی ہڈیاں اُبھری ہوئیں، کترواں مونچھیں۔ ہنستے تو سامنے کے دو چار دانت ٹوٹے ہوئے نظر آتے مگر بُرے نہ لگتے تھے۔ ڈاڑھی مُنڈی ہوئی۔ دھان پان سے آدمی تھے۔ سنہ ۳۲ء میں جب مَیں نے اُنہیں پہلی دفعہ دیکھا تو اُن کی عمر ۴۴ - ۴۵ سال کی تھی۔ سنہ ۶۳ء میں جب وہ ۷۶ سال کے تھے تب بھی وہ ویسے کے ویسے ہی تھے۔ اُنہیں زمانے کا شکوہ یا صحت کی شکایت کرتے کبھی نہیں سُنا۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہتے تھے۔ سُنا ہے کہ دلّی کے جن دو چار نوجوانوں نے سب سے پہلے سُوٹ پہننا شروع کیا اُن میں سب سے نفیس سُوٹ مرزا صاحب ہی کا ہوتا تھا۔ مگر میں نے پچھلے ۳۲ سال میں اُنہیں ہمیشہ شیروانی ہی پہنے دیکھا۔ انگریزی اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا مگر رعب گانٹھنے کے لئے کبھی انگریزی میں بات نہیں کرتے تھے، بلکہ اُن کی گفتگو میں انگریزی کے الفاظ بالکل نہیں آنے پاتے تھے۔ چالیس سال کی عمر کے بعد ہی اُن کے دونوں ہاتھوں میں رعشہ آگیا تھا، اس لئے لکھنے میں اُنہیں زحمت ہوتی تھی۔ خوش اخلاق اور خوش مزاج آدمی تھے مگر زیادہ دوست بنانے کے قائل نہیں تھے۔ آپ بھلے اور اپنا گھر بھلا۔

موت برحق ہے۔ مرنا سب کو ہے، مگر مرنے مرنے میں فرق ہوتا ہے۔ مرزا صاحب نے خاصی اچھی عمر پائی مگر اُن کی وفات کا صدمہ اس لئے زیادہ ہے کہ ایسے قابل، ایسے شریف، اور ایسے وضعدار لوگ زمانہ اب پیدا نہیں کرے گا۔ افسوس کہ پروفیسر مرزا محمد سعید اب وہاں ہیں جہاں ہماری نیک آرزوئیں رہتی ہیں۔ ایسی جامع العلوم ہستی سے محروم ہونے کا ہمیں جتنا بھی غم ہو کم ہے۔ ۶

اب کہاں لوگ اس طبیعت کے!

اُستاد بندو خاں

اُستاد بندو خاں اب سے کوئی ستّر سال پہلے دلّی کے موسیقاروں کے ایک نامور گھرانے میں پیدا ہوئے۔ یہ گھرانا شاہی وقتوں میں معزز سمجھا جاتا تھا۔ اس کے اکثر افراد متوسلینِ شاہی میں شریک تھے۔ یوں تو اس گھرانے میں گایک بھی پیدا ہوئے، مگر ان کا حقیقی کام سارنگی نوازی ہی تھا۔ استاد کے والد علی جان خاں بھی سارنگی بجاتے تھے اور دلّی کے خاصے مشہور سارنگی نوازوں میں شمار ہوتے تھے، مگر ۱۸۵۷ء کے بعد جس استاد نے اس خاندان کا نام روشن کیا، وہ ممّن خاں تھے۔ یہ اپنی بے مثل سارنگی نوازی اور علمی معلومات کی وجہ سے شمسِ موسیقی کہلائے۔ انہوں نے ایک بڑی سارنگی بھی اختراع کی تھی۔ جس کا قد و قامت عام سارنگیوں سے ڈیوڑھا تھا۔ اس میں کھرج کی دو سنگتیں زیادہ رکھی گئی تھیں۔ اور موٹے رودے کے تار ان کے لئے چڑھائے تھے۔ یہ سنگتیں چیلو کی آواز دیتی تھیں۔ اس کا نام انہوں نے "سُرساگر" رکھا تھا۔ اس میں پانچ سنگتوں کے علاوہ بائیں ہاتھ سے جھالا بجانے کے لئے بھی تار لگائے گئے تھے۔ سُرساگر میں بھاری سے بھاری اور ہلکی سے ہلکی آواز نکل سکتی تھی۔ یہ ساز بہت مشکل ہونے کی وجہ سے محنت طلب زیادہ تھا۔ اس لئے استاد ممّن خاں کے بعد روانی سے اسے کوئی نہ بجا سکا۔

ممّن خاں بڑے نمازی پرہیزگار آدمی تھے۔ ان کے گھر کا دستور شرفائے دہلی جیسا تھا۔ اس طبقے کا نچلا پن اُن کے ہاں بالکل نہیں تھا۔ ممّن خاں کی جب شہرت ہوئی تو

ہندوستان کی تمام ریاستوں سے ان کی مانگ ہونے لگی۔ چنانچہ ان کی سارنگی کشمیر سے میسور اور بڑودے سے نیپال تک بجی۔ خاں صاحب نے کچھ عرصے کے لئے میسور میں ملازمت بھی قبول کر لی تھی۔ مگر جنوبی ہند میں ان کا جی نہیں لگا اور دلّی واپس آ گئے۔ آخر میں پٹیالہ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ جب ضعف بڑھ گیا تو دلّی آ گئے اور یادِ الٰہی اور موسیقی کا درس دینے میں مصروف رہتے تھے۔ ہندوستان اور پاکستان میں ان کے سیکڑوں شاگرد ہیں، مگر انہوں نے اپنے علم و فن کی دو عظیم یادگاریں بھی چھوڑی ہیں۔ ایک ان کے خلفِ اکبر استاد چاند خاں اور دوسرے ان کے بھانجے اور خویش استاد بندو خاں۔ چاند خاں نے گانے میں کمال حاصل کیا اور استاد بندو خاں نے سارنگی بجانے میں۔

علی جان خاں اپنے بیٹے بندو خاں کو خود زیادہ تعلیم نہ دے سکے۔ انہوں نے بندو خاں کو ممّن خاں کا شاگرد کرا دیا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، بندو خاں شمسِ موسیقی کے فیض سے ذرّے سے آفتاب بنے۔ استاد کا نام روشن کیا اور خود بھی اتنا نام کمایا کہ رہتی دُنیا تک ان کا نام باقی رہے گا۔

استاد بندو خاں فرماتے تھے کہ ہمارے ہاں تعلیم کا سلسلہ پیدا ہوتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ گھر کے سارے مرد گاتے بجاتے ہیں۔ ایک اِس کونے میں گا رہا ہے، ایک اُس کونے میں سارنگی لئے بیٹھا ہے۔ نئی سے نئی تان بن کر آ رہی ہے۔ کئی کئی گھنٹے روزانہ یہی ہنگامہ برپا رہتا ہے۔ یہ سب آوازیں بچے کے کان میں پڑتی رہتی ہیں۔ اور موسیقی کا شعور بڑھتا رہتا ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی باقاعدہ تعلیم شروع ہو جاتی ہے۔ پہلے گلے سے کہلوایا جاتا ہے تاکہ سُر پکے ہو جائیں۔ اس عرصے میں جسم میں توانائی بھی آ جاتی ہے کہ سارنگی اور گز سنبھل سکے۔ پھر استاد کی ہدایت کے مطابق سارنگی پر مشق کی جاتی ہے۔

بندو خاں سات آٹھ سال کی عمر میں سارنگی پر ہاتھ دوڑانے لگے تھے۔ کئی کئی گھنٹے روزانہ محنت کرتے۔ چاند خاں صاحب نے بھی سارنگی شروع کی تھی، مگر ان کی طبیعت گانے

کی طرف زیادہ مائل تھی۔ اس لئے انہوں نے ممن خاں صاحب کے مشورے پر گانے کی تعلیم پائی۔ بندو خاں کے شوق اور صلاحیت کو دیکھ کر ممن خاں نے انہیں سارنگی کے سارے نشیب فراز سمجھا دیئے۔ بندو خاں نے محنت کر کے اپنا ہاتھ رواں کر لیا۔ ذہن رسا پایا تھا۔ محنت سے دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی چلی گئی۔ ان کا کام بھی شہرت کے پر لگا کر اڑا۔ اور ان کی بھی جگہ جگہ سے بلاوا ہونے لگی۔ موسیقی کے دنگلوں اور کانفرنسوں میں شریک ہونے لگے۔ مگر جب کبھی ماموں کو اپنی دانست میں کوئی نادر بات سارنگی پر سنانے تو وہ ہوں ہوں کر کے ٹال دیتے۔ یہ سمجھ جاتے کہ ابھی کسر باقی ہے، محنت اور بڑھا دیتے۔ ان کے کنبہ داروں کا بیان ہے کہ رات کو سوتے بھی تو سارنگی ساتھ لے کر سوتے۔ اور یہ تو ہم نے بھی دیکھا ہے کہ استاد بازار میں سے جا رہے ہیں اور چادرے کے نیچے ان کی چھوٹی سارنگی کندھے میں پڑی ہے اور اس پر بائیں ہاتھ کی انگلیاں کھٹا کھٹ چل رہی ہیں۔ استاد کے بائیں پاؤں پر ایک موٹا سا گٹا تھا۔ فرماتے تھے کہ یہ ریاض کرنے کے زمانے کی نشانی ہے۔ اٹھارہ گھنٹے روز بیس گھنٹے روز "قلعہ کہنی" کی بیٹھک بیٹھتے تھے۔

استاد ممن خاں نے انہیں نصیحت کی تھی کہ علم جہاں بھی ملے، بے جھجک لے لینا، اس میں عار نہ کرنا۔ چنانچہ بندو خاں نے بھاٹوں اور بھنگی چماروں تک سے چیزیں سیکھیں۔ اس سے انہیں یہ فائدہ ہوا کہ ہر قسم کی موسیقی ان کے پاس آ گئی۔ سچی لگن اور کھوج نے ان کے لئے موسیقی کے سم کے دروازے کھول دیئے۔ دُھرپد سے لے کر چوپائیوں اور دوہوں تک ان کے پاس ہر قسم کی چیزوں کے ڈھیر لگ گئے تھے۔ اسی زمانے میں انہیں پتا چلا کہ دلّی دروازے کے باہر کوٹلہ فیروز شاہ کی ایک ٹوٹی ہوئی کوٹھری میں ایک درویش رہتے ہیں۔ ان کے پاس علم کی بہت دولت ہے۔ نام احمد شاہ ہے۔ اپنے استاد سے ان کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ کام کے کرنے والوں ہی میں سے ہیں۔ بڑے گنی آدمی ہیں، مگر قلب الٹ گیا ہے، دُنیا کو تج دیا ہے اور ان پر جذب کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ اگر ان سے کچھ حاصل کر سکو تو ضرور کرو۔ خاں صاحب نے ان کے پاس آنا جانا شروع کر دیا۔ ہاتھ پاؤں سے خدمت بھی کی، کوئی توجہ نہ ہوئی، مگر یہ بھی دُھن کے پکے تھے۔ برابر جاتے رہے۔ ان کی دہلیز کی مٹی لے ڈالی۔ جب بہت عرصہ ہو گیا تو پتھر میں جونک لگی بولے: "تُو کیوں میرے پیچھے پڑا ہے؟" انہوں نے دل کی بات کہی۔ کہنے لگے: "میں نے دُنیا کو چھوڑ دیا ہے، مگر دُنیا مجھے نہیں چھوڑتی۔ اس سے ہمارے کام میں فرق آتا ہے مگر تو مستحق معلوم ہوتا ہے، ہم تجھے کچھ دیں گے، صبح چار بجے آ جایا کر۔" اس زمانے میں دلّی دروازہ رات کو بند ہو جایا کرتا تھا اور صبح چھ بجے سے پہلے نہ کھلتا تھا۔ خاں صاحب نے سوچا اگر اب چُوکے تو پھر یہ موقع ہاتھ نہ آئے گا۔ سوچتے سوچتے ایک تدبیر سمجھ میں آ گئی۔ رات کے دو بجے کمیلے جانے والے قصائیوں اور راسوں کے لئے دروازہ کھلتا تھا۔ انہوں نے محلے کے "شیخ جی" کو رضامند کر لیا کہ مجھے بھی قصائی بنا کر اپنے ساتھ لے جایا کرو۔ اب یہ رات کے دو بجے سے ویران سُنسان کوٹلے میں جا بیٹھتے۔ اور جب چار بجتے تو شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔ یہ سلسلہ سالہا سال جاری رہا۔ موسیقی کے اسرار و رموز حل ہوتے رہے۔ بندو خاں کا یہ زمانہ ایک طرح سے ان کے جُنون کا زمانہ تھا۔ نیند آنکھوں سے نہیں مقدر سے اُڑ گئی تھی۔ دن رات اسی کی چیٹک لگی رہتی۔ بس سارنگی ہے اور بندو خاں۔ اس غور و خوض اور مشق و مزاولت سے سارنگی کے سارے امکانات پر باندھ کر سامنے آ گئے۔ اس کے بعد خاں صاحب نے سوچا کہ سارنگی میں دوسرے سازوں کا باج کس طرح ڈھالا جا سکتا ہے؟ ایک ایک ساز کے باج پر غور کرتے اور اسے سارنگی میں اُتارنے کی کوشش کرتے۔ جوئندہ یابندہ۔ خاں صاحب نے بین، رباب، الغوزہ، دلربا، ستار: سب کا باج سارنگی میں منتقل کر لیا۔ یہ ان کا ایک ایسا زبردست کارنامہ تھا جس نے سارنگی کو "سورنگی" بنا دیا۔ صدیوں سے سارنگی صرف گھسنے سے بجتی چلی آ رہی تھی۔ بندو خاں نے اس میں انگلیوں اور گز کی ضرب سے بجانے کے اصول داخل کئے۔ سارنگی بجانے والے بائیں ہاتھ کے ناخن

تار کے پہلو سے ملا کر کھسکاتے ہیں اور اس سے سُروں کا اُتار چڑھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ بندو خاں نے اس پُرانے اصول کی پابندی بھی کی اور ستار، دلربا، بین اور رباب کی طرح تار پر انگلیاں چلانے کا نیا اصول بھی وضع کیا۔ انگلیوں کی ضرب (TAPPING) جیسے ہارمونیم میں لگائی جاتی ہے۔ سارنگی میں بھی لگانی شروع کر دی۔ ان سب جدید اصولوں کو سارنگی میں کامیابی سے پیش کرنے میں انہیں ایک عمر صرف کرنی پڑی، اور دُنیا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ بندو خاں نے سارنگی کو واقعی "سو رنگی" بنا دیا اور سارنگی کا بول بالا کر دیا۔

خاں صاحب کہتے تھے کہ میں کتنے ہی دنگل بجا چکا تھا اور تقریباً سارے نامی گویوں کی سنگت بھی کر چکا تھا مگر جب ماموں کو سُنانے بیٹھتا تو وہ جی کھول کر اب بھی داد نہ دیتے۔ میں سمجھ جاتا کہ اب بھی کوئی کسر باقی ہے۔ علم بھی میرے پاس کافی جمع ہو گیا تھا اور میرے کس بل اور دم خم بھی اچھے تھے۔ پھر کیا بات تھی کہ ماموں خوش نہ ہوتے تھے۔ سوچتے سوچتے دھیان آیا کہ سُروں کے جو نازک مقام ہیں، وہ ابھی قبضے میں نہیں آئے ہیں۔ چنانچہ سرتیوں اور مینڈ سوت کی ٹوہ لینی شروع کی، اپنے تمام علم کو پھٹک کر چھانا۔ جتنا کر کرا تھا سب الگ کیا، اس بات پر غور کیا کہ بڑے گانے بجانے والے کس راگ کو کس طرح برتتے تھے۔ مثلاً درباری کی گندھار اور دھیوت اپنے مقررہ مقام سے ہٹ کر لگتی ہے تو وہ کس سُرتی کا مقام ہے؟ اسی طرح ہر راگ پر دوبارہ محنت کی اور اپنے سارے راگ صحیح کئے۔ جب اس کی محنت کر لی تو ماموں کو پھر ایک دن سنانے بیٹھا۔ خوش ہو کر کھڑے ہو گئے اور گلے لگا کر بولے "بیٹا اب تم بامراد ہو گئے۔ تم نے اس علم کے بھید کو پا لیا۔ گانے بجانے میں رس بڑی چیز ہوتی ہے۔ کھانا کتنا ہی عمدہ پکا ہوا کیوں نہ ہو، اگر اس کا آب و نمک ٹھیک نہ ہو تو وہ کس کام کا، سُر کا مقام اور سُر کی مقداریں تو اصل چیز ہوتی ہے۔ اونچے گانے بجانے والے اور اچھے سُنکار اسی بات کو دیکھتے ہیں۔ بچاؤ، گھلاؤ، مینڈ سُوت، گِدا دھماکہ، داب گلاس کے بغیر سارنگی میں مزہ پیدا نہیں ہوتا۔ راگ اس طرح پسنا چاہیے جیسے کھرل میں موتی پستا

ہے۔ اب تمہارا کام کھرا ہو گیا۔ اللہ نے چاہا تو اب کہیں بند نہ ہو گے۔" چنانچہ ہندوستان کے تمام نامی استادوں کے ساتھ خاں صاحب کو بجانے کا موقع ملا اور ہمیشہ انہی کا اُن پر کچھ رہ گیا۔ اُن کا ان پر کچھ نہ رہا۔

جن بڑے استادوں کی سنگت انہوں نے کی، انہیں مراد خاں (تان رس خاں کے بیٹے) اللہ بندے خاں، ذاکر الدین، آفتابِ موسیقی فیاض خاں، عبدالکریم خاں، رجب علی خاں، عبدالوحید خاں، چاند خاں اور بڑے غلام علی خاں کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اللہ بندے خاں الاپیئے اور دُھرپدیئے تھے۔ ایک دفعہ دستورِ قدیم کے مطابق گانے میں سرگم کہہ رہے تھے اور بندو خاں ان کی سنگت کر رہے تھے۔ اللہ بندے خاں نے مینڈ کی سرگم تجرد سُروں سے کی تو دھیوت سے گندھار تک کی مینڈ کو دھاگا کہہ کر اس طرح ادا کیا کہ دھا کا بول کھینچ کر گا پر آ گیا۔ بندو خاں نے پوچھا "خاں صاحب، یہ دھیوت اتنی لمبی کیسے ہو گئی؟" انہوں نے پہلے کبھی اس مسئلے پر غور نہیں کیا تھا، بولے "بزرگوں سے اسی طرح ہوتا چلا آ رہا ہے ہم اس میں کیا کر سکتے ہیں؟" بندو خاں نے کہا "بزرگ بھی تو آخر انسان ہی تھے، اگر ان سے کوئی بات رہ گئی ہو تو اسے اب پورا کرنا چاہیئے۔" خاں صاحب بولے "تو بسم اللہ آپ ہی کچھ کر کے دکھایئے۔" بندو خاں نے کہا: "مینڈ سوت کی سرگم کا انداز بدلئے۔ دھیوت سے گندھار تک کی مینڈ کھینی ہو تو اسے دھاگا کے بدلے دھگ کہئے۔ اسی طرح نکھاد سے دھیوت کی مینڈ کو ندھ اور دھیوت سے نکھاد کی مینڈ کو دھن کہئے۔ مدھم سے دھیوت کی مینڈ کو مدھ اور پنچم سے گندھار کو پگ کہئے۔ اسی طرح وہ دو دو سُر ملاتے چلے جایئے جن کے درمیان مینڈ کھینچی ہو۔" اس تجویز پر سب حیران رہ گئے اور یہ اتنی معقول تھی کہ سب نے اسے منظور کر لیا۔ استاد کا عمل بھی آخر تک مینڈ سوت کی سرگم پر رہا۔

بندو خاں بڑے سیدھے سادے آدمی تھے۔ لڑائی جھگڑے سے دُور رہتے تھے۔ ان کا علم و فضل اتنا زیادہ تھا کہ سارے کام کرنے والے ان سے دبتے تھے۔ اور ان کی عزت

کرتے تھے۔ استاد نے اپنے بجانے کے لئے ایک چھوٹی سی سارنگی بانس کی بنالی تھی۔ باج کا تار رودے کے بدلے فولاد کا ڈالا تھا۔ اس سے اس کی آواز میں بڑی چمک آگئی تھی۔ سنگت بھی اسی سارنگی سے کرتے تھے۔ ایرا ویرا گانے والا تو ان کی سنگت میں دب کر رہ جاتا تھا۔ استاد فیاض خاں جیسا چوکھا گویا بھی آج تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ فیاض خاں بندو خاں کی بہت عزت کرتے تھے اور کبھی کبھی چھیڑ چھاڑ بھی کرتے تھے۔ فیاض خاں ایک کانفرنس میں گا رہے تھے۔ بندو خاں ان کی سنگت کر رہے تھے۔ جب بندو خاں کی سارنگی فیاض خاں کے گانے پر چڑھنے لگی تو فیاض خاں نے چپکے سے مزاحاً کہا: "کیا بانس بجایا کرتے ہو؟" بندو خاں نے ہنس کر کہا: "یہ بانس کہہ رہا ہے، ہندوستان میں کتنے گوڑھ ہیں۔"

مہاراجہ اندور کے ہاں ہولی کے موقع پر گانے بجانے کا بڑا عظیم الشان جلسہ ہوتا تھا۔ سارے ہندوستان کے چیدہ فنکار جمع ہوتے تھے۔ بیس بیس پچیس پچیس ہزار کے انعام استادوں کو ملتے تھے۔ سنگیت سمراٹ استاد رجب علی خاں اپنے وقت کا بڑا اکڑوا گویا تھا۔ گھنٹوں درست گاتا تھا، اور ایک سے ایک نئی لاتا تھا۔ ایک ہولی میں جب رجب علی خاں گانے بیٹھے تو ان کے ساتھ سارنگی بجانے کے لئے مہاراج نے بندو خاں کو بٹھا دیا۔ دونوں کی چڑھتی جوانی، اریاں تنے ہوئے۔ گویّے کو یہ زعم کہ گلے کا ساتھ بھلا ہاتھ کیا کرے گا۔ اور سارنگی نواز اس ترنگ میں کہ تمہارا سارا علم میرے ناخنوں میں ہے۔ جو گانا بجانا شروع ہوا ہے تو نہ وہ تھمتا ہے نہ یہ اور تانیں وہ بن بن کر آرہی ہیں کہ ساری محفل پھڑکی جا رہی ہے۔ ہاتھ گلے کا ساتھ شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو جیسا اس دن ہوا۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ دونوں ایسے گتھے ہوئے تھے جیسے بلبلوں کی پالی ہو رہی ہو۔ نو گھنٹے تک یہ پکڑ جاری رہی۔ کانٹے کی کشتی ہو رہی تھی مگر نہ ہار ہوتی تھی نہ پار۔ آخر مہاراج نے دونوں کو انعام دے کر برابر چھڑایا۔

بندو خاں نے سارنگی کی ساخت کے بھی تجربے کئے تھے، انہوں نے مختلف قد و قامت کی سارنگیاں مختلف قسم کی لکڑیوں کی بنوائیں اور انہیں بجا بجا کر دیکھتے رہے پھر انہیں خیال آیا

کہ بانس کے ریشے سیدھے اور لمبے ہوتے ہیں۔ ذرا موٹے بانس کی دو فٹ پور پر ایک سارنگی بنوائی۔ اس پر رودے (تانت) کے تار چڑھائے، سارنگی نہیں بولی۔ فولاد کے تار چڑھائے۔ نہایت عمدہ آواز پیدا ہوئی۔ پھر مختلف قسم کے بانس منگوائے اور ان پر تجربے کرتے رہے۔ ایک بانس کی پور برما سے بھی منگوائی تھی۔ اس کا قطر کوئی چھ سات انچ ہو گا۔ یہ سارنگی بھی خاصی اچھی بولی مگر دیسی بانس کے مقابلے میں ٹھس رہی۔ آخر میں انہوں نے بانس کی دو سارنگیاں اپنے لئے مخصوص کر لی تھیں۔ انہی کو بجایا کرتے تھے۔ اور اپنے استاد ممن خاں کی بڑی سارنگی (سر ساگر) بھی بجایا کرتے تھے۔ مگر ان کا اصل جوہر بانس کی چھوٹی سارنگی ہی پر کھلتا تھا اور ریڈیو پر تو ان کی سارنگی کچھ عجیب دلکش چیز بن جاتی تھی۔

بندو خاں کی قدر بھی ایسی ہوئی کہ آج تک کسی سازندے کی نہیں ہوئی۔ ہزاروں روپیہ ریاستوں اور رئیسوں سے انعام میں پایا۔ ۲۷ سال اندور میں ملازم رہے۔ مہاراج کے محبوب فنکار تھے۔ جب مہاراج گدی سے علیحدہ ہو کر امریکہ چلے گئے تو بندو خاں بھی ملازمت ترک کر کے دلی چلے آئے۔ ان کی پنشن انہیں برابر ملتی رہی۔ پاکستان چلے آنے کے بعد بھی، بلکہ مرتے دم تک۔ مزاج درویشانہ پایا تھا۔ روپے پیسے سے کبھی محبت نہیں کی جو کچھ کمایا، اماں کو دیا اور اماں کے مرنے کے بعد بیوی کو، غریب کنبہ داروں کی امداد کرتے رہتے تھے۔ کسی عیب میں نہیں تھے۔ چانڈو پینے کی لت نہ جانے کہاں سے لگ گئی تھی۔ اس میں البتہ کچھ روپیہ ضائع ہوا اور صحت کو بھی نقصان پہنچا۔ بڑے مرنجاں مرنج آدمی تھے اور باتیں بھولی بھالی کرتے تھے۔ منکسر المزاج اتنے کہ کبھی آنکھ ملا کر بھی بات نہ کرتے تھے۔

کانفرنسوں میں ہزار روپیہ روزانہ پر جاتے تھے۔ ان کے قدردان بمبئی سے ہوائی جہاز چارٹر کر کے کلکتہ کانفرنس میں انہیں سننے جاتے تھے۔ نواب رامپور اکثر بلایا کرتے اور پانسو روپے روزانہ دیتے۔ دلی کے ہندو رئیس آئے دن بلا کر سنتے، دو دو سو چار چار سو روپے دیتے۔ سیٹھ برلا تو خوش ہو کر کہتے "بندو خاں! اگر تم ہندو ہوتے تو اس وقت تمہیں سونے میں تول دیتا۔" سردار پٹیل کو جب

دل کا عارضہ ہوا تو نہ جانے کس طبیب کے مشورے پر انہوں نے بُندو خاں کو اپنی کوٹھی پر بُلا کر روزانہ سارنگی سننی شروع کی۔ خدا کی قدرت کہ انہیں افاقہ ہو گیا۔ ہندوستان میں جب ۱۹۴۷ء میں مُسلمانوں کا قتلِ عام ہوا تو بندو خاں نے گھبرا کر پاکستان آنے کا قصد کیا۔ سردار پٹیل کو اس کی کسی طرح اطلاع ہو گئی تو انہوں نے پیغام بھیجا کہ تم بالکل نہ گھبراؤ۔ تمہارے گھر پر ملٹری کا پہرہ لگوا دیا جائیگا۔ تمہیں بارہ سو روپے ماہوار کے پروگرام آل انڈیا ریڈیو سے دیئے جائینگے۔ اور جس قسم کی امداد چاہو گے وہ بھی ملے گی۔ مگر بندو خاں کا دل اُچاٹ ہو چکا تھا۔ کہتے تھے کہ ہندوستان کی زندگی سے تو پاکستان کی موت اچھی۔ ۱۹۴۸ء کے شروع میں چُپکے سے بذریعہ ہوائی جہاز پاکستان چلے آئے۔

لاہور میں سال بھر رہے۔ یہیں سے ان کے مالی مصائب کا آغاز ہوا۔ تنگی تُرشی سے گزارا ہونے لگا۔ جس گھر میں رہتے تھے اس کی جڑ میں پانی مرنے لگا اور وہ بالکل کھل گیا۔ لاہور سے بیزار ہو کر کراچی پہنچے۔ ریڈیو پاکستان نے انکی سرپرستی کی اور ان کی مالی حالت کچھ سدھر گئی۔ شہر کے ایک گنجان تجارتی علاقے میں دو کمروں کا خاصا بڑا فلیٹ بھی انہیں ایک قدردان نے الاٹ کر دیا تھا۔ ایک سال یہاں رہے ہوں گے کہ ان کے پاس ایک دلّال پہنچا کہ آٹھ ہزار اس کی پگڑی لے کر کہیں اور چلے جاؤ۔ معلوم ہوا کہ کوئی سیٹھ صاحب پوری بلڈنگ کے کرایہ داروں کو پگڑی دے کر بلڈنگ خالی کرانا چاہتے ہیں۔ بعض نے تو اس پیش کش کو قبول کر لیا اور بعض نے اسے نامنظور کر دیا۔ آخری بار بندو خاں کو دس ہزار روپے کی پیش کش کی گئی مگر وہ بھولے آدمی توبہ توبہ کر کے وہیں بیٹھے رہے۔ کچھ دنوں کے بعد میونسپل کارپوریشن کا نوٹس آیا کہ مکان خالی کر دیا جائے کیونکہ عمارت خطرے میں ہے اور اسے ڈھایا جائے گا۔ اور نوٹس کی میعاد ختم ہوتے ہی مزدوروں نے اسے ڈھانا شروع کر دیا۔ ناچار وہاں سے نکلے اور پُرانی نمائش کی ایک ٹوٹی ہوئی دکان میں آ بیٹھے۔ یہاں بارش نے رہنے نہیں دیا۔ تو پیر کالونی کے ایک کھنڈلے میں پناہ لی۔ آخر کسی خدا ترس افسر نے لالو کھیت میں ان کو تھوڑی سی زمین الاٹ کر دی۔ اس پر قرض وام کر کے انہوں نے ایک کمرہ ڈلوا لیا۔ اور پندرہ افراد کا خاندان

اس ایک کمرے میں زندگی کے دن بسر کرنے لگا۔ پاکستان میں ریڈیو پاکستان ہی ان کا سب سے بڑا سرپرست تھا۔ جب ان کے دونوں لڑکے بھی ریڈیو پاکستان میں ملازم ہو گئے تو انہوں نے سُکھ کا سانس لیا مگر کے دن؟ سفینہ کنارے آ لگا تھا۔ سارنگی کا جادوگر نغمے کا جادو جگا کر اب خود سو جانا چاہتا تھا۔

استاد نے ایک دفعہ کہا تھا کہ "جس دن ہماری اُنگلی بے سُری پڑنے لگے گی، سمجھ لینا کہ ہمارا وقت قریب آ پہنچا" اور سچ مچ مرنے سے چند روز پہلے انہوں نے جو آخری پروگرام کیا تو میں نے بھی دیکھا اور ریڈیو کے دو ایک اور آدمیوں نے بھی کہ استاد کے ہاتھ میں کمزوری آ گئی ہے۔ میرا ماتھا اسی دن ٹھنکا تھا۔ میں نے اُن کے لڑکے امراؤ خان سے پوچھا کہ استاد کی طبیعت کیسی ہے؟ انہوں نے بتایا کہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے، پیچش نے کمزور کر دیا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ شام کو ان کی مزاج پرسی کو جاؤں گا مگر دن کے کوئی ساڑھے بارہ بجے فلمی ریکارڈ بجاتے بجاتے ریڈیو نے یہ غمناک خبر سنائی کہ اُستاد ہم سے رخصت ہوئے۔ یہ ۱۳ جنوری ۱۹۵۵ء کا ذکر ہے۔

لالو کھیت جا کر دیکھا کہ استاد کا بے روح جسم چارپائی پر پڑا ہے اور گھر میں کہرام مچا ہوا ہے۔ میں نے پوچھا "یہ کیسے ہوا؟ مرنے کی تو حالت نہیں تھی"۔ لڑکے نے بتایا کہ "اچھے خاصے تھے۔ مجھے بلایا اور کہا 'لو چیز لے لو' مجھے چیز یاد کرائی۔ پھر بولے 'آج طبیعت ٹھیک نہیں ہے'۔ میں نے کہا 'ابا میں ڈاکٹر کو لاتا ہوں'۔ میں کپڑے پہننے لگا۔ اماں جو کسی کام سے کمرے میں گئیں تو دیکھا کہ ابا بے سدھ پڑے ہیں۔ آواز دی نہیں بولے۔ ہلایا جُلایا، وہاں کیا رکھا تھا۔ ان کا طائر روح ستر سال کے بعد قفسِ عنصری سے رہائی پا چکا تھا۔"

بندو خاں کی سُناؤنی سارے شہر میں بجلی کی طرح پھیل گئی اور میرے پہنچتے تک دو تین سو آدمی انکے گھر پہنچ گئے۔ ایشیا کا سب سے بڑا فنکار اور دُنیا کا سب سے بڑا سارنگی نواز شام ہوتے ہوتے آخری منزل پر پہنچا دیا گیا اور جس وقت پڑوس کی مسجد سے مغرب کی اذان کی آواز آئی تو ہم اس عظیم انسان کی ڈھیری پر فاتحہ پڑھ رہے تھے۔

ایم اسلم

سرزمین پنجاب اپنی بوقلموں صفات کی بنا پر سدا سے ہندوستان کی ایک بیش قیمت دولت رہی ہے۔ اس کے شہروں کی زندگی گنگناتی رہتی ہے۔ اور اس کے دیہاتوں کی آبادی ہنستی مسکراتی رہتی ہے۔ شیشم کے سائے میں محبت کے پودے پنپتے ہیں اور رومانی جھیلوں میں حُسن و عشق کے کنول کھلتے ہیں۔ ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال، سسی پنوں کے عشقیہ ناٹک اسی سرزمین کے اسٹیج پر کھیلے گئے اور اس دل سوزی کے ساتھ کہ رہتی دُنیا تک اُن کے نام زندہ رہیں گے سچ ہے عشق میں جان دیکر انسان زندۂ جاوید ہو جاتا ہے۔

سرسید نے یہاں کے بسنے والوں کو زندہ دلانِ پنجاب کہا۔ اس خطے کا موسم اور ماحول ہی ایسا ہے کہ یہاں کے بسنے والوں میں جسم اور رُوح کی توانائی پیدا ہوتی ہے، محنت اور جفاکشی کو جی چاہتا ہے۔ دل میں اُمنگ اور رُوح میں ترنگ پیدا ہوتی ہے اور زندگی زندہ دلی کا مُرقع بن جاتی ہے اور سچ پوچھو تو ؎

زندگی زندہ دلی کا ہے نام
مُردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

یا یوں سمجھو کہ پنجاب کے لوگ جینے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ زندگی کی مقدس امانت کو عیش و عشرت کے آستانے پر بھینٹ نہیں چڑھاتے۔ زندگی سے پورا پورا مصرف لیتے اور اپنے فرض کی تکمیل کو مقصدِ حیات سمجھتے ہیں۔ زندگی کے اور حلقوں سے قطع نظر ایک ادب کے حلقے ہی کو لیجئے اور دیکھئے کہ اس بیسویں صدی میں کیسی کیسی جلیل القدر ہستیاں وجود میں آئیں۔ پنجاب کے لفظ کے ساتھ سب سے پہلا تصور پیغمبرِ خودی علاّمہ اقبال مرحوم کا وابستہ ہے۔ جنکی شہرت کا ڈنکا چار دانگِ عالم میں بج چکا ہے۔ ان کے بعد سر عبدالقادر ہیں جنہیں جدید ادبی رسائل کا باوا آدم کہنا چاہیئے۔ اخبار نویسوں میں مولانا ظفر علی خاںؔ کا اسمِ گرامی سرِ فہرست ہے۔ اور مصنفوں میں میاں محمد اسلم (جو عرفِ عام میں ایم۔ اسلم کہلاتے ہیں) کا نامِ نامی سب سے زیادہ مرکزِ نظر بنا رہتا ہے۔

سرو قد، کھلتا رنگ، کتابی چہرہ، خنداں پیشانی، چمکدار آنکھیں، ان پر عینک، پتلے پتلے لبوں پر کترواں مونچھیں جن میں ایک غمگین مُسکراہٹ چھُپی رہتی ہے، ٹھوڑی سے استقلال ٹپکتا رہتا ہے۔ تُرکی ٹوپی، کوٹ اور شلوار، کالر اور ٹائی۔ عمر ستر سے متجاوز، کاٹھی مضبوط۔ یہ ہے ایم اسلم کی ظاہری وضع۔ جیسا اُن کا ظاہر اُجلا ہے ویسا ہی اُنکا باطن بھی ستھرا ہے۔ باتیں بڑی مؤثر اور دلکش کرتے ہیں۔ اُن کے اندازِ گفتگو سے اُنکی شرافتِ نسبی ٹپکتی ہے۔ ان کی کوئی بات قرینے اور سلیقے سے خالی نہیں ہوتی۔ سادہ پُرکاری جو اُن کی تحریر کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ان کی نجی زندگی میں بھی کار فرما ہے۔ بہت معمولی انداز میں کوئی بات کہیں گے مگر ہوگی گہری اور وزنی۔ دوستوں پر جان دیتے ہیں اور انہیں زیرِ بارِ منّت کرنے کی جستجو میں رہتے ہیں۔ دل کے صاف ہیں، کبھی کسی کو مُشتبہ نظر سے نہیں دیکھتے۔ اپنی اس کمزوری کی بدولت اکثر نقصان اور تکلیف اُٹھاتے ہیں اور بے مہریٔ احباب کے شکوہ سنج رہتے ہیں مگر وسیع القلبی نے چشم پوشی اور درگذر کو ان کا شعار بنا دیا ہے۔

ہمیں ایسی کئی مثالیں معلوم ہیں کہ جن لوگوں کو دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے جُڑتی

تھی آج اسلم صاحب کی امداد کی بدولت ہزاروں روپے رول رہے ہیں۔ میرا چشم دید واقعہ ہے کہ سنہ ۳۳ء میں ایک صاحب آئے جنکی ہیئت کذائی پر مفلسی اور بدحالی کی چھاپ تھی۔ ان سے میرا تعارف کرایا گیا تو معلوم ہوا کہ میرے ہم پیشہ ہیں۔ ان صاحب نے بیڑا اُٹھایا تھا کہ طباعتِ کتب کا کاروبار نہایت ایمانداری سے کریں گے چنانچہ اسلم صاحب سے چھپی چھپائی کتابوں کا اسٹاک لے گئے اور اسکے علاوہ تین کتابوں کے مسودے بھی۔ اس وقت میاں صاحب سے بہتر ادیب اور ایسا کریم النفس انسان ان صاحب کے نزدیک دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ کتابیں چھپیں اور خوب بکیں۔ کئی کئی ایڈیشن ہو گئے۔ چند سال بعد انہی ناشر صاحب سے مُلاقات ہوئی تو انہیں پہچاننے میں تکلف ہونے لگے پر کلہ چڑھا ہوا، توند اُن سے فٹ بھر آگے چلتی تھی، بیفکری اور فارغ البالی کی مُہر اُن پر لگی تھی۔ معلوم ہوا کہ اُن کا کاروبار خوب چمک گیا ہے، کچھ زمین بھی خرید لی ہے۔ انہیں دیکھ کر بہت جی خوش ہوا مگر اُن کی باتیں سُن کر بڑی حیرت اور نفرت ہوئی۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت نے اُن کے اخلاقی فرائض کو تباہ اور ان کی انسانیت کو برباد کر دیا تھا۔ دوسروں کے حقوق ادا کرنے کو یہ ان کی عادتیں خراب کرنا کہتے تھے اور اُن کا مقولہ یہ بن گیا تھا کہ بزنس میں ایمانداری سے کوئی شخص ترقی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ واقعہ تو یہ ہے کہ ترقی تو وہ کر گئے اور ایسی کہ شاید ہی کسی نے کی ہو مگر یہ بھی ایک عبرتناک واقعہ ہے کہ شاید ہی کوئی اُن کا اعتبار کرتا ہو۔ ایک سرے سے سب ہی اُن سے متنفر نظر آتے تھے۔ اب کے ایم اسلم صاحب سے ملاقات ہوئی تو دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اب تو عرصہ سے اُن صاحب نے خدا واسطے کا بیَر باندھ رکھا ہے۔ اور مُشتاقانِ ملاقات کو باز رکھنا اور ورغلانا اپنے ایمان کا جُزو سمجھتے ہیں۔ ؎

نکوئی با بداں کردن چنان است
کہ بد کردن بجائے نیک مرداں

حساب کا رجسٹر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ بقول اسلم صاحب بے ایمان بُک ڈپو پر ڈھائی ہزار روپے نکلتے ہیں اور اس رقم کو بٹہ کھاتے میں ڈال دیا ہے۔

یہ میں نے صرف ایک مثال پیش کی ہے، ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جن کی تکرار بے فائدہ ہے۔ البتہ ایک اور واقعہ کا بیان کرنا ضروری ہے جس سے اسلم صاحب کی وسیع القلبی کا پتہ چلتا ہے۔

ایک معروف ترقی پسند ادیب کو اسلم صاحب سے بُغضِ للّٰہی ہے اور اپنے کئی مضامین میں دل کے پھپھولے پھوڑ چکے ہیں۔ اسلم صاحب یوں تو جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے چشم پوشی اور درگذر سے کام لیتے ہیں مگر ضبط اور صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ کبھی کبھی اپنے مضامین میں اپنے مخالفین کی خبر لے لیتے ہیں، وہ بھی اس طرح کہ تہذیب و شائستگی کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ مگر اُن صاحب کی جلی کٹی کا انتقام لینا بھی اسلم صاحب نے پسند نہ کیا۔ شومئی قسمت سے یہ صاحب ایک مقدمہ میں ماخوذ ہو گئے۔ عدالت میں مَیں بھی موجود تھا، اسلم صاحب بھی تھے اور کئی اور کرم فرما بھی۔ ایک صاحب نے ضمانت میں اپنا نام بھر دیا۔ مگر مجسٹریٹ ضامن کو نہیں جانتا تھا اس لئے تصدیق کرنے کے لئے ایک ایسے گواہ کی ضرورت ہوئی جسے مجسٹریٹ شخصی طور پر جانتا ہو۔ ضامن نے اسلم صاحب کی طرف ضمانت نامہ بڑھا دیا۔ انہوں نے بے چون وچرا اس پر دستخط کر دیئے۔ ضمانت منظور ہو گئی اور ترقی پسند ادیب کو اتنی بھی توفیق نہیں ہوئی کہ خالی شکریہ کے دو لفظ ہی کہہ دیتے۔ اسلم صاحب نے اس بدتمیزی کا بھی بُرا نہ مانا اور کہا تو یہ کہا کہ ان صاحب سے مجھے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو لیکن میں عدالت کچہری میں ان کا مخالف نہیں ہو سکتا۔ آخر ہیں تو اہل قلم ہی۔ ان کی پریشانی سے مجھے خوشی نہیں ہو سکتی۔ ؎

آسائشِ دو گیتی تفسیرِ ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

ادیب کی حیثیت سے میں اسلم صاحب کو پینتیس سال سے جانتا ہوں اور شخصی طور پر ۳۲ سال سے۔ تصنیف و تالیف کے سلسلے میں اسلم صاحب اب تک پندرہ بیس ہزار صفحات کی کتابیں لکھ چکے ہیں اور شاید ہی کوئی اُردو پڑھنے والا ایسا ہو کہ ان کی کتابوں سے مستفیض یا لطف اندوز نہ ہوا ہو۔

اسلم صاحب نے مذہب، تاریخ، تنقید، افسانے اور مزاحیہ مضامین، سبھی کچھ لکھا ہے۔ اس لئے ہر مذاق کے پڑھنے والے کو ان کی کتابوں میں اپنی تسکینِ ذوق کا سامان مل جاتا ہے۔

اسلم صاحب کی اَدبی تخلیقات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جائے گا۔ اور یوں بھی ان کتابوں کے ذریعے ہر شخص بقدرِ ہمت اُردو ادب میں ان کا درجہ متعین کر سکتا ہے۔ اسکے علاوہ ایک نظریہ یہ بھی ہے تصنیف مصنف کے کردار و رجحان کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے اسلم صاحب کی سیرت کا بھی اندازہ کیا جا سکے گا مگر میں سمجھتا ہوں کہ اسلم صاحب کے باب میں اس نظریہ کی صداقت بہت کچھ مشتبہ ثابت ہو گی۔ تاہم وہ پاکیزگی جو اُن کی روزمرہ زندگی میں کارفرما ہے انکی اَدبی تخلیقات میں بھی طاری و ساری ہے۔

اسلم صاحب لاہور کے ایک نہایت معزز گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ انکے خاندان میں بڑی قابلِ قدر ہستیاں پیدا ہوئی ہیں۔ موجودہ افراد میں خان بہادر میاں امیرالدین اور میاں امین الدین۔ آئی۔ سی۔ ایس شامل ہیں۔

قیامِ پاکستان سے پہلے لاہور کو ہندوستان کا پیرس کہا جاتا تھا، غالباً اس وجہ سے کہ نت نئے فیشنوں کی ایجاد یہیں سے ہوتی تھی، چنانچہ تہذیبِ فرنگ

نے پنجاب کی قدیم تہذیب کو دیس نکالا دے دیا تھا۔ جب تہذیبِ نو نے رواج پایا تو نئی اخلاقی اقدار بھی رائج ہو گئیں۔ یہ سیلاب کسی کے روکے نہیں رُکا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی آگاہی بھی صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ لاہور کے اُونچے گھرانوں میں یورپی تہذیب نے دخل پا لیا۔ شعائرِ اسلامی کو ترقی میں حائل سمجھا گیا اور انہیں پسِ پُشت ڈال دیا گیا۔ متوسط طبقے کی معاشرت آدھا تیتر آدھا بٹیر۔ اپنی گوارا نہیں پرائی کا یارا نہیں۔ نچلے طبقے میں چولا بدلنے کی استطاعت کہاں؟ مگر متاثر ہوئے بغیر یہ بھی نہ رہ سکا۔ ممکن ہے کہ کچھ اور خاندان بھی ہوں مگر میں نے پُرانی تہذیب کا رکھ رکھاؤ اور وقار صرف اسلم صاحب کے ہی خاندان میں دیکھا۔ ادب و آداب، قرینہ، سلیقہ، وضعداری، خلوص و محبت، غرض جو شُرفائے قدیم کا دستور تھا اب بھی اُن کے ہاں اس کی پوری پابندی کی جاتی ہے۔ آپ کا جی چاہے تو اسے قدامت پرستی ہی کہہ لیجئے مگر یہ وہی جوہر ہے جسکے آخری پرستار علامہ مرحوم تھے۔ مغرب کی خوبیوں سے جس حد تک مستفید ہونے کی ضرورت ہے۔ اس خاندان کے افراد اس میں کسی سے پیچھے نہیں رہے چنانچہ مردوں میں آئی۔ سی۔ ایس اور خواتین میں بی۔ اے اور ایم۔ اے موجود ہیں۔ مگر اس اعلیٰ تعلیم نے نہ تو ان سے ان کا مذہب چھینا اور نہ انہیں نقلی تہذیب اختیار کرنے پر مجبور کیا۔

اسلم صاحب جس زمانے میں گورنمنٹ کالج (لاہور) میں پڑھتے تھے تو انہیں شاعری کا شوق تھا۔ شعر دلکش کہتے تھے اور اکثر انعامات بھی شاعری کی بدولت لے۔ ڈاکٹر اقبال اس زمانے میں فلسفے کے پروفیسر تھے اور اسلم صاحب کے خاص کرم فرما۔ ان کے اَدبی ذوق کو ڈاکٹر اقبال ہی نے اُبھارا۔ اسلم صاحب کو نثر لکھنے پر مرحوم ہی نے مائل کیا۔ ڈاکٹر صاحب سے ان کے تعلقات آخر تک

بہت مخلصانہ رہے۔ اسلم صاحب کی معیت میں جب مجھے علامہ مرحوم کی خدمت میں حاضر ہونے کا پہلا موقع ملا تو ان کی مہلک بیماری کی ابتدا ہو چکی تھی۔ علامہ کی آواز بیٹھی ہوئی تھی اور بولتے تو ان کے تنفس پر زور پڑتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ عید کی نماز بادشاہی مسجد میں پڑھنے گئے تھے، فرش ٹھنڈا تھا، دیر تک بیٹھنا پڑا۔ سردی کا اثر ہو گیا، آواز بالکل جاتی رہی۔ اس حالت میں بھی اپنے ملنے والوں سے گھنٹوں باتیں کرتے اور ان کی باتیں اتنی دلکش ہوتیں کہ وہاں سے اُٹھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ مجھ سے اُردو میں اور اسلم صاحب سے پنجابی میں باتیں کرتے رہے۔ اسلم صاحب سے جو باتیں ہوئیں اُن سے مجھے معلوم ہوا کہ ان کے باہمی تعلقات کسقدر دیرینہ اور مخلصانہ ہیں۔ علامہ کے انتقال کے بعد اسلم صاحب کے لئے لاہور کی ادبی زندگی ویران ہو گئی۔

اسلم صاحب کو بفضلہٖ دُنیا کی سب نعمتیں میسر ہیں مگر اولاد کا سُکھ ان کے نصیب میں نہیں ہے یہ ایک ایسا دکھ تھا جس نے ان کی زندگی کو کڑوا کر دیا۔ کوئی چالیس سال ہوئے انہوں نے اپنی بھانجی اصغری کو گود لیا اور اسے اس طرح پالا کہ اپنے پیٹ کی اولاد کو بھی کوئی کیا پالے گا مگر خدا کی شان کہ یہ بچی بھی چند سال ہی میں جنت کو سدھار گئی اور اسلم صاحب کی زندگی کی ٹریجڈی کو مکمل کر گئی۔ غم و مایوسی نے انہیں دُنیا سے بیزار کر دیا۔ اصغری کی یاد نے انہیں دیوانہ بنا دیا۔ کھانا چھوٹ گیا۔ نفیس لباس جاتا رہا۔ ہر وقت اصغری کی یاد میں نالۂ گرم و آہِ سرد۔ جب دل بہت بے قابو ہوا گھر سے نکل کھڑے ہوئے شہر سے تین میل دُور قبرستان میں جا پہنچے اور لختِ جگر کی قبر پر واری صدقے ہو رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وقت سب سے بڑا طبیب ہے، رُوح کا یہ زخم آہستہ آہستہ مندمل ہو گیا مگر اس کا داغ ساری عمر کے لئے رہ گیا۔ جب کسی بچے کو

دیکھتے ہیں زخم ہرا ہو جاتا ہے۔ اصغری کی جُدائی نے ان کا دل گداز کر دیا۔ اور ان کی تحریر میں ایک کسک پیدا ہو گئی جو اُن کے اسٹائل کی ایک نمایاں خصوصیت اور خوبی سمجھی جاتی ہے۔ اصغری کو سدھارے بیس سال ہو گئے مگر آج بھی مرحومہ کا کمرہ جُوں کا توں گھر میں موجود ہے اس کمرے میں اصغری کی سب چیزیں بطور یادگار رکھی ہوئی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچی کھیلتے کھیلتے ابھی کہیں باہر چلی گئی ہے۔

غمِ دُنیا سے بچنے کے لئے انسان چند مشاغل اپنے لئے وضع کر لیتا ہے۔ جن میں انہماک سے مصائب و آلامِ زندگی سے تھوڑی دیر کے لئے نجات مل جاتی ہے۔ اسلم صاحب کے مشاغل میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت ذوقِ خامہ فرسائی کو حاصل ہے۔ ادب کے جملہ شعبوں پر انہیں یکساں طور پر عبور حاصل ہے۔ شاعری سے انہیں مناسبتِ طبعی ہے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز بھی شعر و شاعری سے ہوا مگر اسے کچھ زیادہ کارآمد نہ پا کر نثر کی طرف رجوع ہوئے۔ اور تنقیدی مضامین کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری پر بھی طبیعت مائل ہوئی۔ اس صنف میں اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ آج ان کا شمار ہمارے صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ اب تک کم و بیش ایک ہزار افسانے لکھ چکے ہیں۔ ان میں ہر قسم کے افسانے شامل ہیں۔ رومانی، تصوری، حقائقی، حزینہ، طربیہ، عبرتناک، ہیبتناک۔ اسلم صاحب کے افسانوں کا پسِ منظر بہت وسیع ہے۔ اتنا وسیع کہ ایک عالم پر محیط ہے۔ ہندوستان کے دیہاتوں اور شہروں کے علاوہ یورپ، مصر، رُوس، ترکستان، عرب، چین، اور جاپان کی سرزمین، باشندے رسم و رواج، رہن سہن وغیرہ بھی اسلم صاحب کے موضوعِ افسانے ہیں۔ آپ کو ان افسانوں میں کسی سوسائٹی کی تصویریں ہی نہیں ملینگی بلکہ سوسائٹی کے ہر طبقے

کا سچا عکس ان افسانوں میں آپ کو دھوپ چھاؤں کی طرح دکھائی دے گا۔ کہیں امیر کا محل کھڑا قہقہے لگا رہا ہے اور کہیں غریب کی جھونپڑی آنسو بہا رہی ہے۔ کہیں زندگی کی کش مکش ہے کہیں روحانی سکون۔ کہیں گناہ و موت کی لرزہ خیز داستان ہے کہیں حسن و عشق کی دلکش کہانی ہے کہیں رندی و ہوسناکی کے سنسنی پیدا کرنے والے قصے، کہیں جرم و سزا، انسانی درندگی و شیطنت کی لرزہ خیز داستان۔ کہیں ہنس مکھ مزاجی ہیں جنکی ہر بات لطیفہ ہوتی ہے کہ مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں یا پھر ایک چٹکی کر سہلاتے اور تلملاتے ہی پھرتے۔ ان سب افراد قصہ کی نفسیاتی تحلیل ایک ماہر افسانہ نگار کی طرح لوہے کے چنے چبانا ہے مگر اسلم صاحب نے کچھ اس سادگی سے یہ ہفت خواں طے کیا ہے کہ پڑھنے والے کی طبیعت پر ذرا بار نہیں پڑتا۔ مصنف کا طرز بیان دل کا کنول کھلاتا جاتا ہے۔ اور تأثر افسانے میں طاری و ساری ہو کر پڑھنے والے کے شعور میں غیر محسوس طور پر پھر گھل مل جاتا ہے۔

طبع زاد مضامین کے علاوہ اسلم صاحب نے انگریزی کی بعض مشہور کتابوں کے تراجم بھی کئے ہیں۔ مہدی، طلسم سامری، اور نرگس نے کافی شہرت پائی۔ بالخصوص موخرالذکر نے ترجمہ کی خوبی یہ سمجھی جاتی ہے کہ اصل کی ساری خوبیاں ترجمہ میں قائم رہیں اور عبارت گنجلک نہ ہو۔ اسلم صاحب آسان زبان لکھتے ہیں وہ زبان جو ساری دنیا میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ عبارت آرائی اور ثقیل الفاظ سے مرعوب کرنے کے عادی نہیں ہیں اس لئے ان کا ترجمہ شستہ و رفتہ ہوتا ہے اور پڑھنے والوں کو کتاب میں طبع زاد تصنیف کا لطف آتا ہے انکا ایک معرکتہ الآرا ترجمہ "ہیر رانجھا" ہے۔ جو وارث شاہ کے شاہکار کا ترجمہ ہے جن لوگوں کو پنجابی نہیں آتی انہیں اب تک صرف اتنا معلوم تھا کہ یہ ایک عشقیہ داستان

ہے، دوسری پنجابی عشقیہ داستانوں کی طرح۔ مگر اب جب کہ اس کا ترجمہ پڑھنے کا موقع ملا تو معلوم ہوا کہ یہ تو ادب کا ایک خزانہ ہے جو اب تک پنجابی میں پوشیدہ رہا۔ رومان سے قطع نظر اس کی ایک بیش بہا ادبی حیثیت بھی ہے۔ اچھوتے خیالات نادر تشبیہات لطیف کنائے، فلسفیانہ بحثیں، دلکش مکالمے، خیال انگیز بیان غرض ادب کا ایک شہ پارہ ہے جس سے اب تک ہم محروم رہے۔ اردو کو مالا مال کرنے میں تراجم کا بڑا حصہ ہے۔ اور ہیر رانجھا ایک ایسا اضافہ ہے کہ اسلم صاحب کی یہ سعی ہمیشہ مشکور رہے گی۔

اسلم صاحب کے طبعزاد مضامین کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے بعض سال کے بہترین افسانے قرار دیئے گئے اور گرانقدر انعامات سے ان کی قدر دانی کی گئی۔ تعلیمی اداروں میں ان کی بیشتر کتابیں منظور ہو چکی ہیں۔ پبلشروں میں ہر طرف سے ان کے مسودات کی مانگ رہتی ہے۔ پہلے یہ کسی سے انکار نہیں کرتے تھے اور رسائل کی دلشکنی گناہ سمجھتے تھے مگر جب انہیں تجربہ ہو گیا کہ کیسے کیسے مار آستین پبلشر ہیں تو ان کا خلوص و اعتماد مجروح ہو گیا اور اب محتاط رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ویسے بھی اسلم صاحب زیادہ دوست بنانے کے قائل نہیں ہیں اور تلخ تجربات کی بنا پر انہوں نے ایک طرح سے گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے۔ ان کے حلقۂ احباب میں اکثر حضرات نیاز مندانہ داخل ہوئے، منافقانہ شامل رہے اور ان کے اثر و رسوخ سے فائدہ اٹھا کر معاندانہ رخصت ہوئے اور اب مخالفانہ طرز عمل کو ضروری سمجھتے ہیں۔

اردو میں ناول کی ابتدا ڈپٹی نذیر احمد سے ہوئی اور ان کے اخلاقی و معاشرتی ناول آج تک اسی ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ شرر نے اسلامی تاریخ کو ناول کا موضوع بنایا اور اردو ناول کو کافی فروغ دیا۔ ان کے بعد ناول نگاری میں ابتذال

آنا شروع ہوا اور اس حد تک کہ ناول ایک بدنام لفظ ہو گیا کہ بھلے آدمی اس کے نام سے ہی کانوں پر ہاتھ رکھنے لگے۔ علامہ راشد الخیری اور پریم چند نے اس صنفِ ادب کو پستی سے نکال کر پھر عروج دیا مگر ان دونوں کے انتقال کے ساتھ ناول کی بساط بھی اُلٹ گئی۔ اسی زمانے میں مختصر افسانہ ترقی کے پر لگا کر اُڑا اور سب کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ اسی زمانے میں ناول کو حیاتِ نو دینے کی کئی کوششیں ہوئیں مگر ترجمہ کی حد سے آگے کوئی مُفید نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ پھر ہر افسانہ نگار کو ناول نویسی کا شوق ہو گیا اور متعدد ناول شائع ہوئے۔ منشی پریم چند نے جہاں ناول کو چھوڑا تھا اس سے آگے اسے کوئی نہ بڑھا سکا۔ اسلم صاحب نے بھی اس کمی کو محسوس کیا اور ایک ضخیم ناول شمر لکھ کر بطور نمونہ پبلک کے سامنے پیش کیا۔ پانچ مہینے میں ایک ہزار جلدوں کا ایڈیشن ختم ہو گیا۔ اس کے بعد شام و سحر شائع ہوا۔ اس کی ایک ہزار جلدیں تین ماہ میں ختم ہو گئیں۔ اس کے بعد رقصِ بہار شائع ہوا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ پھر تو اسلم صاحب کے ناولوں کا تانتا بندھ گیا اور ہر سال کئی کئی ناول چھپنے لگے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اُردو کے کسی مصنف کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی کہ اس کی کسی تصنیف کا ایک ایڈیشن تین مہینے ہی میں ختم ہو جائے۔

بظاہر یہ ایک اچنبھا نظر آتا ہے کہ پانچ ہزار صفحے اسلم صاحب نے صرف دو سال میں لکھے اور ان کی قدر دانی سے ثابت ہے کہ ان میں بھرتی کو کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ سب نتیجہ ہے اُن کے ذاتی ذوق شوق کا۔ اُردو سے والہانہ عشق کا۔ مجھے معلوم ہے کہ ان کی پانسو صفحہ کی ایک مشہور کتاب صرف پچیس دن میں لکھی گئی ہے۔ آمد کا یہ حال تھا کہ قلم خیالات کا ساتھ نہ دے سکتا تھا۔ گھنٹوں لکھتے رہتے، دن کو رات کو جب بھی فرصت ملے، یہاں تک کہ بازو شل ہو جاتا اور اُنگلیاں سیدھی نہ ہوتیں۔ برخلاف اس کے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مہینوں کچھ نہیں لکھتے، کچھ لکھا ہی نہیں جاتا۔ یہ بنجر

زمانے ہر مصنف کی زندگی میں آتے ہیں۔

اسلم صاحب کی روز افزوں شہرت و مقبولیت نے بعض تنگ دلوں کو چہ میگوئیاں کرنے پر مجبور کر دیا۔ بعض ادیبوں نے جب یہ آندھی چڑھتی اور اپنے چراغ جھلملاتے دیکھے تو مخالف پروپیگنڈا شروع کر دیا، اور بعض نقادوں نے بھی اس سے متاثر ہو کر غلط سلط رائے زنی کی۔ ایک صاحب نے لکھا کہ اسلم صاحب کی زود نویسی نے انہیں نقصان پہنچایا۔ حالانکہ تنقید کے کسی اصول کے مطابق زود نویسی عیب نہیں سمجھی گئی۔ ایک اور کرم فرمانے فتویٰ دیا کہ اسلم صاحب ضرورت سے لکھتے ہیں۔ ان صاحب کا مطلب یہ تھا کہ اسلم صاحب روپے پیسے کی ضرورت سے مجبور ہو کر لکھتے ہیں، چنانچہ جب انہیں معلوم ہوا ہوگا کہ مالی مشکلات اسلم صاحب کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں تو خود اپنی نظر میں اپنی رائے کی کیا وقعت رہ گئی ہوگی؟ اس قسم کے بعض بے جا اعتراضات سے اسلم صاحب اکثر بددل ہو جاتے ہیں۔ اور شکایت کرتے ہیں کہ ساری عمر اُردو کی خدمت کرنے کا یہ صلہ ملا ہے۔ اسلم صاحب کو خوش ہونا چاہیئے کہ اللہ نے انہیں محسود بنایا ہے اور ان کی محنت و خدمت کا صلہ اصل میں ان کی تصانیف کی مقبولیت و شہرت ہے۔

اسلم صاحب کا دوسرا مشغلہ شکار ہے۔ سُنا ہے کہ نشانہ اچھا لگاتے ہیں۔ اور ان کے ہاں کھالوں کی کثرت سے معلوم ہوتا ہے کہ شکار ان کے پاس خود کھنچ کر چلا آتا ہے۔

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف
بہ اُمید آنکہ روزے بہ شکار خواہی آمد

شکار کے سلسلے میں دیہاتی زندگی کا گہرا مطالعہ کرنے کا اسلم صاحب کو اچھا موقع ملا۔ اس مشاہدہ اور مطالعہ نے ان کے افسانوں کو زندگی کی وہ تازگی و توانائی بخشی ہے جو سُنی سنائی باتوں یا کتابوں سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اُن کے افسانوں میں

جو دلکش منظر کشی ہوتی ہے وہ بھی اسی سیر و شکار کا نتیجہ ہے۔ یوں شکار جو بقول شہنشاہ اورنگ زیب بے کاروں کا کام ہے ان کے لئے ایک کارآمد مشغلہ ثابت ہوا اور دیہاتی زندگی کو ادب سے روشناس کرانے میں اسلم صاحب کا حصہ منشی پریم چند سے کم نہیں۔

اسلم صاحب کا تیسرا مشغلہ موسیقی ہے۔ گراموفون کے سینکڑوں ریکارڈ ان کی دلبستگی کا سامان ہیں، اور جب سے لاسلکی نشریات ہندوستان میں شروع ہوئیں تو ان کے ڈرئینگ روم میں ایک آل ویو ریڈیو سٹ کا اضافہ ہوگیا۔ ان کی حساس طبیعت یوں تو پکّے گانے سے کبھی بیزار نہیں ہوتی مگر ہلکے پھلکے گیتوں سے بہت متأثر ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کے اکثر افسانوں کی تحریک بعض بہت معمولی گیتوں سے ہوئی ہے۔ مثلاً پنجاب کا کوئی ڈھولک گیت انہوں نے سُنا اور دل کو لگ گیا تو اُسے پھر سُنا۔ کچھ بھولے بسرے مناظر اور ان سے وابستہ تاثرات اُجاگر ہونے لگے۔ ریکارڈ پھر بجایا اور پھر بجایا اور بجاتے رہے یہاں تک کہ ایک پورا منصوبہ افسانے کا گٹھ گیا۔ اور جتنی دفعہ بھی ریکارڈ بجایا کہانی کی تفصیلات پرے باندھ باندھ کر سامنے آتی رہیں اور بالآخر خیال کے شیشے میں افسانے کی پری اُتر آئی۔ اسلم صاحب کے ریکارڈوں کا جائزہ لیتے وقت معلوم ہوا کہ ایک ہی گانے کے تین تین ریکارڈ موجود ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دو ریکارڈ گھس کر بالکل بیکار ہو چکے ہیں۔ اس لئے تیسرا ریکارڈ لانا پڑا، اور فلاں عنوان کا جو افسانہ لکھا گیا تھا اس کی تحریک اسی گیت سے ہوئی تھی، لہٰذا افسانے کی فضا پوری طرح طاری کرنے کے لئے یہ ریکارڈ بے شمار مرتبہ سُنا گیا۔ خلوت میں، جلوت میں، اوّل شب، آخر شب، دن کے ہنگامے میں، رات کے سناٹے میں اور جب تصور مکمل ہوگیا تو تصویر پیش کرنے میں بھلا چابکدست مصور کو کیا دشواری ہو سکتی تھی؟ دو گھنٹے نہیں چار گھنٹے۔ مگر اسلم صاحب کے افسانوں کے شائقین کو کیا معلوم کہ افسانہ لکھنے کے لئے انہوں نے کتنی راتیں کالی کی ہیں۔ اور چول سے چول بٹھانے میں انہیں کتنی دماغ سوزی کرنی پڑی ہے کہانی کا پلاٹ مرتب کرنے میں کس ذہنی کرب و اذیت سے انہیں دنوں جدوجہد کرنی پڑی ہے۔ آج اُردو کے مصنفین میں ایم۔ اسلم سے زیادہ ہر دلعزیز اہل قلم اور کوئی نہیں ہے۔ اور یہ شہرت اور مقبولیت انہیں یوں ہی کسی نے ہاتھ اٹھا کر نہیں دے دی بلکہ محنت مشقت دماغ سوزی، دماغ کاست اور آنکھوں کا تیل نکالنے کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ خدا کرے کہ ان کے قلم کی شگفتگی قائم و دائم رہے تاکہ ادب کی معطر کلیاں سدا کھلتی رہیں۔

لگے ہاتھوں اسلم صاحب کے دو ناولوں "چشم لیلیٰ" اور "فریادِ خاموش" کے بارے میں بھی چند باتیں سُن لیجئے۔

سر والٹر اسکاٹ جس کمرے میں بیٹھ کر لکھتے تھے اس کی کھڑکی کچھ اس طرح پر واقع تھی اور میز کچھ اس انداز سے رکھی تھی کہ لکھتے وقت سامنے کے فلیٹ سے صرف ان کا ہاتھ ہی نظر آتا تھا۔ وہ دن بھر لکھتے، رات بھر لکھتے، سامنے کے فلیٹ میں ایک لڑکی رہتی تھی، وہ جب کبھی چھجے پر آتی تو وہ دیکھتی کہ ایک ہاتھ مسلسل چل رہا ہے۔ تو کچھ دن تک اسے غور سے دیکھتی رہی لیکن سمجھنے سے قاصر رہی کہ یہ کیا چیز ہے جو ہر وقت قلم لئے چلتی رہتی ہے؟ البتہ کچھ دن بعد اسے یقین ہوگیا کہ یہ کوئی بھوت ہے اور اس پر یہاں تک اثر ہوا کہ اس نے چھجے پر آنا چھوڑ دیا۔ ایک دن اس نے اپنی ماں سے پوچھا کہ "اماں! یہ کیا چیز ہے جو قلم ہاتھ میں لئے ہر وقت چلتی رہتی ہے۔ نہ کوئی آدمی نظر آتا ہے اور نہ کوئی اور۔ اس کمرہ میں بھوت رہتا ہے۔ جب ہی تو صرف یہ ہاتھ لکھتا رہتا ہے" ماں نے بھی اس چلتے ہوئے ہاتھ کو غور سے دیکھا اور بڑی سٹپٹائی۔ پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ سامنے کے فلیٹ میں والٹر اسکاٹ رہتے ہیں اور وہ اپنے ناول لکھا کرتے ہیں۔

تو صاحب بات یہ ہے کہ ایم۔ اسلم بھی لکھنے کے لحاظ سے اُردو کے والٹر اسکاٹ ہیں۔ وہ جس تیزی کے ساتھ ضخیم ضخیم ناول لکھتے ہیں یہ کچھ انہی کا دل گردہ ہے۔ صبح سے شام تک لکھتے رہتے ہیں۔ رات گئے تک ان کا قلم کاغذ پر چلتا رہے گا اور جب ہاتھ تھک کر شل ہو جائے گا اس وقت کہیں جا کر لکھنا بند کریں گے۔ ان کے لکھنے کی رفتار کا اندازہ اس سے ہو سکتا کہ وہ ضخیم سے ضخیم ناول مہینہ بھر میں لکھ لیتے ہیں۔ آٹھ سو صفحے کی "چشم لیلیٰ" انہوں نے ڈیڑھ ماہ میں لکھ دی اور "فریادِ خاموش" پندرہ بیس دن میں۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں ان کی فارغ البالی کو بڑا دخل ہو کہ اس کے علاوہ انہیں کوئی اور کام نہیں ہے۔ لیکن اور کچھ نہیں اس تیزی اور روانی سے اس کا اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ ان کے دماغ میں پلاٹ کہانی، مکالمہ اور منظر کا بڑا خزانہ پوشیدہ ہے اور ناول اور افسانے لکھنے کی ان میں کس قدر صلاحیتیں پنہاں ہیں۔ اس لحاظ سے ایم۔ اسلم ہی اُردو کے واحد ناول نگار ہیں جو اس قدر تصانیف کے مصنف ہیں۔ کم و بیش وہ اب تک پچاس ہزار صفحات سے اُردو کی خدمت کر چکے ہیں۔ اس لئے مجھے کم از کم یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کے نقاد ایم۔ اسلم کی خدمات کو بالکل ہی نظر انداز کر جاتے ہیں اور جتنی انہیں صلہ کی صورت میں تحسین ملنی چاہیئے تھی وہ نہیں ملی۔

یہی نہیں کہ وہ صرف لکھتے ہی ہیں بلکہ ان کے ناول بڑے شوق سے عوام میں پڑھے بھی جاتے ہیں۔ ان کی کتابیں گرما گرم روٹیوں کی طرح ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عوام ان سے، اور انکی تحریروں سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔ ان کے ہر ناول کا پہلا ایڈیشن تقریباً چار ماہ کے اندر ختم ہو جاتا ہے۔ اور اکثر ناولوں کے ساتھ تو یہ ہوتا ہے کہ اس کے کئی کئی ایڈیشن سال بھر کے اندر ہی چھپ جاتے ہیں، اس کی تازہ مثال "رقصِ ابلیس" ہے سال بھر کے اندر ہی اندر اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو کر عوام و خواص میں مقبول ہو چکے ہیں۔ حافظ نے سچ کہا ہے

قبولِ خاطر و لطفِ سخن خداداد است

عوام کن چیزوں کو پسند کرتے ہیں؟ اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ وہ چیزیں جو عوام کے دلوں کی ترجمانی کرتی ہیں، جو اُن کے محسوسات و جذبات سے قریبی تعلق رکھتی ہیں۔ اس لحاظ سے ایم۔ اسلم کے ناول "عوامی ادب" کے ذیل میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ روس میں ان ناولوں کی بڑی عزت کی جاتی ہے جو عوام میں مقبول ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے کئی ناول نگاروں کو "اسٹالن پرائز" بھی مل چکا ہے۔ ایم۔ اسلم کے ناولوں نے "عوامی ادب" میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ اسلم صاحب عوامی ادیب ہی نہیں ہیں وہ مسلمان بھی ہیں۔ وہ اپنے دل میں اسلامی جذبات اور اسلام کا صحیح درد بھی رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کے ناولوں میں پاکستانی ادب کے اساسی تصورات بھی رواں دواں نظر آتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کے ناول پاکستانی ادب کے ذیل میں بھی آ سکتے ہیں۔ اس وقت اُردو میں کوئی ایسا عوامی ناول نگار نہیں جو ایم۔ اسلم کے مقابلہ میں کھڑا کیا جا سکے۔ ایم۔ اسلم اُردو کے عوامی ادب کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔

ان کے دو تازہ ناولوں میں "چشم لیلیٰ" ایک حسین وادی کے ایک کوہستانی علاقے کی ایک رومانی داستان ہے۔ ایک ایسی مظلوم لڑکی کی داستان جو محبت کی تلاش میں زندگی بھر سرگرداں رہتی ہے لیکن اسے مرد دھوکے میں رکھتا ہے اور اس کی معصوم زندگی سے فائدہ اٹھاتا رہتا ہے۔ اس ناول میں یہ لڑکی اپنی زندگی کی داستان سناتی ہے اور اس کی زندگی کی دل موہ لینے والی داستان پر ہی ناول کا بڑا حصہ مشتمل ہے۔ جب مرزا اس سے پوچھتا ہے کہ تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟ تو وہ جواب دیتی ہے۔

"ایک رنگ رنگیلی دُنیا کی۔ اس دُنیا کی جہاں جوانی کے جذبات بیدار ہو کر

زندگی کے لطف سے آشنا ہوتے ہیں۔ اُس دُنیا کی جہاں آرزوئیں مچلتی ہیں۔ جہاں شوق نشوونما پاتے ہیں۔ اُس دُنیا کی جو قہقہوں کی دُنیا ہے، وہ دُنیا جہاں شباب اور جوانی اپنی قدر قیمت سے بیگانہ نہیں ہوتے۔

لیلیٰ نے اپنی زندگی جیسی گراں بہا چیز بھی اس فریب ہی کی نذر کر دی۔ ناتجربہ کار لڑکی سے اور توقع بھی کیا کی جا سکتی ہے؟ اور آخر میں شہباز اس سے محبت کی پینگیں بڑھاتا ہے لیکن جب اسے اس کی حقیقت معلوم ہوتی ہے تو وہ بھی کترا کر نکل جاتا ہے۔ یہ غمگین لڑکی جس کی ماں ٹھیکیدار کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ یہ ستم رسیدہ لڑکی جس کا باپ اپنی بیوی کے غم میں گھُل گھُل کر مر جاتا ہے۔ یہ فلاکت زدہ لڑکی ایک عیسائی یتیم خانہ میں پرورش پاتی ہے اور یہاں سے ایک مکار مرد اسے بہکا کر لے جاتا ہے اور اُسے اُن امریکی سپاہیوں کے سپُرد کر دیتا ہے جنہیں تفریح کے لئے ایک لڑکی درکار ہوتی ہے۔ لیلیٰ روتی دھوتی ہے مگر بے سود۔ مکار مرد اسے مجبور کرتا ہے۔ ایک گناہ سے بچنے کے لئے اس سے مجبوراً بار بار گناہ سرزد ہوتے ہیں اور آخر کار یہ ایک کوہستانی علاقے میں مریم اور قزاق کے ساتھ رہنے لگتی ہے۔ مرزا پنجاب کا ایک شکاری وہاں پہنچتا ہے۔ جلد ہی دونوں میں اُنس بڑھ جاتا ہے اور لیلیٰ تعلیم یافتہ مہذب اور سمجھدار لڑکی اسے اپنی زندگی کی غمگین داستان سُناتی ہے۔ مرزا لیلیٰ سے حقیقی محبت اور ہمدردی کا ثبوت دیتا ہے اور شہباز کو جس سے وہ محبت کرتی ہے، لیکن جو اب لیلیٰ کے پُرانے واقعات معلوم ہو جانے کی وجہ سے نفرت کرنے لگتا ہے، اس سے ملا دیتا ہے ؎

شکر ایزد کہ میانِ من و اُو صلح فتاد
حوریاں رقص کناں ساغرِ مستانہ زدند

اس طرح چشم لیلیٰ، رومانی اور نشاطیہ داستان بن جاتی ہے۔

آٹھ سو صفحے کے اتنے ضخیم ناول میں فنکارانہ تناسب و توازن رکھنا کچھ ایم۔ اسلم

ہی کا حصہ ہے۔ کرداروں میں لیلیٰ، مرزا، قزاق اور مریم کے کردار جیتے جاگتے انسان ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کردار دل پر ایک خاص اثر چھوڑتا ہے اور ہم ہر کردار کی کسی نہ کسی خوبی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مثلاً لیلیٰ کی معصومیت، ذہانت اور بے باکی۔ مرزا کی حقیقی محبت پاکبازی اور خلوص۔ مریم کی بے لوث خدمت، قزاق کا وحشی پن اور معمر ہونے کے باوجود لیلیٰ سے شادی کرنے کی خواہش۔ اس کی حرکات و سکنات اور بعد میں لیلیٰ کو بیٹی بنا لینا ایک خاص اثر مرتب کرتا ہے۔

ایک بات اس ناول میں اور قابلِ ذکر ہے اور وہ ہے موقع و محل کے مطابق رسیلے گیتوں کا استعمال۔ اور اشعار کی برجستگی تو گویا سونے پر سُہاگہ ہے۔

ایم اسلم کی یہ خصوصیت تو اظہر من الشمس ہے کہ وہ فطری مناظر کو ایسی خوبی سے صفحۂ قرطاس پر لاتے ہیں کہ قارئین اپنے ذہن میں وہ سب کچھ دیکھنے لگتے ہیں جو مصنف دکھانا چاہتا ہے۔ سبزے کی تراوت اور چشموں کی ٹھنڈک تک محسوس ہونے لگتی ہے اور اس طرح یہ منظر محاکات کے لازوال نمونے بن جاتے ہیں۔ مُشتے نمونہ از خروارے۔

"مشاطۂ قدرت نے سبزے کا ایک بہت خوبصورت فرش بچھا رکھا ہے، اس زمردیں فرش پر جا بجا خوشنما اور رنگا رنگ کے پھول بڑی کثرت سے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کے پرستان کی پریوں کے لئے ہمالیہ کے دیوؤں نے ایک عظیم الشان اور بے بدل قالین بچھا رکھا ہے.... کہیں چھوٹی چھوٹی ندیاں پہاڑیوں کے بطن سے پیدا ہو کر پتھروں اور وادیوں کی آغوش میں اچھلتی کودتی، مستی اور شباب کے گیت گاتی کسی تیز رو مسافر کی طرح کسی دُور کی منزل کو چلی جاتی ہیں۔ اور کبھی ان گل ریز وادیوں میں۔ دخترِ خوش خرام پہاڑوں سے اُتر کر وادیوں کے مکینوں کو حیاتِ نو کی نوید دیتی پھرتی ہے:"

ایم اسلم بڑی پاکیزہ زبان لکھتے ہیں اور مکالمے تو بہت ہی چُست اور رواں ہوتے ہیں۔ ناول پڑھتے وقت یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ضرور کہیں ہوا ہے اور اس کا احساس

مصنف کو بھی ہے اسی لئے تو وہ بار بار کہا کرتا ہے۔

"اور جب مجھے یہ خیال آتا ہے کہ کس طرح بعض دوستوں نے یہ حیرت انگیز واقعات میری ہی زندگی کے رومان سمجھ لئے تو مجھے بہت ہنسی آتی ہے۔ خصوصیت سے جمال رام کی کہانی۔ حیات تازہ، فیروزہ، جامِ شکستہ، آشوبِ زمانہ۔ نرگس اور شبِ غم کے متعلق پڑھنے والوں میں سے تو اکثر یہ قسم کھانے کو بھی تیار تھے کہ ان تمام رومانوں کا ہیرو میں ہی ہوں"

"چشم لیلیٰ" جہاں ایک دلکش رومانی ناول ہے۔ اس کے برعکس "فریادِ خاموش" ایک المیہ رومان ہے۔ ایک نوجوان لڑکی کی زندگی کی زبردست ٹریجڈی۔ یہ لڑکی شیام سے محبت کرتی ہے۔ لیکن ناتجربہ کاری کی بنا پر شیام اور لڑکی (سبیتا) دونوں ایک دوسرے سے شادی کے وعدہ وعید کے باوجود دُور ہو جاتے ہیں۔ جب وہ ایک دوسرے سے جُدا ہوتے ہیں اور اس الگ ہونے میں غلط فہمی کو ہی دخل ہے تو سبیتا اس وقت حاملہ ہوتی ہے۔ شیام بھی سبیتا ہی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور سبیتا بھی شیام ہی سے شادی کرنے کی خواہش مند ہے مگر حالات اور زمانہ کے واقعات انہیں دُور سے دُور تر کر دیتے ہیں۔ وہ اپنی عزت کو بچانا چاہتی ہے اور اپنے ایک محسن سوامی کے پاس جاتی ہے اور ان کے ذہن میں سوائے اس کے کوئی حل سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس سے شادی کریں اور باہر والوں پر یہ ظاہر کریں کہ یہ بچّہ ان کا ہے۔ سوامی کی یہ زبردست قربانی تھی۔ لیکن سوامی درپردہ اس کو اپنی بیٹی بنا لیتا ہے۔ اور یہ لڑکی شیام کے غم میں بچّہ ہونے سے پہلے ہی گھُل گھُل کر مر جاتی ہے۔ موت ـــ اور پھر سبیتا کی موت! اس سے زیادہ اور کیا المناک کہانی ہو سکتی ہے۔ یہ کہانی بڑی دلچسپ انداز میں لکھی گئی ہے اور قارئین کے ذہن پر بڑے المیہ تاثرات چھوڑتی ہے۔

ایک بات جو ہمیں ایم اسلم کے ہاں خاص طور سے مُنفرد ملتی ہے وہ ہے پلاٹ کا

ٹیڑھا میڑھا چلنا۔ اگر آپ کوئی ناول شروع کریں تو آپ کو شروع شروع میں اندازہ ہوگا کہ آگے کہانی کچھ اس انداز میں چلے گی۔ لیکن جیسے جیسے آپ ناول پڑھتے جائیں گے آپ کی حیرت و استعجاب میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ واقعات و حالات آپ کی توقع کے خلاف نکلیں گے اور شاید ایم اسلم کے ناولوں میں دلچسپی کا سبب بھی یہی ہے۔ حیرت، بڑے ادب کا جزو لاینفک ہوتی ہے۔ اور اگر حیرت کے احساسات مصنف واضح طور سے ظاہر کر سکے تو یہ اس کی بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ انگریزی اور فرانسیسی ادب میں اس خصوصیت کے حامل مُتعدد ناول ہیں لیکن اُردو میں یہ خصوصیت خال خال ہے۔ اس کی طرف ایم۔ اسلم اپنے ناول کے دیباچہ میں خود لکھتے ہیں کہ۔

"میں جب کوئی ناول لکھنا شروع کرتا ہوں تو یہ کبھی نہیں سوچا کرتا کہ اس کا اختتام یا انجام کیا ہوگا۔ ناول کا اختتام یا انجام واقعات پر مُنحصر ہوتا ہے"

ایم۔ اسلم کے اس نہ سوچنے سے اُن کے ناولوں میں بڑی جان سی آجاتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ایم۔ اسلم جب بھی اپنے ناولوں کے انجام پر غور و فکر کرنے لگیں گے اور جب وہ اپنے ناولوں کو بڑی فکر کے بعد لکھیں گے تو مقبول عام ناول نگار نہ رہیں گے۔

اس کے علاوہ ایک اور خصوصیت جو اُردو کے کسی ناول نگار میں نہیں ہے وہ یہ ہے کہ اگر ایم۔ اسلم کو کوئی ایسا منظر دکھانا ہے جس میں ان کا ہیرو اپنی محبوبہ کے انتظار میں ایک گھنٹہ سے کھڑا ہے لیکن محبوبہ نہیں آتی، تو ایک گھنٹہ تک قاری کو بھی انتظار کی گھڑیاں گنّی پڑیں گی۔ ناول کا پلاٹ وہیں کا وہیں رہے گا اور افسردگی اور تفکّر کا جو احساس ہیرو کے ذہن پر ہوتا ہے وہی قاری کے ذہن پر ہوگا۔ یہ وہ فنی کامیابی ہے جس کے لئے لکھنؤ اور دہلی کے داستان گو مشہور تھے۔ دہلی میں ایسے داستان گو بھی گزرے ہیں جنہوں نے مسلسل چار برس تک روز داستان سنائی اور داستان وہیں کی وہیں رہی جہاں چار سال قبل تھی اور یار کے دیدار کے لئے جو پردہ اٹھنے والا تھا وہ اسی طرح پڑا رہا۔ یہ

فن کا بڑا کمال سمجھا جاتا ہے۔ ٹالسٹائی نے اپنی کتاب "آرٹ کیا ہے؟" میں عظیم فن کی یہی تعریف کی کہ جو اثر مصنف کے ذہن پر مرتب ہوتا ہے اگر وہ اس اثر کو کاغذ پر منتقل کر دے اور پڑھنے والے پر بھی وہی اثر طاری ہو تو یہ فن کا کمال ہے۔ ایم۔ اسلم اس تاثر نگاری میں اس معیار پر پورے اُترتے ہیں۔

ایم۔ اسلم بڑی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ مجھے ان میں اُردو کے ناول کا مستقبل نظر آتا ہے۔ لیکن بہتر ہوتا کہ وہ اب ان رومانوں کو چھوڑ کر تاریخی ناولوں کی طرف توجہ کرتے۔ اُردو میں تاریخی ناولوں کی بے حد کمی ہے۔ اچھے اور بُرے رومان تو مل ہی جاتے ہیں اور پھر ایم۔ اسلم کے متعدد رومان خود موجود ہیں۔ لیکن تاریخی ناول عبدالحلیم شرر کے بعد سے اب تک نظر نہیں آتے۔ تاریخی ناول سے اسلم صاحب اسلامی جذبہ بھی پیدا کر سکیں گے۔ ملک و قوم کی خدمت بھی انجام دے سکیں گے اور مسلمان قوم کو اس کا ماضی دکھا کر اس کے مستقبل کو ایک زبردست جذبہ کے ساتھ درخشاں بھی بنا سکیں گے۔ اس وقت قوم و ملک کو ایم۔ اسلم کے قلم کی، ایم۔ اسلم کی صلاحیتوں کی اس اعتبار سے بڑی ضرورت ہے۔ اس طرح وہ ایسی خدمات انجام دیں گے کہ پاکستان کی اُدبی اور معاشرتی تاریخ میں اُن کا نام جلی حروف میں لکھا جائے گا۔

اسلامی تاریخ کی مختصر کہانیاں ایم۔ اسلم صاحب پہلے لکھ بھی چکے ہیں۔ خود ان کے دل میں مسلمانوں کے لئے سچا درد ہے۔ ناول نگاری تو اُن کا محبوب مشغلہ ہے ہی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اسلامی ناول یا تاریخی ناول لکھیں گے تو نہ صرف کامیابی سے لکھیں گے بلکہ ان کی ہر دلعزیزی میں بھی کئی گُنا اضافہ ہو جائے گا۔ یوں وہ عند الناس مشکور اور عند اللہ ماجور بھی ہوں گے۔

(اس مضمون کا کچھ حصہ بیس بائیس سال پہلے لکھا گیا تھا اور کچھ حصہ

دس بارہ سال پہلے۔ مضمون کی نظر ثانی میں نے کر دی ہے مگر اس میں کسی قسم کا ردوبدل کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ گزشتہ دس سال میں اسلم صاحب نے متعدد اسلامی تاریخ کے ناول بھی لکھ دیئے ہیں، اور ناولوں کا ایک ایسا سلسلہ بھی شروع کر رکھا ہے جس میں آنحضرت صلعم کی سیرت پاک مکمل طور پر آجائے گی۔ یہ ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ انشاء اللہ۔)

جوشؔ ملیح آبادی ــــ دیدہ و شُنیدہ

میرے والدِ مرحوم کو اُردو کی نئی مطبوعات منگانے کا شوق تھا۔ کتابیں اور رسالے چھپتے ہی ان کے پاس پہنچ جایا کرتے تھے۔ غالباً ۲۵ء یا ۲۶ء کا ذکر ہے کہ نئی کتابوں میں ایک کتاب "روحِ ادب" بھی آئی تھی۔ یہ کتاب اس زمانہ میں شائع ہونے والی کتابوں سے یکسر مختلف تھی۔ اس کی ہر بات انوکھی تھی۔ "بانگ درا" کے سائز پر چھپی تھی، جو اس زمانے میں بالکل مُروّج نہیں تھا۔ کتابت و طباعت بڑی دیدہ زیب تھی۔ چند تصویریں بھی اس کتاب میں شامل تھیں۔ "روحِ ادب" میں چھوٹے چھوٹے شاعرانہ مضامین تھے۔ شاعرانہ مختصر مضامین لکھنے کا خبط اب سے چالیس سال پہلے ہر ادیب کو تھا۔ بلکہ اسے کمالِ نثر نگاری سمجھا جاتا تھا کہ ایسی عبارت لکھی جائے جس میں موٹے موٹے عربی فارسی کے الفاظ اور مغلق ترکیبیں ہوں اور اصل بات بہت ذرا سی ہو۔ بلکہ اگر اصل بات سرے سے اس میں ہو ہی نہیں تو اور بھی اچھا۔ اس صورت میں یہ تحریر ادیب کا شاہکار بن جاتی تھی۔ ایسے ہر ادیب کی ہر تحریر شاہکار تصوّر کی جاتی تھی۔ کتنے ہی ادیب ایسے تھے جو صرف شاہکار ہی لکھا کرتے تھے۔ اصل میں یہ بیماری گیتانجلی کے ترجمے سے اُردو میں پھیلی تھی۔ ٹیگور کی مابعد الطبیعاتی شاعری کو یار لوگ سمجھے ہوں یا نہ سمجھے ہوں جھٹ اس کے ترجمہ پر اُتر آئے۔ چونکہ ٹیگور کو نوبل پرائز ملا تھا اس لئے یہ سمجھ لیا گیا کہ ضرور اس میں کوئی بڑے کام کی بات کہی گئی ہے۔ حالانکہ آج تک یورپ والوں ہی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ طارمی اور ماترلنک

قسم کے شاعر یہ کیا فرما گئے ہیں کہ ؎

ایک دروازہ کھُلا
ایک دروازہ بند ہوا اور
ایک بچّے کے رونے کی آواز آئی۔

اُنھیں یہی معلوم نہ ہو سکا کہ اس پر کہاں سر دُھنا جائے؟ ٹیگور نے بھی یہی گُر استعمال کیا اور ئیٹس نے اُسے جھنڈے پر چڑھا دیا۔ اُردو کی شامتِ اعمال، یہ کتاب کہیں سے نیازؔ فتحپوری کے ہاتھ لگ گئی۔ "عرضِ نغمہ" کے نام سے اس کا ترجمہ فوراً تیار ہو گیا۔ نام ہی دیکھ لیجئے "عرضِ نغمہ"۔ اس کے اندر جو گت ٹیگور کے شاہکار کی بنی ہے اسے کسی وقت فرصت سے دیکھئے گا تو اس کے جوہر آپ پر کھُل جائیں گے۔ ہمارے ادیبوں کے ہاتھ ایک سہل نسخہ لکھنے لکھانے کا آیا، لگے سب کے سب عرضِ نغمہ کرنے۔ البتہ اتنا اضافہ ٹیگور پر اور کیا کہ اپنی تحریروں میں بہت سارے آہ ــــ ڈیش اور نقطے اور ڈنڈے (!) جہاں تہاں ڈال دیئے تاکہ پڑھنے والے ان ڈیشوں اور ڈنڈوں سے نفسِ مضمون کی ہتھیلی پر سر پھُٹوّل کرتے رہیں۔ پیاز کو چھیلئے، پرت ہی پرت اُترتے چلے جائیں گے، مغز آپ کہیں نہیں پائیں گے۔ یہی حال اس نیازی یا پیازی ادب کا تھا جسے "ادبِ لطیف" موسوم کیا گیا۔ جو در اصل ہماری نثر کا "چوما چاٹی اور سانڈے کے تیل" کا دَور تھا۔

بات میں سے بات نکل آئی ؎

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تری جوانی تک

ہاں تو ذکر تھا "روحِ ادب" کا۔ اس میں جو نثر پارے درج تھے ان کا اندازِ تحریر روشِ عام سے یکسر مختلف تھا۔ واقعی یہ معلوم ہوتا تھا کہ نثر میں نظمیں لکھی گئی ہیں۔ مُصنّف کا نام تھا نواب شبیر حسین خان جوشؔ ملیح آبادی۔ میں نے جوشؔ صاحب کو پہلی

سے جانا پہچانا۔ اس کے بعد "ہمایوں" میں ان کا کلام بالالتزام شائع ہونے لگا اور بعض اور مقتدر ادبی رسالوں میں بھی۔ "ساقی" میں جنوری ۱۹۳۰ء یعنی پہلے ہی پرچے سے جوش صاحب کا کلام آنے لگا۔ ۳۲ء میں مجھے اپنے منجھلے بھائی مبشر احمد اور دوسرے عزیزوں سے ملنے حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا۔ مجھے جن ادیبوں اور شاعروں سے حیدرآباد میں ملنا تھا ان کی فہرست خاصی طویل تھی۔ منجھو صاحب پولیس کے آدمی! انھیں تمام سلسلوں کی خبر تھی۔ فہرست دیکھ کر بولے "فرحت اللہ بیگ سے تمہیں سید وزیر حسن ملوائیں گے۔ فانی، جوش اور علی اختر سے کرنل اشرف الحق۔ مولوی عنایت اللہ سے تابش۔ میں بھی ساتھ چلا چلوں گا۔ تمکین کاظمی تو یہ سامنے ادارۂ علمیہ میں روز شام کو آتا ہے۔ اور یہ ناکارہ اور آوارہ اور کون کون ہے؟ انھیں تھانے میں یہیں کیوں نہ بلوا لیا جائے؟" میں نے کہا "مناسب نہیں ہوگا۔ پہلے میں ایک ایک بار سب کے ہاں ہو آؤں۔" بولے "تو پھر یہ کرتے ہیں کہ تھانے میں نہیں کھانے پر سب کو بلائے لیتے ہیں۔" میں نے کہا "اسے بھی بعد کے لئے اٹھا رکھو۔" یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کرنل اشرف الحق باہر ہی سے آوازیں دیتے در آئے۔ "شاہد کہاں ہے، شاہد کہاں ہے؟" میں دوڑ کر ان سے لپٹ گیا۔ اس وقت مجھ سے عمر میں دُگنے تھے۔ میرے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ چودہ سال ولایت میں رہ کر ایڈنبرا سے ڈاکٹری کی سند لے کر آئے تھے اور قلعہ گولکنڈہ میں افواجِ باقاعدہ کے بڑے ڈاکٹر تھے۔ اللہ اُن کی روح کو نہ شرمائے ہر وقت اتنی پیتے تھے کہ مرنے لگتے تھے۔ وہ تو شراب کو کیا چھوڑتے شراب انہیں چھوڑ دیتی تھی۔ اچھے ہونے کے بعد مہینوں نہیں پیتے تھے، پھر کوئی دوست اُکسا دیتا اور سلسلہ پھر جاری ہو جاتا۔ مگر اتنی پینے پر بھی میں نے ڈاکٹر صاحب کو کبھی بہکتے یا مدہوش ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ اس قدر عجیب و غریب کردار کے آدمی تھے کہ اُن پر ایک علیحدہ مضمون لکھنے کی ضرورت ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ منجملہ اور صفات کے شعر کہنے کا بھی خاص ملکہ رکھتے تھے۔ مگر ہزل گو کیا

نرا کُھرا فحش۔ "عریاں" تخلص تھا۔ شعر شاعری کی وجہ سے حیدرآباد کے تمام شاعروں سے تعلق تھا۔ اور سب کا دم بھی ان سے نکلتا تھا کیونکہ ذرا سی بات پر فحش ہجو لکھ دیا کرتے تھے، اور ستم بالائے ستم یہ کہ خود جا کر اسے سُنا بھی دیتے تھے۔ خیر تو ڈاکٹر صاحب سے یہ طے ہو گیا کہ جوش صاحب سے مجھے وہ اگلے دن ملوا دیں گے۔ دوسرے دن صبح دس بجے ڈاکٹر صاحب آئے اور مجھے دارالترجمہ لے گئے۔ سب سے پہلے ابوالخیر مودودی سے ملوایا جو ابوالاعلیٰ مودودی کے بڑے بھائی تھے۔ دھان پان سے نرم و نازک آدمی تھے مگر ان کے لفظ لفظ سے علمیت ٹپکتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ خوش اخلاق سے کھانے پر مدعو کیا۔ مولانا عمادی سے ملوایا۔ انھوں نے بھی دعوت کی پیشکش کی۔ جوش صاحب سے ملوایا۔ گرمجوشی سے ملے۔ دعوت کا دن مقرر کر لیا۔ باہر نکل کر میں نے کہا "بھائی جان، اگر دعوتیں ایسی فراخ دلی سے منظور کی گئیں تو منجھو صاحب بگڑ جائیں گے۔" بولے۔ "میں منجھو کو سمجھاؤں گا۔" اس کے بعد گھڑی دیکھ کر بولے "ابھی دوپہر کے کھانے میں کچھ دیر ہے، لگے ہاتھوں علی اختر سے بھی مل لو۔" میں نے کہا "چلئے۔" علی اختر کے گھر پہنچے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ لڑکا برآمد ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا "ابا ہیں؟" "وہ ہیں" کہہ کر اندر بھاگا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا "سُنو۔ اُن سے بولو شاہد احمد دہلوی ملنے آئے ہیں۔" لڑکا میرا نام جانتا تھا، ایک نظر اس نے مجھے دیکھا اور تیزی ہو گیا۔ پانچ منٹ گذر گئے واپس نہیں آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ آج کل علی اختر کے سارے جسم پر پھوڑے پھنسیاں نکل آئی ہیں۔ دوا لے بیٹھا ہوگا۔ دفتر سے چھٹی لے رکھی ہے۔ بارے لڑکا منہ لٹکائے واپس آیا اور نیچی نظریں کئے بولا "ابا کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔" جب ہم کار میں واپس آ بیٹھے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا "گھر ہی میں تھا" میں نے پوچھا "تو ملے کیوں نہیں؟" بولے "کل معلوم ہو جائے گا۔" اگلے دن ڈاکٹر صاحب علی اختر کے ہاں سے ہوتے ہوئے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ "علی اختر ملے تھے اور بہت

شرمندہ تھے کہ کل تم سے نہیں ملے۔ دراصل اس بیچارے کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ تمہاری دعوت کرسکے۔ یہاں کا رواج یہی ہے کہ مہمان کی دعوت ضرور کی جاتی ہے۔" انکی اس حرکت پر مجھے غصہ بھی آیا اور ترس بھی آیا کہ محض ایک بیہودہ رواج کے باعث اس دفعہ اُن سے ملاقات نہ ہوسکی۔

جوشؔ صاحب کے ہاں ڈاکٹر صاحب مجھے لے گئے۔ خاصی پُرتکلّف دعوت تھی۔ دسترخوان پر ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر صاحب بڑے زندہ دل آدمی تھے۔ روتوں کو ہنساتے تھے۔ جوشؔ صاحب شاعر بھی تھے اور بادہ خوار بھی، اس لئے ڈاکٹر صاحب سے ان کی خوب نبھتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی زبانی مجھے جوشؔ صاحب کے بہت سارے واقعات معلوم ہوئے۔ ان میں سے چند آگے بیان ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب عمدہ ولایتی شراب پیا کرتے تھے۔ جوشؔ صاحب بلانوش تھے، جو بھی مل جائے چڑھا جاتے تھے۔ انہیں جب بھی فرصت ملتی شام کو ڈاکٹر صاحب کے ہاں جا پہنچتے۔ عمدہ اور مُفت کی ملتی تھی اس لئے گلاس پر گلاس چڑھائے چلے جاتے۔ ڈاکٹر صاحب دو تین گلاسوں میں چھک جاتے تھے۔ بوتل یا تو ہفتہ میں ایک خرچ ہوتی تھی یا اب تیسرے ہی دن ان کی بیوی کہہ دیتیں کہ آپ شہر جائیں تو اپنی بوتل لیتے آئیں۔ شروع شروع میں تو یہ ڈھرا چلتا رہا مگر جب مہنگا پڑنے لگا تو ڈاکٹر صاحب کے نشے ہرن ہونے لگے۔ ایک دن شہر گئے تو ایک ولایتی بوتل بھی لائے اور دیسی ٹھرّے کی بھی۔ ٹھرا دیکھ کر ان کی بیوی چمکیں۔ "جب ٹھرا آپ کو نہیں پچتا تو آپ کیوں لائے ہیں؟ اُس موئے شرابی نے آپ کو بھی ٹھرّے پر لگا دیا۔" ڈاکٹر صاحب نے بڑی متانت سے کہا "یہ ٹھرا اسی موئے شرابی کے لئے ہے۔" ڈاکٹر صاحب گلاس خود کبھی نہیں بناتے تھے۔ گھر میں بیوی بنا کر دیتی تھیں اور گھر کے باہر ایک مُلازم جو ہمیشہ ساتھ رہتا تھا۔ اب یہ ہونے لگا کہ جب جوشؔ صاحب آجاتے تو ڈاکٹر صاحب کے آواز لگانے پر مُلازم دو گلاس بیگم صاحب سے بنوا کر یا خود بنا کر لاتا اور ٹھرّے والا گلاس

جوشؔ صاحب کو پکڑا دیتا۔ جوشؔ صاحب کہتے کہ آپ نے بھی دیسی پینی شروع کردی؟ تو ڈاکٹر صاحب کہتے ہاں، مگر یہ دیسی اچھی ہے۔ فریب کا یہ سلسلہ دو دن جاری رہا۔ بعد میں ڈاکٹر صاحب نے خود ہی اس کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اُن کے دل میں کوئی بات رہتی نہیں تھی۔ شاید ہر شرابی کا دل مُنافقت سے خالی ہوجایا کرتا ہے۔

جب جوشؔ صاحب کے لئے نظامِ دکن میر عثمان علی خان نے ملک بدری کا فرمان جاری کیا تو مجھے کسی نے حیدرآباد سے اطلاع دی کہ ساقی میں غزل گر سے خطاب "جو نظم جوشؔ کی چھپی ہے اس پر یہ عتاب ہوا ہے۔ پیشی کے ایک مُنہ چڑھے آدمی نے نظام کو سنکا دیا کہ حضور یہ گستاخی جوشؔ نے آپ کی شان میں کی ہے۔ اُس زمانے میں جریدۂ شاہی اور روزنامہ رہبر دکن میں روزانہ میر عثمان علی خان کی ایک پُھسپھسی سی غزل مع رائے اُستاد جلیلؔ چھپا کرتی تھی۔ یہ رائے بھی حضرت خود ہی لکھ دیا کرتے تھے کہ "سبحان اللہ! کیا غزل ہوئی ہے۔" مجھے اطلاع دینے والے نے یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ شاید ریاست میں ساقیؔ کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا جائے گا۔ مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ جوشؔ کو چوبیس گھنٹے میں ممالکِ محروسہ سے نکل جانے کا حکم ملا تھا۔ یہ بارہ ہی گھنٹے میں وہاں سے نکل لئے کہ کہیں ضبطی اور قید کا دوسرا فرمان جاری نہ ہوجائے۔ "رہبر دکن" میں روزانہ ذرا ذرا سی بات پر فرمان نکلتے رہتے تھے۔ "سبحان اللہ" پڑھنے کے لائق ہوتی تھی عبارت ان فرمانوں کی۔ کاش کوئی انھیں جمع کر کے شائع کردے۔ خوجی اور حاجی بغلول کو آپ بھول جائیں گے۔ خیر، یہ ایک الگ کہانی ہے۔ دراصل نظام کے منجھلے شہزادے مُعظّم جاہ کے شبینہ دربار میں جوشؔ کا عمل دخل ضرورت سے زیادہ ہوگیا تھا۔ اس دربار کے واقعات سُن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ شررؔ کا دربارِ حرام پور اس کے آگے گرد تھا۔ جوشؔ اس دربار کے حاضر باش تھے۔ میں نے حیدرآباد کے ثقہ راویوں سے سُنا ہے کہ معظّم جاہ کے اشارے پر کُل حاضرباش ننگے ہو کر ناچنے لگتے تھے، اور اس کے بعد جو کچھ ہوتا تھا وہ لکھا نہیں جاسکتا۔ اگر کوئی پھیر دفدا نہیں نکڑ کرتا

تو پیش خدمتوں کو حکم ہوتا کہ آپ کو نہلا دو۔ وہ اس غریب کو اُٹھالے جاتے اور پچھاڑ کر اتنی پلاتے کہ اُسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہتا پھر اسے دربار میں برہنہ کرکے پیش کیا جاتا اور اُسے اوندھا کر کے جلتی ہوئی موم بتی لگادی جاتی۔ یہ منظر دیکھ کر سب کے دلوں کے کنول کھل جاتے۔ اور جب وہ ہوش میں آتا تو اس سے کہا جاتا "آئندہ سرکار کے کسی حکم سے سرتابی نہ کرنا۔" ان تمام بیہودگیوں کی اطلاع عالیجاہ کو پہنچتی رہتی تھی مگر وہ شفقتِ پدری میں مرے جاتے تھے۔ بیٹے سے تو کچھ نہ کہتے اس کے حاضر باشوں کی تاک میں لگ جاتے۔ چنانچہ طویلے کی بلا بندر کے سر جوش پر نزلہ گرانے کا انھیں بہانہ ہاتھ آگیا۔ جوش صاحب حیدرآباد چھوڑنے کے کچھ عرصہ بعد دلّی آگئے۔

حیدرآباد میں جوش صاحب دارالترجمہ میں ناظرِ ادبی تھے۔ سُنا ہے کہ علامہ اقبال سے کسی بڑے آدمی کے نام تعارفی اور سفارشی خط لے کر حیدرآباد گئے تھے۔ نرا کھرا شاعر سوائے شعر کہنے کے اور کیا کرسکتا ہے؟ مگر اس وقت مہاراجہ کشن پرشاد جیسے علم دوست برسرِ اقتدار تھے۔ وہ شاعروں کو بھی کہیں نہ کہیں کھپا دیا کرتے تھے۔ چنانچہ فانی کو انہوں نے کسی اسکول کا ہیڈ ماسٹر بنا دیا تھا اور یگانہ کو کہیں اضلاع میں سب رجسٹرار رکھوا دیا تھا۔ جوش کو انہوں نے دارالترجمہ کی پول میں دھانس دیا۔ ان کا کام یہ تھا کہ تراجم کی نظرِ ثانی کیا کریں۔ وہاں وہ کیا کرتے ہوں گے! اس کا اندازہ یہاں ترقی اُردو بورڈ میں ان کی کارکردگی سے ہوا۔ بورڈ نے اُردو کی نایاب اور کم یاب کتابوں کے شائع کرنے کا انتظام کیا ہے۔ مولوی نذیر احمد کی کتاب "منتخب الحکایات" کے متعلق بورڈ کے سکریٹری شان الحق صاحب کا ایک مُراسلہ میرے نام آیا کہ آپ اس مطبوعہ کتاب میں جو غلطیاں کتابت و طباعت کی وجہ سے داخل ہوگئی ہیں ان کی تصحیح کر دیجئے اور کتاب پر آٹھ دس صفحے کا مقدمہ لکھ دیجئے۔ پاکستان میں یہ کتاب مجھے کہیں نہیں ملی، لہٰذا دلّی سے اس کا ایک نسخہ کسی نہ کسی طرح منگایا اور اُسے ٹھیک ٹھاک کرکے بورڈ کو بھیج دیا۔ ایک مہینہ بعد حقی صاحب کا ٹیلیفون

آیا کہ منتخب الحکایات کا کوئی اور نسخہ ہو تو بورڈ کو بھیج دیجئے۔ بورڈ اس کی قیمت ادا کردیگا۔ میں نے کہا قیمت تو اس کی چھ آنے یا آٹھ آنے ہی ہے مگر وہ کتاب ملتی کہاں ہے! پہلے بھی مشکل سے ملی تھی۔ معلوم ہوا کہ ناظرِ ادبی نے نہ صرف میرے مقدمہ کی زبان ٹھیک کردی بلکہ اصل کتاب کی زبان بھی ٹھیک کردی۔ اور فقرے کے فقرے اس بُری طرح کاٹے ہیں کہ اصل عبارت پڑھی نہیں جاسکتی۔ میں نے کہا خیر میری زبان تو وہ ٹھیک کرسکتے ہیں مگر جس کی کتابیں پڑھ کر ہم سب نے اُردو زبان سیکھی ہے، اس کی زبان میں بھی جوش صاحب کو غلطیاں نظر آگئیں۔ ذرا مجھے اصلاح شدہ نسخہ بھیج دیجئے۔ تاکہ میں بھی جوش صاحب کے افادات سے محروم نہ رہوں۔ حقی صاحب بُردبار آدمی ہیں، انھوں نے بہ لطائف الحیل اس قضیہ کو ٹالا اور میں نے دلّی سے ایک اور نسخہ مُہیا کرکے انھیں بھیجا۔ دارالترجمہ کے ناظم مولوی عنایت اللہ مرحوم بڑے مرنجاں مرنج آدمی تھے۔ ان کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ جوش صاحب سے خوش نہیں تھے۔ جب کام کرنے کا یہ اسلوب ہو تو کوئی خوش ہو بھی کیسے سکتا ہے؟

دلّی آنے کے بعد جوش صاحب نے ایک ادبی ماہنامہ جاری کیا۔ انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ جو ادبی ماہنامے شائع ہو رہے ہیں اُن کی مالی حالت کیسی ہے اور انھیں کیسے چلایا جا رہا ہے۔ یار لوگوں نے ورغلایا اور جوش صاحب چڑھ گئے سُولی پر۔ دریا گنج میں ایک مکان کرایہ پر لیا گیا اور بڑیوں کے کٹڑے میں دفتر کے لئے ایک بالاخانہ کروفر سے سجایا گیا۔ ایک دفعہ مجھے بھی اس دفتر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ جوش صاحب کو واہ واہ کرنے والے گھیرے رہتے۔ دن بھر چائے، شربت، پان، سگریٹ سے تواضع ہوتی۔ اِدھر سورج غروب ہوا اُدھر جوش صاحب پیمانہ بکف طلوع ہوئے۔ مُفت خوروں کو بھی چُسکی لگانے کا موقع ملا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ یہ شغل رہا۔ اس کے بعد سب اپنے اپنے گھر سدھارے۔ ادبی رسالے کہیں ایسی شاہ خرچیوں

سے چلتے ہیں؟ چند مہینے بعد دفتر چھوڑنا پڑا۔ گھر ہی میں دفتر بھی چلا گیا، پرچہ چلنے کی کوئی صورت نہیں نکلی۔ جوشؔ صاحب کو یہ مغالطہ تھا کہ جتنی اچھی وہ نظم لکھتے ہیں اتنی ہی اچھی نثر بھی لکھتے ہیں۔ ایک نیا مضمون نگار اسرائیل احمد خاں انھوں نے خدا جانے کہاں سے تلاش کر کے نکالا تھا۔ وہ اینڈے بینڈے مضامین لکھا کرتا تھا۔ یہ زمانہ تھا ہمایوں، ادبی دنیا، نیرنگِ خیال، عالمگیر اور ساقی کے شباب کا۔ جوشؔ صاحب نے محسوس کر لیا کہ پبلک بڑی ناقدرشناس ہے، وہ نسل کبھی مستقبلِ بعید میں پیدا ہوگی جو اُن کے رسالہ "کلیم" کی صحیح قدردانی کر سکے گی۔ رسالہ بند کرنے کے بعد انھوں نے ایک مقامی پبلشر سے اپنی کتابیں چھپوانے کا معاملہ کیا۔ چندے ان کی رائلٹی پر گزارہ ہوا۔ پھر یہ سُنا کہ ملیح آباد کی طرف ان کا کوئی بہت بڑا زمیندار عزیز مر رہا ہے یا مر گیا ہے اور اس کی پوری املاک کے وارث جوشؔ صاحب ہی ہیں۔ اب انھیں کئی کروڑ روپیہ ملنے والا ہے اسلئے وہ دلّی سے چلے گئے ہیں۔ یہ سننے میں آج تک نہیں آیا کہ انھیں وہاں سے کیا ملا۔

جوشؔ صاحب کے دورانِ قیامِ دہلی ہی میں ایک دفعہ کرنل اشرف الحق دلّی آئے تو مجھ سے کہا کہ جوشؔ صاحب کے ہاں چلو۔ میں نے کہا "مجھے تو اُن کا گھر معلوم نہیں کہ کہاں ہے۔ کہیں دریا گنج میں رہتے ہیں۔ پھر آپ ہی نے تو کہا تھا کہ جوشؔ سے دُور کی دوستی رکھنا۔ ویسے بھی میں شعر شاعری کا آدمی نہیں، اور نہ جوشؔ کا ہم مشرب۔ آج تک میں اُن کے گھر نہیں گیا اور نہ وہ میرے گھر آئے۔ سرِراہے ملے یا کسی اجتماع میں اُن سے سرسری سی ملاقات ہو جایا کرتی ہے۔ آپ اُن کے ہاں ہو آئیے میں ساتھ جا کر کیا کروں گا؟" ڈاکٹر صاحب نے اُس زمانے میں شراب بالکل چھوڑ رکھی تھی۔ بولے "تمہارا چلنا ضروری ہے۔ اگر وہاں پینے پلانے کا قصہ ہوا تو تم مجھے روک سکو گے۔" لہذا مجھے ان کے ساتھ جانا پڑا۔

مغرب کے بعد ہم جوشؔ صاحب کے مکان پر پہنچے۔ نیچے ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں جوشؔ صاحب کے ساتھ پانچ سات آدمی بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو

دیکھا تو سب نے اٹھ کر تعظیم دی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا "شاہد کو تو جانتے ہو نا؟" جوشؔ صاحب نے کہا "جی ہاں۔ مگر کبھی ملاقات نہیں ہوتی۔" بیٹھنے کے بعد اوروں سے تعارف ہوا۔ حکیم آزاد انصاری کو میں پہلے سے جانتا تھا۔ اب وہ جوشؔ صاحب کے ہاں مستقلاً آن پڑے تھے۔ بڑھاپے اور بیماری میں اِن کا کوئی پرسانِ حال نہیں رہا تھا۔ کبھی کسی کے ہاں اور کبھی کسی کے ہاں جا پڑتے۔ میزبان ان کے ہنر کی وجہ سے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیتا۔ اس کے بعد اُن سے شعر کہلوا کہلوا کر اپنی بیاض بھرتا۔ جب وہ اپنے شعر دینے میں پس و پیش کرتے تو میزبان اُپرانے لگتا۔ حکیم صاحب اس بے عزتی اور ناقدری کو تاڑ جاتے اور کسی اور شاگرد یا قدردان کے ہاں اٹھ جاتے۔ ایک صاحب کا تو پورا دیوان آزاد انصاری ہی کا کہا ہوا ہے۔ دلّی میں انہوں نے کئی ٹھکانے بدلے۔ آخر میں ایک مفلس مگر مخلص شاگرد کے ہاں چلے گئے تھے، اور جب اُن کی حالت بگڑی اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تو وہ غریب شاگرد حیدرآباد انھیں لے کر پہنچا، اور ان کے بیٹے کے گھر انھیں چھوڑ آیا۔ بیٹا اچھا خاصا پیسے والا تھا، مگر بہ کراہ اس نے باپ کو وصول کیا۔ بڈھے میں دھرا ہی کیا تھا۔ دو چار دن بعد اللہ کو پیارا ہو گیا۔ تو یہ آزاد انصاری بھی جوشؔ صاحب کے ہاں موجود تھے۔ نہالؔ سیوہاروی بھی پہنچے ہوئے تھے۔ دَورِ شراب تو ہو ہی رہا تھا۔ ایک گلاس ڈاکٹر صاحب کے لئے اور ایک میرے لئے تیار کر کے پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا "شاہد تو نہیں پیتے، اور میں نے بھی آج کل چھوڑ رکھی ہے۔" جوشؔ صاحب نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بے ساختہ اُن کے منہ سے نکلا ؎

ساقی کے مُدیر اور نہیں ہیں مخمور
برعکس نہند نامِ زنگی کافور!

کیا واقعی بالکل نہیں؟" میں نے کہا "جی ہاں، میں نہیں پیتا۔" جوشؔ صاحب نے ازراہِ عنایت مزید اصرار نہیں کیا مگر ڈاکٹر صاحب سے بولے "جی یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کو تو پینی پڑے گی۔" یہ کہہ کر اُن کے ہاتھ میں گلاس تھما دیا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو ٹہوکا دیا مگر انھوں نے متاسف نظروں سے میری طرف دیکھا اور چُپکے سے بولے "جوشؔ نہیں مانتا، تھوڑی سی پی لینے میں

کوئی مضائقہ نہیں۔" جوش صاحب کو سُرور گنٹھ رہا تھا، اُن کی گُل افشانی شروع ہو گئی۔ بلا کا حافظہ پایا ہے اس شخص نے۔ نثر پڑھتا جاتا تھا اور زبان کھلتی جاتی تھی۔ ملحدانہ رباعیوں کے بعد اپنا فحش کلام سُنانا شروع کر دیا۔ جب وہ بھی ختم ہو گیا تو فی البدیہہ کہنا شروع کر دیا۔ مگر آخر میں اعتراف بھی کیا کہ اس کا اُستاد تو رفیع احمد خاں ہے۔ دو گھنٹے بعد میں نے اجازت چاہی تو ڈاکٹر صاحب بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے قدم لڑکھڑا رہے۔ بولے "شاہد، تم مجھے گھر پہنچا کر جانا۔" باہر نکل کر میں نے تراہا بیرم خاں کا تانگہ کیا۔ پھاٹک سے ڈیوڑھی حویلی تک انہیں سہارا دے کر لے گیا۔ نیچے کرایہ دار تھے، اوپر کی منزل میں ڈاکٹر صاحب کا قیام تھا۔ زینہ طے کرنا ایک عذاب ہو گیا۔ جب انہیں ان کے کمرے میں پہنچایا تو اُن کی چھوٹی بیگم جو اُن کے ساتھ آئی تھیں بولیں "شاہد میاں، یہ کیا کیا؟" ڈاکٹر صاحب پھٹی پھٹی آنکھوں سے بیوی کی طرف دیکھتے رہے۔ میں نے کہا "بھابی، یہ جوش صاحب کے ہاں سے آ رہے ہیں۔" چیخ کر بولیں "اس ماٹی ملے کے پاس انہیں کون لے گیا تھا؟" میں نے کہا "خود ہی گئے تھے۔"

"شاہد میاں، تم نے بھی انہیں نہیں روکا؟"

"روکا تھا، بھلا یہ رُکنے والے ہیں؟"

ڈاکٹر صاحب بڑبڑائے "عباسی، شاہد کو جانے دو۔ اُسے دیر ہو رہی ہے۔"

اس کے بعد خدا جانے میاں بیوی میں کیا فضیحتا ہوا۔ اگلے دن ڈاکٹر صاحب میرے ہاں آئے تو اُن کے بیگ میں ولایتی بوتل موجود تھی اور وہ ہر آدھ گھنٹہ بعد گلاس بنواتے اور پیتے رہے۔ ان کی شراب پھر شروع ہو گئی تھی اور اب خود اُن کے روکے بھی نہیں رُک سکتی تھی۔ پھر دو دن تک ڈاکٹر صاحب نہیں آئے تو مجھے مزاج پُرسی کے لئے اُن کے گھر جانا پڑا۔ پہلے بھابی اور بچوں کا کمرہ بیچ میں پڑتا تھا۔ بھابی کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ بولیں "نہ کچھ کھا سکتے ہیں اور نہ پی سکتے ہیں۔ اُبکائی لگی ہوئی ہے۔" ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں جا کر دیکھا کہ وہ بے سُدھ پلنگ پر پڑے ہوئے ہیں اور ڈاکٹر محمد عمر اُن کے سرہانے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میرے جاتے ہی

ڈاکٹر عمر نے میری ٹانگ لی: "اماں کیوں لے گئے تھے انہیں اس کے پاس؟" میں نے کہا "اب کیفیت کیا ہے؟" بولے "مر رہے ہیں۔" میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ وہیں، اُلٹی سیتیں لگے پڑیں۔ پھر ڈاکٹر صاحب کو بھی کھانسی اُٹھی اور وہ اُرکتے ہوئے اُٹھ بیٹھے۔ آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے، چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی۔ سینے میں سانس نہ سماتا تھا۔ مگر خوش مزاجی کی وہی کیفیت۔ ہانپ کر بولے "بھائی ــــ یہ عمر کہتا ہے کہ میں مر رہا ہوں، مگر میں مروں گا نہیں۔ عباسی ایک گلاس بنا دینا۔" ڈاکٹر عمر نے کہا "مرنے سے بدتر تو ہو گئے مگر چھوڑتے اب بھی نہیں۔" بولے "تیری طرح کم ظرف تھوڑی ہوں، پینے کا نام بھی بدنام کرتا ہے۔" اتنے میں عباسی بیگم گلاس بنا لائیں۔ ڈاکٹر صاحب کے مُنہ سے لگا دیا۔ پی کر بولے "بھائی اب میری دوا یہی ہے۔" غرض ڈاکٹر صاحب ایک ہفتہ تک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ بیہوشی میں ڈاکٹر عمر اُن کے انجکشن لگاتے رہے۔ ہوش میں آنے کے بعد انہوں نے شراب نہیں پی۔ مہینہ بھر میں سانٹے ہو گئے اور خیر سے حیدرآباد سدھارے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ پطرس بخاری نے مجھے رُقعہ بھیجا اور زبانی بھی کہلوا بھیجا کہ سالک صاحب آئے ہوئے ہیں، کل رات کا کھانا میرے ساتھ کھانا۔ میں وقتِ مقررہ سے کسی قدر پہلے پہنچ گیا تاکہ سالک صاحب سے باتیں کرنے کا موقع مل جائے۔ ہم دو چار آدمی سالک صاحب سے گپ شپ کر رہے تھے کہ جوش صاحب بھی آن پہنچے۔ علیک سلیک کے بعد کوٹھی کے برآمدے میں گئے۔ وہاں جگل کشور مہرا بیٹھے ہوئے تھے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اور پطرس بخاری کے پرسنل اسسٹنٹ تھے۔ جوش صاحب نے اُن سے پوچھا "پینے پلانے کے لئے کیا ہے؟" انہوں نے گھبرا کر کہا "بخاری صاحب تو نہیں پیتے۔" جوش صاحب نے کہا "وہ نہیں پیتے تو کیا ہم تو پیتے ہیں۔ جاؤ بخاری صاحب سے کہو کہ ہمارے لئے کچھ پینے کو بھیجیں۔" وہ دوڑے ہوئے آئے اور بخاری سے کچھ کھسر پھسر کر کے پھر جوش صاحب کے پاس پہنچے۔ خبر نہیں ان دونوں کے درمیان کیا گزری۔ مہمان آنے شروع ہو گئے

آنے والوں میں بڑے متضاد قسم کے لوگ تھے۔ خواجہ حسن نظامی بھی تھے اور دیوان سنگھ مفتون بھی۔ تقریباً بیس جنادری قسم کے حضرات کھانے پر جمع ہو گئے۔ جوش صاحب الگ گھاس پر ٹہلتے رہے تھے۔ مجھے اُن کے قریب جگہ ملی۔ پوچھنے لگے "اسے کس نے بلالیا؟" میں نے کہا "کسے؟" خواجہ صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ بولے "جب سے یہ آیا ہے واللہ کفن و کافور کی بو چلی آرہی ہے۔" ان کے اس فقرے کا مزہ اوروں نے بھی لیا اور بات شدہ شدہ بخاری صاحب تک بھی پہنچ گئی۔ وہ کھلکھلا کر ہنسے۔ اس کے بعد جوش صاحب نے بھری بزم بخاری صاحب کو مخاطب کر کے کہا "دو شعر ہو گئے ہیں، سُن لیجئے۔" مجھے تو شعر دیر یاد نہیں رہتے مطلب یہ تھا کہ نام تو بخاری ہے مگر ٹھنڈی اتنی سی ہے کہ پینے کو شراب مانگو تو ملتا ہے ٹھنڈا، برف کا سادہ پانی۔ سب نے واہ واہ سبحان اللہ میں ان اشعار کو اُڑا دیا۔ خود بخاری صاحب نے کسی قسم کی ناگواری کا اظہار نہیں کیا بلکہ خوب داد دی۔

فتحپوری کے قریب ایک ہوٹل میں فراق گورکھپوری دلی آکر ٹھہرے تھے۔ شام کو اُن کے کمرے میں بہت سارے پینے والے شاعر جمع ہوئے۔ ان میں جوش، نہال، مجاز، اور تاثیر بھی تھے۔ جوش صاحب تو شاعرِ انقلاب ہونے کے علاوہ شاعرِ اعظم بھی ہیں مگر اپنے پندار میں فراق اُن سے اپنے آپ کو کم نہیں کچھ زیادہ ہی سمجھتے تھے۔ جوش نے جب رُباعیاں کہنی شروع کیں تو فراق نے بھی اُردو ہندی آمیز زبان میں روپ سروپ کی رُباعیوں کی بھرمار شروع کر دی۔ جوش صاحب نے کبھی کسی سے مقابلہ نہیں کیا۔ خبر نہیں یہ اُن کی بزدلی ہے یا شرافت۔ مگر فراق صاحب ہمیشہ میدان میں اُتر آتے ہیں اور شمشیرِ بُراں بن جاتے ہیں۔ ویسے تو جوش اور فراق میں بڑا دوستانہ تھا اور دونوں ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے مگر فراق جوش کو اپنا حریف سمجھتے تھے۔ جب ہوٹل کے کمرے میں کئی دور ہو گئے تو پینے والوں کے دل کھل گئے اور دلوں کے ساتھ زبانیں بھی کھل گئیں۔ جوش اور فراق میں چلنی شروع ہوئی، پہلے مذاق ہی مذاق میں پھر نشہ زدہ سنجیدگی کے ساتھ۔ حاضرین میں سے کچھ جوش کے ساتھ ہو گئے اور کچھ فراق کے ساتھ۔ فراق کچھ حد سے آگے ہی نکل گئے۔ نوبت تیز مزاجی اور گالی گلوچ تک پہنچی۔ اس میں ذرا کمی آتی تو تاثیر کبھی جوش کو شہ دیتا اور کبھی فراق کو۔ فراق ایسے بے قابو ہوئے کہ ماں بہن کی گالیوں پر اُتر آئے۔ جوش نے ان گالیوں کو بھی کڑوا گھونٹ بنا کر حلق سے نیچے اُتار لیا مگر جب فراق نے بیٹی کی گالی دی تو جوش کے تیور بگڑ گئے۔ بولے "ہم پٹھان ہیں، اب ہم آپ کو قتل کر دیں گے۔" یہ کہکر اٹھنے لگے تو سب نے بڑھ کر ان کو پکڑ لیا اور معاملہ رفع دفع کیا۔ اس سارے قضیئے میں تاثیر کے چہرے پر جو بشاشت کی خوشی تھی وہ دیکھنے کی چیز تھی۔

جوش صاحب اور علی اختر مرحوم کا کسی بات پر اختلاف ہوا۔ دونوں میں بڑی دوستی تھی۔ کوئی بڑی بیہودہ بات ہوئی ہو گی جوش صاحب کی طرف سے۔ جو علی اختر جیسے سادھو قسم کے آدمی کو ناگوار گزری۔ اس زمانے میں نیاز فتحپوری بھی حیدرآباد پہنچے ہوئے تھے۔ ان کے مراسم دونوں شاعروں سے تھے۔ علی اختر تو بیچارے خاموش ہو گئے مگر نیاز صاحب نے محسوس کیا کہ انہیں جوش سے بدلہ لینا چاہیئے چنانچہ لکھنؤ واپس پہنچ کر نیاز صاحب نے "نگار" میں کلامِ جوش پر تنقید لکھنے کا سلسلہ جاری کر دیا۔ جوش نے بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا کہ یکسر خاموشی اختیار کی۔ نیاز صاحب بک جھک کر خود ہی خاموش ہو رہے۔ جس نوعیت کی تنقید نیاز صاحب لکھتے ہیں اس سے خود اپنی علمی فوقیت جتانا مقصود ہوتا ہے مگر پڑھنے والا بھانپ جاتا ہے کہ اس میں جو کچھ نوعیت ہوتی ہے خلوص مطلق نہیں ہوتا: "اس مصرعہ میں ہ دب رہی ہے۔ یہ مصرعہ چُست نہیں ہے۔ پہلے مصرعہ کا دوسرے مصرعہ سے ربط نہیں ہے۔ اس میں تنافر ہے۔ اگر یہ مصرعہ یوں ہوتا تو بہتر تھا۔" اس کے بعد وہ اپنی اصلاح پیش کر دیتے ہیں اور شعر کا اگلا روپ بھی کھو دیتے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے "نگار" کا "جگر نمبر" شائع کیا ہے۔ اُن کا

اندازِ تنقید ملاحظہ فرمایا جائے۔

کرنل اشرف الحق بڑے جہاں دیدہ اور گرم و سردِ زمانہ چشیدہ آدمی تھے۔ اُوپر سے بالکل ٹھنڈے اور اندر لاوا کھولتا رہتا تھا۔ دو چار ہی باتوں میں تاڑ جاتے تھے کہ کون کتنے پانی میں ہے، ورنہ آزمانے کے لئے کوئی اشغلہ چھوڑ دیتے تھے۔ دکن میں کاماٹنیں رکھنے کا عام رواج تھا۔ یہ نیچ قوم کی جوان عورتیں ہوتی ہیں جو عموماً اُوپر کے کام کے لئے رکھی جاتی ہیں۔ ایسی ہی ایک سنگِ اسود کی ترشی ہوئی جوان کاماٹن یلاّ ڈاکٹر اشرف کے ہاں مُلازم تھی۔ راوی نے بیان کیا کہ ایک شام کو آواز دینے پر یلاّ دو گلاس اندر سے بنوا کر لائی۔ جوشؔ صاحب اس کالی پری کو دیکھ کر دیکھتے ہی رہ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا "دیکھتے کیا ہو، اُوپرے جاؤ"۔ بس اتنا کہنا کافی تھا، آگئے ترنگ میں۔ لگے ایک طرف لے جا کر التفات کرنے۔ اس نے جھڑک دیا۔ ناکام واپس آئے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا "سُنو جوشؔ، بیوی میری بھی جوان ہے۔ تمہارا کیا اعتبار، کل کو تم اُس پر بھی ہاتھ ڈال دو گے۔ لہٰذا آج سے یہ سلسلہ بند"۔ جوشؔ پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور شرمندگی میں انہوں نے واقعی گولکنڈہ آنا جانا چھوڑ دیا۔ ڈاکٹر صاحب ہی جوشؔ کے پاس پہنچ جایا کرتے تھے۔

دلّی میں ایک جیّد عالم ہیں مولانا عبدالسلام۔ قلندر مزاج اور یونانِ قدیم کے رواقی فلسفیوں جیسے آدمی ہیں۔ عربی، فارسی اور اُردو کے منتہی ہیں۔ جس علم سے کہو خدا کے وجود کو ثابت کر دیتے ہیں۔ اُن کا سکوت پہاڑوں کا سکوت اور گفتگو دریاؤں کی روانی ہے۔ اب تو اسّی سے اُونچے ہوں گے۔ جوشؔ صاحب جب دلّی آئے تو اُن کی تعریف سُن کر اُن سے ملنے گئے۔ مولانا نے جب جوشؔ صاحب کے خیالات سُنے تو اُن کا ناریل چٹخا۔ بولے "تمہارا دماغ تو شیطان کی کھُڈّی ہے"۔ اس سے مختصر اور جامع تجزیہ جوشؔ صاحب کا نہیں ہو سکتا۔

جوشؔ صاحب کٹّر کانگریسی تھے۔ مسلمانوں سے انہیں کیا ملتا؟ مُسلمان اُنکے ملحدانہ اور گستاخانہ خیالات کی وجہ سے انہیں بُرا سمجھتے تھے، لہٰذا یہ ہندوؤں سے جا ملے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور مسز سروجنی نائیڈو جیسے ادب دوستوں نے اُن کی سرپرستی قبول کر لی تھی۔ ایسے رکابیہ مذہب والوں کا کوئی کردار تو ہوتا ہی نہیں۔ جہاں دیکھتا توا پرات، وہیں گزاری ساری رات۔ کردار تھا یگانہؔ کا کہ بھوکوں مرا، ذلت و خواری اُٹھائی، اور مرتے مر گیا مگر اپنی بات پر اڑا رہا۔ جوشؔ نے ہمیشہ اپنے تر نوالے کی خیر منائی۔ جو شخص خدا کا مذاق اڑا سکتا ہے اور ابلیس و ابوجہل کی عظمت کی قسم کھا سکتا ہے۔ اس کے لئے پاکستان اور قائد اعظم کو بُرا بھلا کہنا کیا مُشکل ہے۔ جو شخص ازراہِ تمسخر نہیں بلکہ نہایت سنجیدگی سے ایسی باتیں کرتا ہو تو اس کے لئے مُسلمان کیا اور پاکستان کیا! ڈٹ کر پاکستان کی مخالفت کی اور قیام پاکستان کے بعد ہندوستان ہی میں رہ گئے۔ ہندو پرستی کا یہ عالم رہا کہ گاندھی جی کے ہلاک ہونے پر جوشؔ صاحب نے اپنی نظم "شہیدِ اعظم" لکھی۔ ہر چند کہ جوشؔ صاحب کے گزشتہ اعمال اس لائق تھے کہ انہیں پاکستان بدر کر دیا جاتا تاہم پاکستان کی حکومت اور پاکستان کے عوام نے وسیع القلبی سے کام لے کر انہیں امان دی اور ترقی اُردو بورڈ میں سولہ سو روپے ماہانہ پر لغت نویسی کے کام پر انہیں لگا دیا۔ جوشؔ اور لغت نویسی! مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ! یہی وہ زمانہ تھا کہ موصوف نے ایک طویل نظم "چنا جور گرم" لکھی جس میں پاکستان کی بھبتی اُڑائی اور جسے وہ بڑے طُمطراق سے اپنے مخصوص حلقوں میں سُنانے پھرتے تھے۔ بے دینی اور پاکستان دشمنی کے باوجود، اور حکومتِ ہند کی سرپرستی کے باوصف جوشؔ صاحب ہندوستان میں نہیں رہ سکے اور پاکستان آ گئے۔ خبر نہیں اُن کی غیرت نے اِسے کیسے قبول کر لیا۔ بے دینی کا داغ چھپانے کے لئے انہوں نے مرثیے کہنے شروع کئے اور پاکستان دوستی کے اظہار کیلئے صدر ایوب کی

کی شان میں ایک ناصحانہ قصیدہ کہا، جوتیوں سمیت آنکھوں میں گھسنا اس کو کہتے ہیں۔

پاکستان بن جانے کے بعد جو مسلمان ہندوستان میں رہ گئے تھے ان کی وفاداری کو ہمیشہ شُبہ کی نظر سے حکومت ہند نے دیکھا۔ یہاں تک کہ ابوالکلام آزاد کے بعض بیانات پر پٹیل نے انہیں بھی مطعون کیا۔ مگر جوشؔ صاحب کی وفاداری کسی کو مُشتبہ نظر نہ آئی۔ پنڈت نہرو مُروّت کے آدمی ہیں، انہوں نے ان کے حلوے مانڈے کا انتظام کردیا۔ تقریباً دو ہزار روپے ماہانہ کی انہیں یافت کرادی گئی۔ کام کچھ نہیں، صرف نگرانی اور مشورہ۔ حکومتِ ہند نے انہیں "پدم بھوشن" کے اعلیٰ خطاب سے بھی نواز دیا۔ دس سال تک جوشؔ صاحب ہندوستان میں خوب موج مارتے رہے۔ لیکن ہندو ایک مسلمان کو اچھے حالات میں دیکھنا بھلا کیسے پسند کرسکتے تھے۔ تاک میں لگے رہتے۔ اور ان کی ذرا ذرا سی بات کی گرفت کرتے۔ جوشؔ صاحب ایک غیر محتاط آدمی، قدم قدم پر ان سے لغزش ہوتی۔ خفیف الحرکتی اور بعض غلط باتیں بھی کرتے۔ یار لوگ بڑھا چڑھا کر اُوپر کے حلقوں میں پہنچاتے اور وزیرِ اعظم کے کان بھرتے۔ پنڈت جی طرح دے جاتے۔ مگر چشم پوشی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ سُنا ہے کہ جوشؔ صاحب کی ساکھ اتنی بگڑ گئی کہ ہندوستان میں ان کا مزید قیام خطرے میں پڑ گیا۔ جب دلّی کی فضا ان کے لئے ضرورت سے زیادہ گرم ہوگئی تو انہوں نے پاکستان کا رُخ کیا۔ یہاں آکر کراچی کے چیف کمشنر نقوی سے ملے اور اُن کے ذریعہ صدر سکندر مرزا سے۔ و صاحب! یہاں کوئی چار ہزار روپے ماہانہ کا اُن کے لئے انتظام ہوگیا۔ یہاں کا معاملہ پکا کر کے موصوف پھر دلّی پہنچے اور سُنا ہے کہ پاکستان کی پیشکش دکھا کر پنڈت جی سے پھر معاملت کرنی چاہی۔ مگر وہاں سے جواب مل گیا کہ آپ کا پاکستان چلا جانا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ اُردو ہندی اور اپنے بچّوں کے مستقبل پر ایک بیان دے کر جوشؔ صاحب کراچی چلے آئے۔ اِدھر اخبار والوں کو سُن گُن مل گئی کہ نقوی صاحب نے جوشؔ پروری کے لئے کیا کیا اسباب مُہیا کئے ہیں۔ اُردو اخباروں میں لے دے شروع ہوگئی اور جوشؔ صاحب "از آں سُو راندہ و ازیں سُو درماندہ" کی زندہ مثال بن کر رہ گئے۔ چار ہزار روپے ماہوار کا سُہانا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔

اپنے موجودہ حالات سے جوشؔ صاحب سخت نامطمئن و ناخوش ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ مجھ پر پندرہ بیس افرادِ خاندان کا بار ہے۔ اپنی اولاد کے علاوہ اولاد کی اولاد کے بھی جوشؔ صاحب ہی کفیل ہیں۔ بیاہی تیاہی بیٹی اور داماد بھی انہی کے سر ہیں۔ سُنا ہے کہ داماد صاحب بی۔ اے، بی۔ ٹی ہیں۔ اسکول کی ملازمت کو بہت گھٹیا چیز تصور کرتے ہیں۔ حضرت جوشؔ کا داماد اور اسکول ماسٹری! دُنیا کیا کہے گی! لہٰذا مع بیوی اور جوان جوان بچّوں کے جوشؔ کے گھر میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور شاعرِ انقلاب کی عزت و آبرو کی حفاظت کر رہے ہیں۔ جوشؔ صاحب ستّر کے پیٹے میں ہیں۔ اتنی عمر اور اتنی دُنیا دیکھنے کے بعد بھی ان کے مزاج کا بھولپن نہیں گیا۔

بھولپن پر اُن کے مزاج کا ایک اور پہلو یاد آگیا۔ اپنی شاعری کی بدولت جوشؔ صاحب ہمیشہ سے حکّام رس رہے ہیں۔ اہلِ غرض انہیں گھیرے رہتے ہیں۔ سعی سفارش کرنے میں ذرا بھی بچر بچر نہیں کرتے۔ سفارش بیشتر نالائقوں ہی کی کی جاتی ہے۔ جوشؔ صاحب نے کسی بڑے آدمی سے کسی کی سفارش کی اور اس کی تعریف کے پُل بھی باندھ دیئے۔ بڑے آدمی نے کہا "مگر جوشؔ صاحب، یہ صاحب تو اس جگہ کے لئے موزوں نہیں ہیں۔"

"جی اور کیا بالکل ناموزوں ہیں۔"

"تو اس صورت میں یہ جگہ تو انہیں نہیں دی جا سکتی۔"

چلیے چُھٹّی ہوئی۔ امیدوار سے کہدیا کہ "صاحب آپ تو اس جگہ کیلئے قطعی ناموزوں ہیں۔"

اس نے واویلا مچایا کہ "حضرت مجھ سے زیادہ موزوں تو کوئی اور ہے ہی نہیں۔"

"یقیناً آپ سے زیادہ موزوں کوئی اور کیسے ہوسکتا ہے۔"

"صاحب یہ بڑا متعصب افسر ہے۔"

"جی ہاں۔ میرا بھی یہی اندازہ ہے۔ سخت متعصب ہے کم بخت۔"

غالباً جوشؔ صاحب سب کو خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے ان کی گفتگو ہمیشہ اثباتی ہوتی ہے۔ اسے آپ چاہیں تو ان کا بھولپن کہہ لیں، چاہے یہ کہہ لیں کہ جوشؔ صاحب بے پیندی کے بدھنے ہیں۔

اسی سے ملتا جلتا واقعہ گلڈ کے قیام کے وقت پیش آیا۔ جمیل جالبی صاحب سے جوشؔ صاحب کا خاصہ ربط ضبط ہے۔ طے پایا کہ جمیل صاحب جا کر جوشؔ صاحب کو گلڈ کے پہلے اجلاس میں شرکت کی دعوت دیں۔ جمیل صاحب نے مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ ڈرگ روڈ میں اُن کی کوٹھی پر پہنچ کر پھاٹک پیٹا تو ایک ادھیڑ عمر کے صاحب تشریف لائے اور بولے "آیا، میں اطلاع کرتا ہوں۔" جمیل صاحب نے بتایا کہ یہی وہ جوشؔ صاحب کے معروف داماد ہیں جو کچھ نہیں کرتے۔ تھوڑی دیر میں لوٹ کے آئے اور بولے "چلے جائیے۔" کمرے میں جوشؔ صاحب براجمان تھے اور ان کے چند ہوا خواہ انہیں گھیرے ہوئے تھے۔ جمیل صاحب نے گلڈ کی مختصر رُوداد سُنائی اور جوشؔ صاحب سے شرکت کی استدعا کی۔ بولے "ضرور، ضرور۔ مگر آپ آکر مجھے لے جائیں۔" جمیل صاحب نے کہا "میں خود آکر آپ کو لے جاؤں گا۔" مگر وقتِ مقررہ پر جب جمیل صاحب انہیں لینے گئے تو بے نیلِ مرام واپس آئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جو لوگ انہیں گھیرے رہتے ہیں انہوں نے جوشؔ صاحب کو یہ کہہ کر اُکسا دیا کہ گلڈ کی طرف سے آپ کو کوئی عہدہ تو پیش ہی نہیں کیا گیا۔ اس صورت میں آپ کا جانا مناسب نہیں۔ دوسرے دن الیکشن ہونے والا تھا۔ اس میں پانچ چھ سو ادیب اور شاعر عہدیداروں اور مجلس عاملہ وغیرہ کا انتخاب کرنے والے تھے۔ گھر بیٹھے جوشؔ صاحب کو عہدہ کون دے جاتا؟ چنانچہ آج تک جوشؔ صاحب گلڈ کے ممبر نہیں بنے اور اُن کے دل میں یہی سمائی ہوئی ہے کہ انہیں گلڈ میں کوئی بڑا عہدہ ملنا چاہیئے۔ گویا گلڈ میں عہدوں کی خیرات بٹ رہی ہے جس کی تقسیم ان کے گھر سے شروع ہونی چاہیئے۔

بہت سی خرابیاں ہیں جوشؔ صاحب میں۔ خرابیاں سب میں ہوتی ہیں کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ مگر اپنی تمام خرابیوں کے باوجود جوشؔ ایک مقناطیسی شخصیت کے مالک ہیں۔ اُن سے طبیعت مُتنفر نہیں ہوتی۔ اُن سے محبت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ شعر کا تو اُن کے جواب ہی نہیں ہے۔ مشاعروں میں جب وہ پڑھتے ہیں تو سب کے چراغ گُل ہو جاتے ہیں۔ باتیں بھی بھولی بھولی اور مزے دار کرتے ہیں۔ بس۔ وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی۔ ایک پٹا ہوا مفلس شاعر پاکستان میں اُن سے لپٹ گیا۔ کبھی حیدر آباد میں ان کی جان کو لگا رہتا تھا۔ کچھ عرصہ ہوا اچانک اس کا انتقال ہو گیا۔ اللہ اس کی روح کو نہ شرمائے بڑا ہی بے غیرت تھا۔ جوشؔ صاحب نے اس کا نام ہی کُتا رکھ دیا تھا۔ سنٹرل ہوٹل میں جوشؔ صاحب کو کسی نے عصرانہ دیا۔ عصرانہ ختم ہوا، جوشؔ صاحب نے اپنا کلام سُنانا شروع کیا کہ مرحوم سپڑ سپڑ کرتا آ پہنچا۔ جوشؔ صاحب نے میزبان سے کہا "دیکھو، وہ کتا آیا ہے، اُسے کچھ کھانے کو دو۔" کتے نے خوب سیر ہو کر کھایا اور داد دینے آ بیٹھا۔ مرحوم ہر فن مولا تھا، نثر بھی لکھتا تھا، شعر بھی کہتا تھا، یزید کی تعریف میں ایک پوری کتاب بھی اس نے لکھی تھی جسے چھاپنے کے لئے اسے کوئی پبلشر نہیں ملتا تھا۔ گانے بجانے میں بھی کچھ دخل تھا۔ کھانے بھی پکا لیتا تھا۔ ایک دفعہ جوشؔ صاحب سے بولا۔

"مچھلی تو کبھی میں آپ کو پکا کر کھلاؤں گا۔ آپ اُنگلیاں ہی چاٹتے رہ جائیں گے۔"

"ارے بھئی تو کھلاؤ نا کسی دن۔"

"کل ہی لیجئے۔"

لگے دن وہ مچھلی پکا کے لے گیا۔ اچھی پکائی تھی، مگر چلتے وقت پتیلی کے ساتھ سولہ روپے کچھ آنے بھی لاگت کے جوشؔ صاحب سے لے گیا۔

جوشؔ صاحب جس گھن گرج کے شعر کہتے ہیں پڑھتے بھی اسی گھن گرج سے ہیں۔ روزانہ صبح کو باقاعدگی سے شعر کہتے ہیں۔ شائقین اُن کا کلام سننے کے لئے بے تاب رہتے

ہیں۔ آج تک کوئی پھسپھسا شعر اُن کا نہیں سُنا۔ سابق چیف کمشنر نقوی نے سابق صدر سکندر مرزا کو باور کرادیا تھا کہ جوش اُردو کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ یہ لطیفہ حکومت کے ایک بڑے عہدیدار نے سُنایا کہ کوئی وزیر قسم کا انگریز پاکستان آیا ہوا تھا۔ ایوانِ صدر میں اسکے اعزاز میں ڈنر تھا۔ معزز مہمانوں میں جوش صاحب بھی شامل تھے۔ آج کل ڈنر کھڑا کھانا (بُوفے) ہوتا ہے۔ کھاتے بھی جاؤ اور ذرا ٹہل ٹہل کر مہمانوں سے باتیں بھی کرتے جاؤ۔ معزز مہمان کے ساتھ ٹہلتے ہوئے سکندر مرزا جوش صاحب کے قریب آگئے۔ جوش صاحب کا نام تو انہیں یاد نہ آیا تعارف کراتے ہوئے بولے۔

"MEET THE GREATEST POET OF URDU"

وہ بھی ایک ہی بوجھ بجھکڑ تھا۔ ہاتھ بڑھا کر بولا۔

"OH I SEE! SO YOU ARE MR. GHALIB."

انجمن دانشورانِ ادب کے صدر جناب عبدالخالق عبدالرزاق ایک قابل اور علم دوست آدمی ہیں۔ اصل وطن تو دلّی تھا مگر سالہا سال سے کراچی میں رہتے ہیں۔ سگریٹ کنگ کہلاتے ہیں۔ مہینے دو مہینے میں اُن کے ہاں ایک پُر تکلف دعوت ہوتی ہے۔ جس میں پندرہ بیس ممبر اور دو چار اعزازی مہمان شریک ہوتے ہیں۔ اتفاق سے اس انجمن کے تقریباً تمام ممبر خوش خور بھی ہیں (سوائے جناب صدر کے، جو کھاتے کم ہیں مگر کھلا کر زیادہ خوش ہوتے ہیں)، لہٰذا شیخ صاحب کھانے کا نت نیا اہتمام کرتے ہیں۔ کبھی بریانی اور قورمہ کی دعوت ہوتی ہے، کبھی سیخ کے کباب اور پوریوں کی، کبھی مُرغ مسلّم کی، اور کبھی آموں کی۔ جاڑوں میں نہاری اور پایوں کی دعوت ہوتی ہے۔ کبھی کبھی اس میں جوش صاحب بھی شریک ہوتے ہیں۔ شیخ صاحب ان کے قدردان اور ناز بردار ہیں۔ اسلئے اُن کے لئے عمدہ سے عمدہ شراب بھی منگواتے ہیں۔ مغرب کے بعد ہی مہمان جمع ہوجاتے ہیں۔ فضلی، ماہر القادری، محمد تقی، رئیس امروہوی، جون ایلیا، رازق الخیری، اے ڈی اظہر،

صہبا لکھنوی، ممتاز حسین، شان الحق حقی، الطاف گوہر، مہاجر صاحب اور کئی اور حضرات جن کے نام اس وقت یاد نہیں آرہے شیخ صاحب کی کوٹھی کے کُشادہ اور سر سبز صحن میں بیضوی حلقے میں کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ مہمان آتے جاتے ہیں اور بیٹھتے جاتے ہیں۔ ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی ہیں۔ جوش صاحب کی میز الگ ایک طرف لگی ہوئی ہے۔ شراب کی بوتل ہے، سوڈا ہے، تھرمس میں برف کی ڈلیاں ہیں۔ دو گلاس ہیں۔ ایک ٹائم پیس بھی میز پر دھری ہوئی ہے۔ کیونکہ جوش صاحب گھڑی رکھکر پیا کرتے ہیں۔ وقت ختم ہوا شراب کا دور ختم ہوا۔ مجاز مرحوم کو بھی جوش صاحب نے نصیحت کی تھی کہ میاں گھڑی رکھکر پیا کرو۔ اس بلانوش نے جواب میں کہا تھا کہ "میرا بس چلے تو گھڑا رکھ کر پیئیں"۔

جوش صاحب کا ساتھ دینے کے لئے ایک اور صاحب جا بیٹھے ہیں۔ جوش پیتے رہتے ہیں، یہ چُسکی لگاتے رہتے ہیں۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں جوش صاحب پانچ چھ گلاس پی جاتے ہیں، یہ دو ہی میں چھلک جاتے ہیں اور جب کھڑے ہوتے ہیں تو ان کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگتی ہیں۔ جوش صاحب میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔ کھانے کا وقت ہوگیا۔ لمبی میز پر کھانا چُنا گیا۔ کھڑا کھانا بھی ہوتا ہے اور بیٹھا کھانا بھی۔ جوش صاحب کا کھانا انہی کی میز پر پہنچ گیا۔ ماشاء اللہ خوش خور ہیں۔ جبھی تو ستّر سال کی عمر میں بھی ٹانٹے بنے ہوئے ہیں۔ سچ ہے "ایک ڈاڑھ چلے، ستّر بلا ٹلے"۔ شیخ صاحب ایک ایک کے پاس جاکر کہتے ہیں "آپ نے یہ تو لیا ہی نہیں"۔ "آپ تو کچھ کھا ہی نہیں رہے"۔ "بھائی آپ کیا کر رہے ہیں؟ یہ لیجئے نا"۔ اصرار کر کر کے سب کو کھلا رہے ہیں۔ "شیخ صاحب، آپ بھی تو کچھ لیجئے نا" "جی ہاں، میں بھی کھا رہا ہوں"۔ یہ کہہ کر انھوں نے کچھ چینگ لیا اور آگے بڑھ گئے۔ ماہر القادری کھانے کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتے ہیں۔ یعنی اتنا کہ اس کے بعد مزید انصاف کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ اتنے

میں برف میں لگے ہوئے آم آجاتے ہیں تو مولانا تاسّف سے فرماتے ہیں: "ارے! یہ تو پہلے بتا دینا چاہیئے تھا کہ آم بھی ہیں۔" میں نے کہا "یہی تو نقصان ہے مولانا شارٹ ہینڈ میں کھانے کا۔" اور صہبا کہتے ہیں: "قوم کا نقصان کر دیا شیخ صاحب نے۔" پھر قوم آموں پر دست درازی شروع کرتی ہے مگر مولانا ماہر القادری بھی تین دانوں سے زیادہ نہیں کھا سکتے۔ آموں سے نمٹنے نہیں پاتے کہ آئس کریم آجاتی ہے۔ مولانا افسردگی سے کہتے ہیں "لیجئے ابھی یہ بھی باقی ہے۔" اس کے لئے بھی کہیں نہ کہیں گنجائش نکل آتی ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر سب کرسیوں کے حلقے میں آ بیٹھتے ہیں۔ جوشؔ صاحب بھی حلقے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ان کے دائیں ہاتھ سے شعر خوانی کا چکر چلتا ہے۔ شاعر اپنا اپنا کلام سُناتے ہیں۔ آخر میں جوشؔ صاحب کا نمبر آتا ہے۔ وہ خوب اسٹیم بھر چکے ہیں۔ ایک بیاض سامنے رکھ کر شروع ہو جاتے ہیں۔ کس بلا کا کلام ہے! سُننے والے پھڑک پھڑک کر داد دیتے۔ بیسیوں بند کی طویل نظم ہے مگر اکھڑتی نہیں۔ جی یہی چاہتا ہے کہ نظم کبھی ختم نہ ہو۔ اور ماشاءاللہ کتنی جان ہے پڑھنے والے میں، پوری آواز سے پڑھتے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا۔ آواز لڑکھڑائی تک نہیں۔ کیا اس شاعر کا یہی ایک وصف ایسا نہیں کہ اس کے تمام عیوب کو نظر انداز کر کے اسے گلے سے لگا لیا جائے؟

؎ نازت بکشم کہ نازنینی

جمیل جالبی

ذرا تصور تو کیجئے — دو کمروں کے مارٹن کوارٹر میں چوبیس ۲۴ افراد کا کنبہ! سامان کمروں اور برآمدے میں سے اُبل کر باہر سڑک پر آگیا تھا۔ پاس پڑوس والے ہنستے تھے کہ یہ کباڑیئے کہاں سے آگئے۔ اسی کوارٹر کے برآمدے کے ایک گوشے میں ساقی کا دفتر بھی قائم کر دیا گیا تھا۔ دن بھر تو یہ جگہ دفتر بنی رہتی مگر رات کو اس میں بھی سونے والے پڑ رہتے۔ یہ کوارٹر اِس احتیاط سے بنائے گئے تھے اِن میں پانی اور بجلی کا گزر نہ ہونے پائے۔ باہر کہیں کہیں نل لگا دیئے گئے تھے کہ پو پھٹنے سے پہلے، اگر کسی کا جی چاہے تو پانی بھر لے۔ رات کو ریوڑی والے کے چراغ کی طرح لالٹین جلا کر اپنا جی خوش کر لو۔ ہنسی کی ہنسی، دُکھ کا دُکھ۔ اتنی شدید آبادی ہونے پر بھی ذرا چہل پہل نہیں تھی۔ دن بھر ہُو کا عالم اور شام ہوتے ہی مری پھیل جاتی۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں، سب اپنا اپنا آپا تک رہے تھے۔ دراصل جھٹکا ہی ایسا لگا تھا کہ لوگ اب تک اس سے سنبھل نہ سکے تھے۔ بھانت بھانت کا آدمی ہندوستان چھوڑ کر پاکستان چلا آرہا تھا۔ اسی ریلے میں ہم بھی یہاں گرتے پڑتے پہنچ گئے تھے۔ مگر عجب معاملہ تھا کہ جتنے اُدھر سے آئے تھے اُن میں لکھ پتی سے کم کوئی نہیں تھا۔ حد یہ کہ جنہیں میں اچھی طرح جانتا تھا وہ بھی اپنے آپ کو دلی کے رؤسا میں سے بتاتے تھے اور ستم یہ کہ اپنے تموّل کی شہادت مجھ سے دِلواتے تھے۔ مجھے سخن اپنا سوجھتا تو کہتا "جی نہیں، رئیس نہیں، رئیسِ اعظم:

وہ کھل جاتے تو مَیں دبی زبان سے کہتا: "دلّی میں فقیر تو صرف مَیں ایک تھا۔" اس پر ایک قہقہہ پڑتا اور ان کی رُکی ہنسی میں اُڑ جاتی۔ بڑا لُطف آ رہا تھا اس نئی زندگی میں۔ ہم نے اچھّا وقت دیکھا تھا، کیا بُرا وقت دیکھنے کے لئے کوئی اور آتا؟ وہ بھی دیکھا، یہ بھی دیکھ۔ ان نینوں کا یہی بسیکھ۔ لہٰذا ہمارا عمل "مرتے جائیں، ملہاریں گائیں" پر رہا۔ عاشق کا جنازہ تو ذرا دُھوم سے نکلنا چاہئے۔ ہم ہنس ہنس کر اپنے نیل اُڑاتے رہے اور گا گا کر اپنے غم بُھلاتے رہے۔

یہی شب و روز تھے کہ ایک دن دونوں وقت ملتے ایک بڑے رنگین سے نوجوان سامنے آ کھڑے ہوئے اور نہایت ادب کے ساتھ اُنہوں نے سلام کیا۔ میں نے اُنہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سر پہ سفید کشتی نما ٹوپی، گول چہرہ، یاسمینی رنگ، کُشادہ پیشانی، غلافی آنکھیں، کتابی ناک، پتلے پتلے گلابی ہونٹ، ٹھوڑی میں ہلکا سا چاہِ زنخداں، ڈاڑھی مونچھ صاف، سفید سلک کی شیروانی، اکہرا پاجامہ اور پاؤں میں سفید سانبھر کی جوتی۔ اس طرحدار نوجوان کو دیکھ کر مجھے اپنی جوانی یاد آ گئی (گو خوبصورتوں میں میرا شمار کبھی نہیں ہوا)۔ میں کوارٹر کے آگے چارپائی بچھائے بیٹھا تھا۔ ایسے موقعوں پر مجھے شیکسپیئر کا ایک فقرہ ضرور یاد آ جاتا تھا — "مَیں اپنے غموں کے ساتھ یہاں بیٹھا ہوا ہوں، بادشاہوں سے کہو کہ یہاں آئیں اور مجھے تعظیم دیں۔" نہ جانے کیوں مجھے اس فقرے سے بڑی تسلّی ہوتی تھی۔ مجھے بالکل شرمندگی نہیں ہوئی کہ میں کھرّی چارپائی پر تہمد اور بنیان پہنے بیٹھا ہوں اور ایک نفیس مزاج مُلاقاتی سامنے آ کھڑا ہوا ہے۔ میں نے کہا "تشریف لائیے۔ یہیں آ جائیے میرے پاس۔" میں ذرا اُوپر کو کھسک گیا اور وہ بغیر کسی پس و پیش کے اَدوان پر بیٹھ گئے۔ "میرا نام جمیل جالبی ہے۔" یہ نام میرا سُنا ہوا تھا اور میں نے ان صاحب کا ایک آدھ مضمون بھی پڑھ رکھا تھا۔ میں نے پوچھا "آپ کا تعلّق کچھ مولانا جالب دہلوی سے ہے؟"

بولے "جی ہاں، وہ میرے دادا تھے۔" "تو پھر آپ ذرا آرام سے بیٹھئے اُوپر ہو کر۔ آپ سے مفصّل باتیں ہوں گی۔" اور پھر بہت دیر تک اُن سے دُنیا زمانے کی باتیں ہوتی رہیں، اور مجھے اندازہ ہوا کہ یہ طرحدار نوجوان آج کل کے نوجوانوں کی طرح کھوکھلا نہیں ہے اور اسکے ظاہر کی طرح اس کا باطن بھی اُجلا ہے۔ شرافتِ نسب شرافتِ نفس کی ذمّہ دار تھی۔ میر جالب دہلوی کو اس صدی کا کون اُردو پڑھا لکھا آدمی نہیں جانتا؟ انہوں نے بیسیوں اخباروں کی اڈیٹری کی۔ زندہ انسائیکلو پیڈیا تھے۔ میر صاحب سے اگر آپ نے کچھ پوچھ لیا تو سمجھ لیجئے کہ بس جان غضب میں آ گئی۔ اُنہیں یہ خبر نہیں کہ سڑک ہے یا بازار ہے یا چوک ہے، اُن کے علم کا دریا بہنے لگتا۔ اب آپ لاکھ پیچھا چھڑائیں میر صاحب جھاڑ کا کانٹا بن کر آپ کو لپٹے رہیں گے۔ یہاں تک کہ جب آپ اپنے گھر کا رُخ کریں گے تو یہ بھی آپ کے ساتھ ہو لیں گے اور ان کا لکچر جاری رہے گا۔ آپ اپنے گھر پہونچ جائیں گے تو میر صاحب ڈیوڑھی ہی میں کھڑے اپنے بے پناہ علم سے آپ کو فیض پہونچاتے رہیں گے۔ یہ لکچر اُس وقت ختم ہوتا جب میر صاحب چونک کر دیکھتے کہ اُن کا مخاطب روپوش ہو گیا۔ اور خود کھڑے در و دیوار سے باتیں کر رہے ہیں۔

جمیل صاحب پہلے ہی دن اس قدر محبّت، خلوص اور عقیدت سے ملے کہ اُن سے اُسی دن سے دوستی کی بُنیاد پڑ گئی۔ مارٹن کوارٹرز کے پیچھے پیر الٰہی بخش کالونی کے دو ہزار کوارٹرز زیرِ تعمیر تھے۔ کالونی کا کچھ حصّہ بن چکا تھا۔ اسی میں جمیل صاحب اپنے چھوٹے بھائی عقیل صاحب کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے والدین اور چھوٹے بہن بھائی اُس وقت میرٹھ ہی میں تھے۔ یہ دونوں بھائی بغرضِ تعلیم پہلے چلے آئے تھے۔ جمیل صاحب ایم۔ اے اور ایل ایل بی میں پڑھ رہے تھے اور ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹری کے لئے تیاری کر رہے تھے۔ جمیل صاحب کو ادبی ذوق ورثے میں ملا

تھا۔ علمی اور تنقیدی مضامین لکھنے کا انہیں شوق تھا۔ رفتہ رفتہ ساقی کے کاموں میں میرا ہاتھ بٹانے لگے، ہر مہینے ساقی میں "باتیں" بھی لکھنے لگے۔ میں نے اُن کا نام ادارۂ ساقی میں شریک کر لیا تاکہ ان کی خدمت کا اعتراف ہو جائے۔

جمیل صاحب کے والد میرٹھ کے متموّل لوگوں میں سے ہیں جب تک ہندوستان اور پاکستان میں روپے کی آرجاری رہی میرٹھ سے دونوں بھائیوں کے اخراجات کے لئے روپیہ آتا رہا۔ جب یہ سلسلہ بند ہو گیا تو جمیل صاحب نے بہادر یار جنگ ہائی اسکول کی ہیڈ ماسٹری قبول کر لی۔ اس سے انہیں اتنا مل جاتا تھا کہ دونوں بھائی بافراغت گزر کر لیں۔ ویسے بھی یہ دونوں بھائی بڑی محتاط زندگی بسر کرتے تھے۔ اِن کے دوستوں کی تعداد بھی بہت کم تھی، پھر کسی عیب میں نہیں، یہاں تک کہ سگریٹ بھی نہیں پیتے تھے۔ کوئی بیہودہ یا مہنگا مشغلہ بھی نہیں تھا۔ ادب کے چسکے نے انہیں بُرائیوں سے بچائے رکھا۔ مگر ادیبوں اور شاعروں کو ایسا بھی دیکھا ہے کہ دُنیا جہان کے اُن میں عیب آجاتے ہیں۔ دراصل یہ اِن کی شرافتِ نسبی اور عمدہ تربیت بھی تھی جس نے انہیں بدکرداری سے بچائے رکھا۔ بعد میں جب انکے والدین آگئے تو میں نے دیکھا کہ ماں باپ دونوں صوم و صلوٰۃ کے پابند اور بچّوں پر کڑی نظر رکھنے والے ہیں۔ ورنہ کسی وجیہہ اور خوبصورت نوجوان کے بگڑنے میں کیا دیر لگتی ہے، خصوصاً جبکہ پیسہ بھی ہاتھ میں ہو۔ مجھے دوسرے ذرائع سے معلوم ہوتا رہتا تھا کہ کالج کی کئی لڑکیاں جمیل صاحب سے التفات کر رہی ہیں مگر انکی بے التفاتی انہیں زیادہ قریب نہیں ہونے دیتی۔ جمیل صاحب عمر میں میرے لڑکے میاں مشہود سے دو ایک سال چھوٹے ہی ہونگے، اس لئے میں اُن سے ایسی بچ کی باتوں کا ذکر نہیں کرتا تھا۔ وہ بھی میرا ادب لحاظ اسی طرح کرتے تھے جیسے اپنے کسی بزرگ کا کرنا چاہیے۔ یہ حفظِ مراتب خدا کا شکر ہے کہ اب بھی قائم ہے۔ بلکہ میں بعض اوقات

اپنی رَو میں اس حد کو بھول جاتا ہوں، جمیل صاحب کبھی نہیں بھولتے۔

جمیل صاحب سے تقریباً روزانہ مُلاقات ہوتی تھی۔ اُن کی شخصیت میں کبریائیت اور ان کی باتوں میں موہنی ہے۔ چھل فریب مکاری اور چالاکی ان میں نہیں ہے۔ باتیں بڑی بھولی بھولی کرتے ہیں۔ ایک دن ہچکچاتے ہچکچاتے بولے: "آج ہمارے ہاں کھانا کھا لیجئے۔" میں نے کہا "کیا مُضائقہ ہے، کھا لیں گے۔" چنانچہ دوپہر کو وہ مجھے لینے آگئے اور میں انکے ساتھ ہو لیا۔ پیر کالونی میں ان کا کوارٹر قریب ہی تھا۔ کوارٹر میں سوائے اِن کے ایک دوست کے، جو انہی کے ساتھ رہتے تھے، اور کوئی نہیں تھا۔ چھوٹے بھائی عقیل کو میں نے پوچھا۔ معلوم ہوا کہ کالج سے دیر میں آتے ہیں۔ جمیل صاحب نے اپنے مُلازم کو آواز دی۔ ایک منٹ میں اُسنے آکر میز لگا دی اور اس پر دسترخوان بچھا دیا۔ نوکر کی وضع قطع دیکھ کر میں چکرا گیا۔ اٹھلا کر چلتا تھا اور مٹک کر بات کرتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے جمیل صاحب سے پوچھا "کیا یہ تیسری جنس کا آدمی ہے؟" انہوں نے کہا "جی ہاں۔ مگر بڑا وفادار اور کام کا ہے۔" اتنے میں ٹرے میں رکابیاں اور دو ڈونگے لئے وہ آگیا اور میز پر انہیں رکھ کر ادائے محبوبی سے اٹھلاتا چلا گیا۔ میں نے کہا "جمیل صاحب! اچھا نمونہ پالا ہے آپ نے۔" جمیل صاحب ہنس کر چُپ ہو رہے۔ دسترخوان میں روٹیاں لپیٹے وہ لپاک جھپاک چلا آرہا تھا۔ روٹی رکھ کر اُلٹے قدموں لَوٹ گیا۔ ایلو! پھر چلا آرہا ہے ٹرے میں شیشے کا جگ برف آب سے لبریز، اور تین گلاس لئے۔ کھٹا کھٹ اُسنے ایک برابر کی میز پر انہیں رکھ دیا اور پھر لپک گیا۔ میں نے کہا "چھلاوا بنا ہوا ہے کمبخت۔ اس کا نام تو آپ بجلی رکھئے۔" جمیل صاحب کے ساتھ ان کے دوست بھی ہنس پڑے۔ اب کے پھیرے میں وہ ایک طشتری میں قلاقند لایا اور میز پر رکھ کر مؤدب کھڑا ہو گیا۔ جمیل صاحب نے کہا "تم جاؤ۔ ضرورت

ہو گی تو بُلا لیں گے۔" وہ چلا گیا۔ شاید ہم اُس کی موجودگی میں بے تکلفی سے باتیں نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے اُسے چلتا کیا۔ جمیل صاحب نے ایک ڈونگا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "بسم اللہ کیجئے۔" میں نے جو ڈونگے کا سرپوش ہٹایا تو مچھلی کا بُھنا ہوا سالن دکھائی دیا۔ قصور کی میتھی کی خوشبو نے اُڑ کر بھوک پر سان رکھ دی۔ دوسرا ڈونگا کھولا تو اس میں ماش کی دال جس پر ہری مرچیں اور پودینہ چھڑکا ہوا اور بریاں کی ہوئی پیاز کے سُرخ لچھے! دل سے جمیل صاحب کے لئے دُعا نکلی۔ مگر کیا جمیل صاحب دلوں کا حال بھی معلوم کر لیتے ہیں؟ اُنہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ مچھلی اور ماش کی دال میرا من بھاتا کھاجا ہیں؟ یا یہ محض حُسنِ اتفاق تھا؟ یہ بھید آج تک نہیں کُھلا۔ خیر، ہم نے خوب ڈٹ کر کھایا۔ میں نے پوچھا "یہ کھانا انہی صاحب نے — نہیں — انہی خاتون نے — انہی حضرت نے پکایا ہے؟" جمیل صاحب نے کہا "جی ہاں۔" میں نے کہا: "بھئی کمال کر دیا۔ ہم نے تو سُنا تھا کہ اس جنس کے کسی کام میں برکت نہیں ہوتی۔" وہ بولے "اب آپ خود دیکھ لیجئے۔ پھر گھر کو بھی صاف ستھرا رکھتا ہے۔ رات کو پاؤں بھی دباتا ہے۔" میں نے کہا "واقع میں، گھر کو تو اس نے جنت بنا رکھا ہے۔ مگر کیا کہا آپ نے رات کو پاؤں بھی دباتا ہے؟" جمیل صاحب میرے اشارے کو سمجھ گئے اور اُن کا صبیح چہرہ گلابی ہو گیا۔ میں نے اس مخمصے کو ٹالنے کے لئے کہا: "یہ مخلوق واقعی بڑی خدمت گزار اور وفادار ہوتی ہے۔ پھر بھی آپ اس کی طرف سے ہوشیار رہیے۔" کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہم باہر برآمدے میں آئے تو دیکھا کہ بجلی صاحب ہاتھ میں لوٹا اور صابن لئے اور کندھے پر اُجلا تولیہ ڈالے سُدھ کھڑے ہیں۔ میں نے اب کے انہیں ذرا غور سے دیکھا۔ توبہ توبہ خاصہ مکروہ چہرہ تھا اس کا۔ میں نے کہا "کھانا تم نے بہت اچھا پکایا۔" مسکرا کر کھیسیں نکال دیں۔ ہاتھ دُھلوائے، تولیہ پیش کیا۔ اس کی سلیقہ مندی سے جی بہت خوش ہوا مگر اس سے استکراہ پھر بھی باقی رہا۔ کچھ

عرصہ بعد جمیل صاحب کے ہاں پھر کھانا کھانے کا اتفاق ہوا تو دوسرا ہی آدمی نظر آیا۔ پوچھا "وہ بجلی صاحب کہاں ہیں؟" بولے "وہ ٹھیک نہیں تھا، اُسے ہم نے نکال دیا۔"

جمیل صاحب نے ایم۔ اے اور ایل ایل بی پاس کرنے کے بعد بھی ہیڈ ماسٹری جاری رکھی۔ اسکول والے ان کی اعلیٰ کارکردگی کی وجہ سے انہیں چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اور یہ اپنی سادگی میں مُعلّمی پر قانع ہو گئے تھے۔ مگر چند بھلے آدمیوں کے کہنے سُننے پر اس پر رضامند ہو گئے کہ پی۔ اے۔ ایس کے امتحان میں بیٹھ جائیں۔ محنتی اور ذہین آدمی کے لئے کوئی راہ بند نہیں ہوتی۔ چنانچہ جمیل صاحب اس سخت امتحان میں بھی کامیاب ہو گئے اور انکم ٹیکس افسر بنا دیئے گئے۔ سرکاری ملازم بن جانے کے بعد اُن کا نام ادارہ ساقی میں سے ہٹا دینا پڑا۔ مگر نجی طور پر ان کا تعلق ساقی سے بدستور قائم رہا۔ بلکہ اُن کی یہ وضعداری اب تک قائم ہے۔

جمیل صاحب جب اپنے عُہدہ پر مامور ہوئے تھے تو میں نے انہیں دوستانہ اور بزرگانہ نصیحت کی تھی کہ رشوت یا دل آزاری کا پیسہ کبھی نہ لینا۔ بُری کمائی ہمیشہ رنگ لاتی ہے۔ میں نے ایسے بہت سے تماشے دیکھے تھے۔ وہ قصّے سب اُنہیں سُنائے۔ میں اگر انہیں یہ نصیحت نہ کرتا تب بھی اُن سے توقع یہی تھی کہ ایسا کوئی غلط اقدام وہ نہیں کریں گے۔ مگر روپیہ بُری چیز ہے، خصوصاً بڑی مقدار میں جب کسی ناتجربہ کار نوجوان کی دسترس میں ہو۔ خدا کا شُکر ہے کہ جمیل صاحب قعرِ دریا میں تختہ بند ہونے کے باوجود تردامنی سے بچے رہے۔ ویسے بھی بچپن کی اچھی تربیت اور خاندانی آسودہ حالی کے باعث ان کی سیر چشمی نے انہیں لغزش سے بچائے رکھا۔ اور جمیل صاحب بڑی ہوشیاری سے اس ہفت خواں کو طے کرتے چلے جا رہے ہیں۔

اس عرصہ میں جمیل صاحب کے والدین کراچی آ چکے تھے۔ ہندوستان میں جمیل صاحب کے والد کی بسیں چلتی تھیں۔ یہاں بھی انہوں نے آ کر بسیں چلائے

کا کام شروع کیا۔ پیسے والے ہوتے ہوئے بھی یہ مزدور قسم کے آدمی ہیں۔ ماشاءاللہ بھرا پُرا خاندان۔ جمیل صاحب کی تنخواہ اونٹ کی ڈاڑھ میں زیرہ ہو کر رہ گئی۔ کیا پدّی اور کیا پدّی کا شوربہ! سارے خاندان کا خرچ بزرگوار نے اپنے ذمّے لیا۔ پہلے جمیل صاحب کی شادی کُنبے ہی کی ایک سلیقہ مند لڑکی سے کی۔ اس سے بہت سی اُمیدوار لڑکیوں کے دلوں پر سانپ لوٹا۔ خود جمیل صاحب بھی دبی دبائی کامی لڑکی کو آج کل کی تیتریوں پر ترجیح دیتے تھے۔ اپنی شادی سے مطمئن اور خوش ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد اُن سے چھوٹی بہن کی شادی ہوئی۔ پھر اُس سے چھوٹی کی شادی ہوئی، اور اب آخر آخر میں میاں عقیل کی شادی ہوئی —— ڈاکٹر بن جانے کے بعد۔ اب سُہیل میاں کو پانچ سال کے لئے اپنے خرچ سے اُن کے والد اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ بھیج رہے ہیں۔ یہ باتیں میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ آپ کو معلوم ہو جائے اگر والدین سلیقہ مند ہوں تو اپنی اولاد کو سہارا دے کر کس طرح باعزت زندگی بسر کرنے کی راہ پر لگا دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ع ایں خانہ تمام آفتاب است۔ لڑکیوں نے بھی اعلیٰ تعلیم پائی مگر انہیں اس زمانے کی ہوا نہیں لگی۔ سلیقہ مند ایسی کہ دسوں انگلیاں دسوں چراغ۔ لڑکوں میں ایک انکم ٹیکس افسر، دوسرا ڈاکٹر، اور تیسرا انجینئر بننے جا رہا ہے۔ مگر اتنے اطاعت گزار اور تمیزدار کہ میں نے انہیں اپنے باپ سے نظریں ملا کر کبھی بات کرتے نہیں دیکھا۔ باپ کا تو خیر مرتبہ ہی ایسا ہوتا ہے، اپنے سے بڑوں کا بھی اسی طرح ادب لحاظ کرتے ہیں۔ کراچی میں ایک ایسے خاندان کو دیکھ کر جی بہت خوش ہوتا ہے اور اب سے چالیس پچاس سال پہلے کے دلّی کے شُرفا کے خاندان یاد آ جاتے ہیں۔ ہمارے تعلقات اس خاندان سے رفتہ رفتہ اتنے بڑھ گئے کہ اکثر حضرات سمجھتے ہیں کہ ہم ایک ہی کُنبے کے افراد ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو میں اس پر فخر کرتا۔

جمیل صاحب خاصے بھولے آدمی ہیں۔ فوراً لوگوں پر اعتماد کر لیتے ہیں اور اکثر

مُعتمد بعد میں غلط ثابت ہوتے ہیں تو انہیں غصّہ نہیں آتا، افسوس ہوتا ہے اور اُن پر ترس آتا ہے۔ انگریزی کا ایک اخبار نویس میرے پاس ایک دن آیا اور میٹھی میٹھی باتیں کر کے چلا گیا۔ گفتگو میں بار بار جمیل صاحب کا ذکر اس طرح کرتا جیسے ان سے اس کے بڑے گہرے تعلقات ہوں۔ میں اس کے رویے سے کھٹک گیا تھا کہ یہ کبھی کبھار آنے والا اچانک آکر میری تعریف میں کیوں مرا جا رہا ہے۔ مجھ پر مضمون کیوں لکھنا چاہتا ہے اور مجھے سبز باغ کیوں دکھا رہا ہے۔ اگلے دن وہ چند پُرانے اخباروں کا میلا سا پلندہ لے کر پھر آ گیا اور اپنے چھپے ہوئے مضمون دکھانے لگا۔ اِدھر اُدھر کی ہانکنے کے بعد بولا: "اچھا اب اجازت دیجئے۔ جب آپ کو فرصت ہو اِس نمبر پر مجھے ٹیلیفون کر لیں۔ میں انٹرویو کے لئے حاضر ہو جاؤں گا۔" میں اُسے دروازے تک چھوڑنے گیا۔ پلٹ کر ایک دم سے اُس نے کہا "ایک دس روپے تو نہیں ہوں گے آپ کے پاس؟ میں جلدی میں اپنا پرس گھر بھول آیا۔ جمیل کے پاس گیا تھا، وہ گھر پر نہیں تھا۔ میں کل اِسی وقت دے جاؤں گا۔" میں جانتا تھا کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے مگر میں نے ایک لمحے ہی میں فیصلہ کر لیا کہ اگر دس روپے اِسے دے کر اس سے پیچھا چھوٹ سکتا ہے تو سمجھو کہ سستے چھوٹے۔ میں نے دس کا ایک نوٹ اندر سے لاکر دیا۔ اُس نے لے کر کہا "بس کل اِسی وقت۔" اور چل دیا۔ اگلے دن بھلا کون آتا تھا۔ تیسرے دن میں نے کہا لاؤ ذرا ٹیلیفون کر کے دیکھیں تو سہی کہ کیا کہتا ہے۔ دیئے ہوئے نمبر پر ٹیلیفون کیا تو معلوم ہوا کہ ایک بڑے انگریزی اخبار کا دفتر ہے۔ میں نے اُن صاحب کا نام لیا کہ اُن کو بلوا دیجئے۔ جواب ملا کہ اس نام کا کوئی آدمی اس دفتر میں نہیں ہے۔ اخبار کے اڈیٹر سے میری شناسائی تھی۔ میں نے اُن سے ٹیلی فون ملایا۔ جیسے ہی میں نے اُن صاحب کا نام لیا وہ بولے "آپ سے وہ کچھ لے تو نہیں گیا؟" میں نے کہا "دس روپے لے گیا۔" وہ افسردہ ہو کر بولے

"مدت ہوئی ہم نے اُس شخص کو علیحدہ کر دیا۔ آدمی ذہین ہے مگر ناکارہ۔ اب وہ یہی کرتا پھرتا ہے اور بزعم کمبخت ہمارا سب کو بتاتا ہے۔ کئی اور شکایتیں بھی آچکی ہیں۔ اب صبر کیجئے اور آئندہ کبھی اُس شخص کا اعتبار نہ کیجئے جو کہے کہ میں اپنا پرس گھر بھول آیا ہوں۔" اگلے دن میں جمیل صاحب کو آگاہ کرنے کے لئے اُن کے گھر پہونچا۔ اس کا نام سُنتے ہی انہوں نے پوچھا "آپ سے کچھ لے تو نہیں گیا؟" میں نے کہا "دس روپے۔ مگر آپ ہوشیار رہئے۔ وہ آپ کے پاس بھی پہونچے گا۔" بولے "مجھ سے تو وہ پہلے ہی لے جا چکا ہے۔" میں نے کہا "چلو دس روپے ہی پر ٹلی۔" بولے "جی نہیں، وہ پھر آئے گا۔ مجھ سے تو وہ کئی بار دس دس پانچ پانچ کر کے لے جا چکا ہے۔" میں نے کہا "اور آپ دیئے جا رہے ہیں؟" بولے "کیا کروں مجھے اُس کی مفلسی پر ترس آتا ہے۔" کبھی انہیں ترس آجاتا ہے، کبھی انہیں خوفِ خدا ستاتا ہے، اور کبھی اِن کا جی چاہ جاتا ہے۔ طالب علموں کی فیس اپنے پاس سے دے دیتے ہیں، کتابیں دلوا دیتے ہیں، امتحان کی فیس داخل کر دیتے ہیں۔ دوستوں میں سے کسی نے کہا "جمیل صاحب، آپکا فلاں کام ہو گیا، مٹھائی کھلوایئے۔" بولے "چلئے۔" دو چار جتنے بیٹھے ہیں سبکو عبدالحنان کی دُکان پر لے کر پہونچ گئے اور مٹھائی اور سلونا کھلا لائے۔ ایک بے تکلف ہم دفتر نے کہا "اپیل جیت گئے۔ دعوت ہوگی۔ مُرغ اور آئس کریم کی۔" تو صاحب! بارہ خاص خاص دوستوں کی دعوت ہوگئی۔ بس بُھنے ہوئے مُرغ میز پر آگئے۔ اور تھوڑی دیر میں ہڈیاں ہی ہڈیاں میز پر رہ گئیں۔ کھانے کے ساتھ انصاف کرنے والے بھی تو ایسے ہوں! چار گھان آئس کریم کے بھی پیالوں کے پیٹ میں اُتر گئے۔ اور جمیل صاحب کھلے جا رہے ہیں کہ دوستوں کی خوشی پوری ہو رہی ہے۔

پی، ای، این کی نمائندگی کرنے جب وہ پیرس گئے تھے تو وہاں بھی ایک جگہ اِن کا جی چاہ گیا تھا۔ پروفیسر سید علی احسن نے بتایا کہ یہ جمیل بھی عجیب آدمی ہے۔ پیرس

میں ہماری حیثیت مہمانوں کی تھی، مگر جتنے مندوبین وہاں جمع تھے سب کو اِس نے نہایت مہنگی شراب پلوادی۔ میں نے پوچھا "جمیل صاحب، بھلا یہ کیا حرکت تھی؟" بولے "میرا جی چاہ گیا اُس وقت۔"

جمیل صاحب کو سوائے لکھنے پڑھنے کے اور کسی بات کا شوق نہیں ہے۔ مُلازمت کی دماغ سوز مصروفیت کے باوجود اتنا وقت ضرور نکال لیتے ہیں کہ اپنا مُطالعہ بھی جاری رکھیں اور کچھ لکھ بھی لیں۔ انہوں نے اپنی ایک چھوٹی سی لائبریری بھی بنالی ہے جس میں بعض نایاب کتابیں بھی ہیں۔ اس لائبریری میں وہ جم کر بیٹھتے ہیں اور گھنٹوں لکھنے پڑھنے کا کام کرتے ہیں۔ طبعزاد مضامین بھی لکھتے ہیں اور ترجمہ بھی کرتے ہیں۔ ایلیٹ کے مضامین کا ترجمہ کرنا جُوئے شیر کا لانا ہے۔ دِنوں کی محنتِ شاقہ کے بعد انہوں نے اِس مُہم کو سر کیا اور ایک مجموعہ چھپوا کر ہمارے علمی سرمایہ میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ کیا۔ ایسے مُشکل کام وہی شخص کر سکتا ہے جو دُھن کا پکّا ہو۔ اُردو کے کلاسیکی ادب کا بھی مطالعہ کرنے کے لئے بڑے صبر و سُکون کی ضرورت ہوتی ہے۔ جمیل صاحب اس کی ضخیم جلدوں کو بھی دیمک کی طرح چاٹتے رہتے ہیں۔ "فسانۂ آزاد" کی چار جلدوں کو مع مقدمہ و حواشی کے شائع کرانا چاہتے تھے، مگر اس کے لئے انہیں کوئی پبلشر نہیں ملا۔ مُنشی سجاد حسین کی نایاب کتاب "حاجی بغلول" انہوں نے ایڈٹ کر کے چھپوائی ہے۔ اور اب مہینوں سے جعفر زٹلی کے کلام کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اس کے مختلف نُسخے اِدھر اُدھر سے جمع کئے ہیں، ہندوستان سے اس کی نقلیں منگوائی ہیں، لندن سے ایک مُستند نُسخے کا مائیکروفلم بھی منگا لیا ہے۔ مجھے تو انہیں اس کام میں مُنہمک دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔ مگر یہ اللہ کا بندہ اِس خضوع و خشوع سے اِس کام کو کر رہا ہے کہ اگر کوئی دینی کام اِسی اہتمام سے کرتا تو اب تک کئی دفعہ کھڑا اور پڑا جنّت میں چلا گیا ہوتا۔ در اصل ایسے بے غرض کام کرنے والوں کو کسی علمی و ادبی ادارہ سے منسلک ہونا

چاہئے تھا۔ مگر یہاں تو مولوی عبدالحق مرحوم ہی کو کسی نے نہ پوچھا، کسی اور کا تو ذکر ہی کیا۔

جمیل صاحب کے ادبی کارناموں میں "نیا دور" کا اجرا بھی ہے۔ جب "نیا دور" جاری ہوا تو جمیل صاحب نے مجھ سے بھی مضمون لکھنے کی فرمائش کی۔ میں اس کے پیش رو میں بھی لکھا کرتا تھا اور دلّی کے فسادات پر میرا طویل مضمون (جو مجھے بعد میں شیریں صاحبہ نے بتایا کہ رپورتاژ ہے) "دلّی کی بپتا" اسی کے فسادات نمبر میں شائع ہوا تھا۔ "نقوش" کے شخصیت نمبر میں طفیل صاحب کی فرمائش پر میں نے مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم کا خاکہ لکھا تھا۔ اور اسی خاص نمبر میں چند اور مختصر خاکے بھی لکھے تھے۔ حسنِ اتفاق سے انہیں قبولِ عام حاصل ہوا۔ جمیل صاحب کی فرمائش یہی کہ یا تو رپورتاژ لکھو، یا خاکہ، یا کسی عالمی شاہکار کا ترجمہ دو۔ میں کئی دن تک سرگرداں رہا کہ اپنے پیارے دوست کے لئے کیا لکھوں۔ اور ایک دن میں نے بیٹھ کر اُن کے لئے خواجہ حسن نظامی کا خاکہ لکھا۔ جمیل صاحب اِسے پڑھ کر پھڑک گئے۔ حلقۂ اربابِ ذوق کی ایک نشست میں مجھے لے جا کر اِسے پڑھوایا۔ اِس مضمون کو سُننے کے لئے چند خاصانِ ادب کو بطورِ خاص بُلایا گیا تھا۔ غنیمت ہے کہ سبھی نے اِسے پسند فرمالیا۔ پھر اِسے "نیا دور" میں شائع کیا تو فرمائشیں آنے لگیں کہ اس سلسلے کے اور مضامین بھی لکھوائے۔ اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شُدی۔ میں لاکھ کہتا ہوں کہ میں ادیب نہیں ہوں، اڈیٹر ہوں، مگر اڈیٹر ہیں کہ کہتے ہیں تم ادیب پہلے اور اڈیٹر بعد میں ہو۔ مجھے مولیئر کا "زبردستی کا ڈاکٹر" یاد آیا۔ سچ کہیں بنی تو بنی ہی سہی۔ لاؤ آج سے ادیب بن ہی جاؤ۔ چنانچہ بن گئے ادیب۔ مگر اِس لفظ کی لاج رکھنی کس قدر مُشکل ہے۔

"نیا دور" بڑی آب و تاب سے نکلا۔ میرا مضمون بھی اس میں شامل تھا۔ چند روز بعد اسکے منیجر صاحب آئے اور ایک بند لفافہ مجھے دے گئے۔ میں نے لفافہ کھولا۔ دس دس روپے کے کئی نوٹ نکلے اور جمیل صاحب کا مُنکسرانہ خط تھا۔ کچھ بُرا معلوم

ہوا، حالانکہ اکثر پرچے میرا مضمون شائع کرنے کے بعد حسبِ توفیق مجھے معاوضہ بھیج دیتے ہیں اور میں اِسے شُکریے کے ساتھ قبول کر لیتا ہوں۔ نہ معلوم جمیل صاحب کی یہ پیشکش مجھے ناگوار کیوں گزری۔ شاید اِس وجہ سے کہ وہ ہر بہانے میری خدمت کرتے رہتے ہیں، شاید اس وجہ سے کہ میاں شہود کی طرح وہ ہمیشہ میرا خیال رکھتے ہیں۔ میں نے اُسی وقت انہیں پرچہ لکھا کہ "یقیناً روپیہ دُنیا کی بہت بڑی قوت ہے، اور روپے کی کس کو ضرورت نہیں ہوتی؟ لیکن سارے کام روپے ہی کے لئے نہیں کئے جاتے، بعض کام بربنائے خُلوص کئے جاتے ہیں۔ آپ سے میں معاوضہ قبول نہیں کر سکتا۔ آئندہ اس کی زحمت نہ فرمائیں۔" میں نے لفافہ بند کر کے اُن کے منیجر کو دے دیا۔ تھوڑی دیر بعد جمیل صاحب خود حیران پریشان چلے آئے۔ بولے "شاہد بھائی، خدا کی قسم یہ آپ کے مضمون کا معاوضہ نہیں ہے، رُونمائی ہے۔ بھلا میں ایسی گستاخی کر سکتا ہوں؟" میں نے کہا "بھائی میں آخر تمہارے احسانات سے کہاں تک دبتا چلا جاؤں؟ میں اگر روپے پیسے سے تمہاری خدمت نہیں کر سکتا تو کیا قلم سے خدمت کرنے کا موقع بھی مجھے نہیں دینا چاہتے؟" جمیل صاحب آبدیدہ ہو گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ میں دلّی میں کیا تھا اور یہاں آنے کے بعد مجھے کیا بن جانا پڑا۔ بچارے عجب مخمصے میں پڑ گئے، گئے تھے نماز بخشوانے روزے گلے پڑے۔ میں نے کہا "آپ اِس کا خیال یا ملال نہ کیجئے۔ مضمون میں آپ کے لئے آئندہ بھی لکھتا رہوں گا۔ اب آپ بیٹھئے، چائے پیجئے اور کچھ اور باتیں کیجئے۔" بولے "اِس وقت تو معافی چاہتا ہوں، جانا ہے، پھر کسی وقت حاضر ہوں گا۔" اس کے بعد میرے اور اُن کے درمیان معاوضہ کا ذکر کبھی نہیں آیا۔ مگر جمیل صاحب غیور آدمی ہیں، تاک میں لگے رہے کہ اس کا تدارک آئندہ کس طرح کیا جائے۔ ایک دن آئے تو بولے "بڑی گرمی ہے۔ آپ نے پنکھا نہیں لگوایا؟" میں نے کہا "ہاں، ذرا ایسا ہی موقع ہو رہا ہے۔" اگلے دن جو میں شام کو گھر واپس آیا تو دیکھا نیا

پنکھا چھت میں لٹکا ہوا ہے۔ بچوں نے بتایا کہ جمیل صاحب نے مستری کو بھیجا تھا، وہ لگا گیا ہے۔ اب خفیف ہونے کی میری باری تھی۔ عندالملاقات میں نے کہا "حضرت یہ آپ نے کیا کیا؟" بولے "اب آپ کچھ نہ کہئے۔ حسابِ دوستاں در دل۔" جب میری بیوی نے اس عمر میں دن بھر ایک اسکول میں پڑھانے اور خرابئ صحت کے باوجود سیکنڈ ڈویژن میں ایم۔ اے پاس کیا تو سب کو بہت خوشی ہوئی اور جمیل صاحب کو سب سے زیادہ۔ گھر میں زنانہ میلاد شریف ہوا۔ جمیل صاحب کی بیگم، والدہ اور بہنیں بھی آئیں مٹھائی تو کئی خواتین لے کر آئیں مگر جمیل صاحب کی بیگم مٹھائی کے علاوہ نائیلون کی ایک پھول دار ساڑھی بھی تحفتہً لے کر آئیں۔ میری بیوی نے پوچھا "یہ زیر باری کیوں؟" بیگم جمیل نے کہا "بھابی، آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ آپ نے کتنا ناممکن کام کیا ہے۔ جمیل صاحب تو ایک ایک سے آپ کی تعریف کر رہے ہیں۔ آج صبح مجھے اپنے ساتھ ایلفی لے گئے تھے کہ بھابی کو تحفہ دینے کے لئے ایک ساڑھی پسند کر دو۔ میں نے آپ کے لئے یہ مہندی کا رنگ پسند کیا ہے۔ آپ کو شوخ رنگ پسند نہیں ہیں نا؟ مجھے تو یہ بہت اچھی لگی۔ آپکو پسند آئی؟" ـــ اور یوں جمیل صاحب کو جب بھی موقع ملتا ہے ہم پر احسان کا وار کر جاتے ہیں۔

یادش بخیر حضرت جوش ملیح آبادی کھانے پینے کے بڑے رسیا ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ صرف پینے کے ہی نہیں، کھانے کے بھی۔ مجھے چند بار انہیں کھاتے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس معاملے میں وہ قطعی غیر شاعر ہیں۔ جوش صاحب بڑی بے دردی سے کھانے پر پلتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ادھر سورج غروب ہوا اور ادھر وہ ساغر بکف طلوع ہوئے۔ دو گھنٹے تک ان کا یہ شغل جاری رہتا ہے۔ مفت خورے تو ساتھ لگے ہی رہتے ہیں مگر یہ اتنے تنگ ظرف ہوتے ہیں کہ ایک ایک دو دو گلاس ہی میں جھک جاتے ہیں۔ جوش بلانوش ہیں۔ دو گھنٹے میں چار چھ جتنے بھی گلاس ہو جائیں سب چڑھا جاتے ہیں اور ذرا

نہیں بہکتے۔ بلکہ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب ان کی گل افشانئ گفتار دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ دو گھنٹے کے اس ریاض کے بعد کھانا طلب کیا جاتا ہے۔ اب آپ ان کے تناولِ طعام کی رفتار دیکھئے۔ بریانی کی چوٹی دار قابیں آتی رہیں گی اور غائب ہوتی رہیں گی۔ قورمہ اور شیرمالیں پناہ مانگ جائیں گی۔ آم کی گٹھلیوں کا ڈھیر سامنے لگ جائے گا اور ہلاکو کے کھوپڑیوں کے مینار کی یاد تازہ کر جائے گا۔ جوش صاحب کی اس خوش خوری کو دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ کم از کم ایک شخص تو ہماری برادری میں ایسا ہے جو کھانے کے ساتھ پورا پورا انصاف کر سکتا ہے۔

ہاں تو جوش صاحب نے ایک دن لاڈ میں آ کر جمیل صاحب سے کہا کہ "آپ ہماری دعوت کر دیجئے۔" انہوں نے کہا "بسم اللہ۔ جس دن آپ فرمائیں۔" بولے "مگر دعوت میں کچی بریانی اور بگھارے بیگن ضرور ہوں گے۔ آپ کی بیگم حیدرآباد میں رہ چکی ہیں، اور سنا ہے کہ کھانا بہت اچھا پکاتی ہیں۔" بھولا اور تکلف کا آدمی، بیوی کی تعریف سن کر خوش ہو گیا۔ دن مقرر ہوا اور وقت مقرر ہوا۔ مجھے بھی دعوت نامہ بھیجا گیا مگر مجھے لاہور جانا تھا، دعوت میں شریک نہیں ہو سکا۔ واپسی پر جمیل صاحب سے نہیں قدوسی[1] صاحب سے اس دعوت کی روداد سن کر لطف آ گیا۔

---

[1] اعجاز الحق قدوسی بڑے سنجیدہ اور قابل آدمی ہیں۔ جوش صاحب کے رفیقِ دیرینہ اور مخلص دوست۔ یہ وہی صاحب ہیں جنہوں نے کوئی ۲۵ سال پہلے ایک مجموعہ جوش کی نظموں کا "شاعر کی راتیں" چھپایا تھا۔ عربی، فارسی اور اردو کے منتہی ہیں۔ نیک اور صالح بزرگ ہیں۔ پہلو میں دل زندہ رکھتے ہیں۔ جوش فکر شاعر اور خوش ذوق انسان ہیں۔ مگر قسمت کے ہیٹے ہیں۔ خامہ فرسائی پر گزارہ ہے۔ اس لئے مفلسی نے ان کے ہاں ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ مگر افلاس ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا کیونکہ غنیِ دل ہیں۔ جوش اور قدوسی کی یکجائی اجتماعِ ضدین ہے۔

جمیل صاحب نے بڑے اہتمام سے کھانا پکوایا۔ کچی بریانی اور بگھارے بیگنوں کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تیار کرایا۔ وقت کی پابندی جمیل صاحب نے کبھی کی ہے نہ کرینگے۔ مہمان نو بجے سے آنے شروع ہوگئے۔ جوشؔ صاحب کو دس بجے جاکر لانا تھا۔ جوشؔ صاحب ہمیشہ لائے جاتے ہیں، آتے کبھی نہیں۔ ساڑھے دس بجے بیگم جمیل نے اطلاع کرائی کہ کھانا تیار ہے۔ جمیلؔ اور جوشؔ کے باہمی دوست قدوسی صاحب مبین الحق کی شیورلے کر جوشؔ صاحب کے ہاں پہونچے تو گیارہ بج چکے تھے۔ معلوم ہوا کہ جوشؔ صاحب کھانے سے فارغ ہو کر استراحت فرمارہے ہیں۔ قدوسی صاحب نے کہا "انہیں اطلاع کردو کہ جمیل صاحب کے ہاں سے قدوسی لینے آیا ہے۔" بھلا جو شخص کہ گھڑی رکھ کر سارے کام کرتا ہو وہ کیسے کسی تاخیر کو گوارہ کرلیتا؟ قدوسی صاحب نے بےقدری کرلی، جوشؔ صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔ کہا کہ "بھئی اُس بچارے نے بہت عمدہ انتظام کیا ہے اور دس بارہ معزز آدمی آپ کی وجہ سے بُلوائے ہیں۔ آپ سب پر پانی پھیرے دے رہے ہیں۔ کچھ تو خیال کیجئے۔" مگر وہ سر ہلا ہلا کر یہی کہتے رہے کہ "اب تو ہم کھانا کھا چکے۔ اب ہم نہیں جائیں گے۔" بڑا ناز تھا قدوسی صاحب کو اپنی دوستی پر۔ اور کمال یہ ہے کہ اب بھی ہے۔ وہاں سے ناکام لوٹے تو اُلٹے جمیل صاحب پر بھبک پڑے کہ "میاں تم نے دیر کردی۔ وہ کیسے آسکتے تھے۔ اُن کے سونے کا وقت ہوگیا۔"

جمیل صاحب کو جوشؔ صاحب کی اصول پرستی سے بہت رنج پہونچا۔ مگر ضبط کرکے بولے "ہاں دیر تو ہوگئی مگر جوشؔ صاحب کو آجانا چاہئے تھا۔"

جمیل صاحب کا اصول یہ ہے کہ وقت کی پابندی نہ کی جائے۔ جوشؔ صاحب کا اصول یہ ہے کہ وقت کی پابندی کی جائے۔ اِن اصولوں کی ٹکر میں دعوت کا بیڑا غرق ہوگیا۔ مہمانوں نے کھانا زہر مار کیا اور مُنہ لٹکائے اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہوگئے ہیں

وہ اپنی خُو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں؟

دراصل جوشؔ صاحب کی خُو "خوئے بد" ہے جو اپنے جواز میں ہزار بہانے تلاش کر لیتی ہے۔ ورنہ حضرت کا اصول تو یہ ہے کہ اِن کا کوئی اصول ہی نہیں ہے۔ جمیل صاحب اس واقعہ سے کبیدہ خاطر ہوگئے تھے مگر ایک دن جوشؔ صاحب ان کے دفتر پہونچ لئے اور جمیل صاحب کی سادگی دیکھتے کہ سب کچھ بھول بیٹھے اور جوشؔ صاحب سے اُنکے تعلقات پھر اُستوار ہوگئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ زمانے کے بھی اصول بدل گئے ہیں۔

از بُزرگاں خطا و از خورداں عطا

جوشؔ صاحب بہانے تلاش کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ جب گلڈ کی بُنیاد رکھی گئی اور پہلے جلسے کے لئے بُلاوے بھیجے گئے تو یہ طے ہوا کہ چند مُعزز و مُعتبر حضرات کی خدمت میں حاضر ہوکر اُن سے شرکت کا وعدہ لیا جائے اور بطورِ خاص ان حضرات کا تعارف صدرِ پاکستان سے کرایا جائے۔ چنانچہ بابائے اُردو، پروفیسر مرزا محمد سعید، پروفیسر حامد حسن قادری اور جوشؔ صاحب کی خدمت میں ہم فرداً فرداً گئے اور ان سب نے خوش ہو کر شرکت کا وعدہ فرمایا۔ جلسے کی صبح کو ایک ایک بُنیادی رُکن ان حضرات کی خدمت میں گیا اور انہیں جلسہ گاہ میں لے آیا۔ جمیل صاحب جوشؔ صاحب کو لانے گئے اور مُنہ لٹکائے خالی آئے۔ "ارے بھئی کیوں نہیں آئے؟"

"جی وہ کہتے ہیں کہ گلڈ کا فارم انگریزی میں چھاپا گیا ہے، اس لئے میں شریک نہیں ہوں گا۔"

"کیا اُنہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ گلڈ صرف اُردو کا نہیں ہے، پاکستان میں بولی جانے والی تمام زبانوں کا ہے؟"

"جی ہاں معلوم ہے — اسکے باوجود۔"

جوشؔ صاحب گلڈ کے جلسے میں شریک نہیں ہوئے اور نہ گلڈ کے ممبر بنے۔ ہوا

یہ کہ جو لوگ اُنہیں گھیرے رہتے ہیں انہوں نے انہیں سُجھا دیا کہ آپ کو تو گلڈ میں کوئی بڑا عُہدہ ملنا چاہیئے۔ معمولی ممبر کی طرح شریک ہونا آپ کی شان کے خلاف ہے۔ یہ بات ان کے گھٹ میں اُتر گئی۔ مگر اپنے مُنہ سے کیسے کہیں کہ مجھے کوئی بڑا عُہدہ دو تو جلسے میں شریک ہوتا ہوں؟ لہٰذا بہانہ یہ تلاش کیا کہ انگریزی میں گلڈ کے فارم کیوں چھاپے گئے۔ حالانکہ اُنہیں مُنہ پھوڑ کر جالبی صاحب سے کہہ دینا چاہیئے تھا کہ مجھے کوئی بڑا عُہدہ دو۔ آخر اور بہت سی بیہودہ باتیں وہ دوستوں سے (اور غیروں سے بھی) کہہ دیا کرتے ہیں، تو جمیل صاحب انہیں اطمینان دِلا دیتے کہ گلڈ میں عُہدے نہیں بٹ رہے۔ سُنا ہے کہ اب وہ اِس واقعے کو جُھٹلاتے ہیں۔ کیا میں اُن سے پوچھ سکتا ہوں کہ اگر یہ بات نہیں تھی تو آپ آج تک گلڈ کے ممبر آخر کیوں نہیں بنے؟ ع

بے ادب شرط مُنہ نہ کھلواؤ

جمیل صاحب کا عمل FORGIVE + FORGET پر ہے۔ میں اُن سے خفا ہو کر کہتا ہوں کہ اسے بے غیرتی کیوں نہ کہا جائے؟ وہ ایک دل آویز مُسکراہٹ کے ساتھ کہتے ہیں "ہاں ہے تو ایک طرح کی بے غیرتی ہی۔ مگر میں کیا کروں کہ میرا جی چاہتا ہے ــــ"

"تمہارا جی تو باؤلا ہو گیا ہے۔ ادب کے نقد و احتساب میں تو تم نے نظر پیدا کر لی۔ ادیبوں کو پرکھنا بھی سیکھو۔ یہ کیا کہ ذہنی طور پر نابالغ ادیبوں سے لے کر بوڑھے دانشوروں تک سب کو ایک لکڑی سے ہانک دیتے ہو۔"

بھولا آدمی پھر اپنے جی کا رونا لے بیٹھتا ہے اور اِس غریب کو اس کے حال پر چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ شاید اس حد سے بڑھی ہوئی شیریں مزاجی ہی کی وجہ سے لوگوں نے انہیں جالبی کے بدلے جلیبی کہنا شروع کر دیا ہے۔ جوشؔ صاحب کے پرستارِ خصوصی مولانا قدوسی سے میں نے کہا: "جمیل صاحب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟" بولے "وہی جو جوشؔ صاحب کی۔"

"اُن کی رائے کیا ہے؟"

"کل آپ کو جوشؔ صاحب کا خط دے جاؤں گا۔ دیکھ لیجئے گا۔"

اُس خط کا اقتباس یہ ہے:۔

"جمیل صاحب جالبی، چشمِ بد دور، نکیلے جوان اور طباع انسان ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور اُن کے لہجے میں شرافت کی گمک پائی جاتی ہے۔

قُدرت نے اُنکو سخن فہمی اور بذلہ سنجی کا جوہر بھی عطا کیا ہے اور برمحل صحیح بات کہنے کی صلاحیت بھی دی ہے۔

اُن کی شخصیت میں جاذبیت اور اُن کی عقل میں تابانی کا امتزاج یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ ؎

خدا کے فضل سے یوسف جمال کہلائے
اب اور چاہتے کیا ہو، پیمبری مِل جائے!

مرحوم جوشؔ:

یہ "مرحوم" کا سابقہ بھی خوب ہے زندہ شہیدوں کی طرح یہ "زندہ مرحوم" ہیں۔ ع

تم سلامت رہو ہر روز کے مرنے والے

خدا کا شکر ہے کہ جمیل صاحب شاعر نہیں ہیں، ابتدائے شعور یا بے شعوری کی عمر میں انہیں شعر کہنے کی لت لگ گئی تھی مگر اللہ نے انہیں جلد عقل دیدی اور شعر گوئی ترک کر کے انہوں نے نثر نگاری کی طرف توجہ کر لی۔ مگر کچھ عرصے سے اُن کی نثر نگاری میں ایک خطرناک رجحان آچلا ہے اور یہ رجحان ہے مُقدمہ نگاری کا، جو نتیجہ ہے مولانا قدوسی کی دوستی کا۔ قدوسی صاحب تصوّف کی تاریخ کئی جلدوں میں لکھ رہے ہیں: تذکرۂ صوفیائے سندھ اور

شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور اُن کی تعلیمات پر جمیل صاحب نے عالمانہ مقدمے لکھکر مجھے تو حیرت میں ڈال دیا کہ یہ ادب کا ایک شائستہ طالب علم اور اُردو کا ایک شریف نقاد تصوّف اور صوفیوں میں کہاں جاکر پھنس گیا؟ اِن مُقدموں کے لکھنے کے لئے اسکو اپنا کتنا خون پانی کرنا پڑا ہوگا؟ جمیل صاحب کو اِس نوع کی مُقدمہ بازی سے بچنا چاہئے۔ اگر خدانخواستہ ان کا شمار علما یا مولاناؤں میں ہونے لگا تو وہ نہ دین کے رہیں گے اور نہ دُنیا کے۔ مُقدمہ بازی تو مولوی عبدالحق مرحوم ہی پر پھبتی تھی، اور اُنہی کے ساتھ ختم ہوگئی۔ صحبتِ ناجنس سے گُریزاں رہنے والا کہاں اصفیا اور اتقیا میں جا گھسا۔ دُکانِ شیشہ گراں میں سانڈ کا کیا کام؟ نفیس مزاج لوگوں کو ایسی حرکتوں سے باز رہنا چاہئے۔

نفاستِ مزاج پر یاد آیا کہ جمیل صاحب کی عجیب نفاست پسندی بعض اوقات انکے دوستوں کے لئے بڑی صبر آزما ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً انہیں چاندنی راتیں بہت پسند ہیں۔ جاڑے کی چاندنی راتیں بھی، حالانکہ غریب کی جوانی اور جاڑے کی چاندنی کون دیکھتا ہے؟ جناب دیکھتے ہیں۔ ایک دفعہ مجھے جاڑوں میں چاند کی چودھویں شب کو سینڈز پٹ اپنے ساتھ لے گئے۔ چاند نے کھیت کیا، تو سمندر میں دُور تک چاندی کے ٹکڑے تیرتے ہوئے بہت اچھے لگے۔ بس دیکھ لیا انہیں۔ اب گھر چلو۔ نہیں خاموش بیٹھے انہیں تکے جا رہے ہیں۔ ایک گھنٹہ، دو گھنٹے، کوئی حد بھی ہے اِس خوش منظری سے لُطف اندوز ہونیکی؟ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے قُلفی جمی جا رہی ہے اور آپ ہیں کہ آنکھیں پھاڑے کبھی چاند کو دیکھتے ہیں اور کبھی سمندر میں بکھرے ہوئے چاند کے ٹکڑوں کو۔ تنگ آکر میں نے کہا "اِس سے پہلے کہ آپ ماہ زدہ ہو جائیں اور LUNATIC کہلائیں آپ کھڑے ہو جائیں"۔ بہت لجاجت سے بولے "بس ابھی چلتے ہیں۔ اک ذرا ــــ" میں نے کہا "ذرا وَرا کچھ نہیں۔ فوراً کھڑے ہو جائیے۔ ورنہ میں یہ چلا"۔ ٹھنڈی سانس بھر کر اُٹھے اور ساتھ ہو لئے۔ رات کے بارہ بجے گھر پہونچے۔ ایسا ہی ایک واقعہ حیدر آباد سندھ میں پیش آیا۔ ایک رات کو جب چاند چڑھ

گیا تو اللہ کا بندہ ساری رات شہر کے باہر سُنسان علاقوں میں گھومتا پھرا اور مجھے اس کے ساتھ گھسٹنا پڑا۔ توبہ کی کہ آئندہ کبھی چاندنی رات میں اِس شخص کے ساتھ نہ جاؤں گا۔

گلاب کا پھول سبھی کو اچھا لگتا ہے، خصوصاً کراچی میں کہ کمیاب ہے۔ ایک دفعہ ایک گُل فروش سے سُرخ گلاب کا پھول لیا تو اُسنے چار آنے کا دیا۔ گلاب کا پھول جمیل صاحب کی کمزوری ہے۔ بے اجازت توڑ لینے یا اس کے چُرا لینے میں بھی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ جاڑوں میں جب آپ انہیں سوٹ پہنے دیکھیں گے تو دل کے اُوپر گلاب لگا ہوا آپکو ضرور دکھائی دیگا۔ اور اگر کوٹ نہ ہوا اور گلاب مل جائے تو اپنی کار کے اسٹیرنگ ہی میں لگا لیں گے۔

جمیل صاحب کی خوش اخلاقی بعض صورتوں میں اِس حد کو پہونچ جاتی ہے کہ لوگ انہیں شک کی نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں، خصوصاً خواتین کے باب میں۔ میں نے بھی چند باران کے التفاتِ فراواں کو دیکھا ہے اور اِس پر انہیں ٹوکا بھی ہے، مگر جمیل صاحب نے گھبرا کر نہایت سادگی سے جواب دیدیا کہ "نہیں، یہ بات تو نہیں ہے۔" مگر بدبینوں یا بدطینتوں کا کیا کیجئے؟ مارتے کا ہاتھ تو پکڑا جا سکتا ہے، کہتے کی زبان نہیں پکڑی جاتی۔ جو لوگ جمیل صاحب کی طبیعت سے واقف نہیں ہیں سمجھتے ہیں کہ عورت جمیل صاحب کی کمزوری ہے، اور واقعی میں جب کسی خاتون سے سابقہ پڑتا ہے تو اُس سے اِس قدر گھُل مل کر باتیں کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ریشۂ خطمی ہوگئے۔ لیکن دراصل یہ انکا حُسنِ اخلاق ہوتا ہے اِن کا جذبۂ احترام ہوتا ہے۔ اور تو اور مُتعارف ہونیوالی خاتون کو بھی مُغالطہ ہو جاتا ہے اور بعض دفعہ جمیل صاحب کی پوزیشن بڑی آکورڈ ہو جاتی ہے (یہ فقرہ میں نے آجکل کی اُردو میں لکھا ہے)۔ دراصل کسی غیر خاتون سے بات کرنا سانپ کا کھلانا ہوتا ہے۔ شیکسپیر کہہ گیا ہے "اے عورت تیرا نام کمزوری ہے۔" خدا جانے اُس کی یہ کمزوری کب عود کر آئے۔ چنانچہ عود کر آئی، اور یہ واقعہ جمیل صاحب نے خود سُنایا کہ گلڈ کے سالانہ اجلاس کے سلسلے میں جو چند خواتین مشرقی پاکستان گئی تھیں اُن میں سے ایک بیاہی تیاہی خاتون نے اتفاق

ان پر منہ مارا مگر یہ حسنِ اتفاق سے بچ گئے اور اُسے اُلٹی منہ کی کھانی پڑی۔ ہوا یہ کہ گلڈ کے اجلاس ختم ہو جانے کے بعد مہمانوں کی ٹولیاں بنا کر مشرقی پاکستان کی سیر کرائی گئی اور چونکہ جمیل صاحب گلڈ کے ایک نہایت ذمّہ دار رکن ہیں بلکہ گلڈ کے بنانے والوں میں سے ہیں اس لئے انہیں چند اور ادیبوں کے ساتھ خواتین کی ٹولی میں شریک کر دیا گیا۔ ریل کسی نہایت خوش منظر علاقے سے گزر رہی تھی۔ جمیل صاحب نے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی ایک خاتون سے کہا۔ "دیکھیے کتنا خوشنما منظر ہے۔" خاتون نے گھوم کر کھڑکی میں سے باہر جھانکا اور ایکدم سے پلٹ کر کہا "ہوں، تو آپ میری کمر دیکھنا چاہتے تھے!" یہ حملہ اس قدر اچانک ہوا کہ جمیل صاحب بھونچکے ہو کر رہ گئے۔ اور جمیل صاحب ہی کیا سارے ہمسفر عورت مرد ہکّا بکّا رہ گئے۔ جمیل صاحب کا چہرہ غصّے سے تمتما گیا، اگر مقابل کوئی مرد ہوتا تو یقیناً مارتے مارتے وہ اس کا بھرکس نکال دیتے۔ جن لوگوں نے یہ سین دیکھا تھا بتایا کہ جمیل خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گیا اور بڑی بُردباری سے بولا "آپ کی کمر میں کیا رکھا ہے جو میں اسے دیکھوں؟" زخمی سانپن نے پھر پھن مارا "آپ لوگ اپنی بیویوں کو ساتھ کیوں نہیں لاتے؟" جمیل نے کہا: "جب آپ اپنے شوہروں کو ساتھ نہیں لاتیں تو ہمیں اپنی بیویوں کو ساتھ لانے کی کیا ضرورت ہے؟" اس پر سب کی طرف سے ایک مِلا جُلا قہقہہ پڑا اور بات ہنسی میں اُڑ گئی۔ مگر جمیل صاحب کی بھلمنساہت دیکھیے کہ اس واقعہ کے بعد بھی انہوں نے اُن محترمہ کے ساتھ اپنے شائستہ رویّہ میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ در اصل جس شخص کو اپنے بیوی بچّوں سے محبت ہوتی ہے وہ ڈھونڈتا نہیں پھرتا۔

اسکول کے زمانے میں کسی انگریزی نظم میں پڑھا تھا کہ ایک ماں اپنے بچّے کو یوں نصیحت کر رہی ہے۔ "بیٹا، اگر دُنیا میں کامیاب زندگی بسر کرنا چاہتے ہو تو "نہیں" کہنا سیکھو۔" اس کا مجھے بار بار تجربہ ہوتا رہا ہے اور آپ کو بھی تجربہ ہوا ہو گا کہ "نہیں" کہنا کس قدر مشکل ہے اور "ہاں" کہنا کس قدر آسان۔ جمیل صاحب "نہیں" نہیں کہہ سکتے۔ ان کے پاس بیسیوں ضرورت مند آتے رہتے ہیں۔ کبھی کسی کو نفی میں جواب نہیں دیتے اور کبھی کسی کا کام کرنے سے انکار نہیں کرتے۔ بہت سوں کا کام اپنی خلافِ مرضی بھی کر دیتے ہیں، بعد میں اس پر متاسف بھی ہوتے ہیں مگر اُس کا کام کر دیتے ہیں اور یہ بھی ہوتا ہے کہ کام ان کے بس کا نہیں ہوتا مگر اُس سے آخر تک ہاں ہاں کئے جاتے ہیں، اور جب کام نہ ہونے پر اگلا اکڑ بگڑتا ہے تو جی ہاں جی ہاں کہہ کر اُس کی کڑوی کسیلی بھی گوارہ کر لیتے۔ میں نے اُنکے اس رویہ پر انہیں اکثر ٹوکا ہے، مگر اُن کی اس ادا میں کوئی فرق نہیں آیا۔ لہٰذا مجھے ان کی "ہاں" مشتبہ نظر آنے لگی۔ سخی سے شوم بھلا جو تُرت دے جواب۔

جمیل صاحب بڑے خلوص سے جھوٹ بولتے ہیں۔ اور جب اُن سے بازپرس کی جاتی ہے تو بڑی محبت سے کوئی خوبصورت عذر تراش لیتے ہیں اور اُن کے اس بھولپن پر غصّے کے بدلے پیار آ جاتا ہے۔ وہ وعدہ کر لیں گے کہ میں کل ٹھیک پانچ بجے آپ کے پاس آؤں گا، مگر اگلے دن وہ سرے سے آتے ہی نہیں۔

"اماں کل کہاں رہ گئے تھے؟"

"کیا بتاؤں شاہد بھائی ـــ سوتا رہ گیا۔ بیوی سے کہا تھا جگا دینا، وہ بھول گئیں۔"

ع ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

"ہم سب انتظار ہی کرتے رہے، آپ کھانے پر تشریف ہی نہیں لائے؟"

"ارے! بالکل بھول گیا۔ بس دیکھیے یہ حال ہوتا جا رہا ہے حافظ کا۔"

ع اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!

جمیل صاحب وقت کی پابندی نہیں کرتے۔ گھنٹہ آدھ گھنٹہ لیٹ ہونا اُن کا معمول ہے۔ چنانچہ اب میں اُن کے لئے اتنا مارجن رکھتا ہوں۔ اگر مجھے اور اُنہیں ساتھ جانا ہوتا ہے تو وہ نہایت وثوق سے کہتے ہیں "میں آ جاؤں گا آپ کے پاس۔" میں عرض کرتا ہوں "جی نہیں، میں آؤں گا آپ کے پاس۔" میں وقتِ مقررہ سے آدھ گھنٹہ پہلے انکے

گھر پہونچتا ہوں، بجلی کی گھنٹی کا بٹن دباتا ہوں۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے آتے ہیں اور پھاٹک کا دروازہ کھولتے ہیں: "آئیے، بس ایک منٹ میں تیار ہو کر آتا ہوں۔" پندرہ منٹ کے بعد برآمد ہو کر کہتے ہیں: "ایک پیالی چائے کی پی لیں، بس چلتے ہیں۔" الیکٹرک ریزر ہاتھ میں لئے چلے آتے ہیں: "یہیں شیو بنالوں۔ آپ اکیلے بیٹھے ہیں۔" کہہ کر ریزر کا پلگ لگاتے ہیں اور چہرے پر استری سی کرنے لگتے ہیں۔ "ابھی بہت دیر ہے۔ دیکھ لیجئے گا وہاں کوئی نہیں آیا ہوگا۔ لوگ وقت کی پابندی ہی نہیں کرتے۔" میں زہر خند کے ساتھ کہتا ہوں "جی ہاں، لوگ وقت کی پابندی ہی نہیں کرتے۔" اور خندۂ دنداں نما کے ساتھ اُنکے رُخساروں پر سینکڑوں ننھے ننھے سے گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ شیو ختم ہو گیا، پلگ نکالا اور ریزر میز پر رکھتے ہوئے بولے "آپ بھی اسی سے شیو کیا کیجئے۔ نہ صابن نہ پانی، چاہے بستر پر لیٹے لیٹے شیو بنالیں۔ بس ابھی آیا۔" دس منٹ پھر گزر گئے۔ ملازم نے دو پیالیاں چائے کی میز لاکر میز پر رکھ دیں، پھر سگریٹ کا ڈبہ رکھ گیا۔ بارے جمیل صاحب دُھلا ہوا جوڑا اور شارک اسکن کی دُودھیا اچکن پہنے نمودار ہوئے۔ ہاتھ میں پانوں کی تھالی۔ "معاف کیجئے گا، کچھ دیر ہو گئی۔ میں نے کہا کہ جلدی سے نہا کر کپڑے بھی بدل لوں۔ ارے! آپ نے چائے نہیں پی؟ ٹھنڈی تو نہیں ہو گئی؟" پیالی کو ہاتھ لگا کر "نہیں، ابھی گرم ہے۔ دیکھ لیجئے گا سب سے پہلے ہم ہی پہونچیں گے۔ پان لیجئے۔ اور یہ سگریٹ دیکھئے کیسا ہے۔ ایک صاحب ترکی سے لائے تھے۔ آئیے چلیں۔" "چلئے صاحب۔" اُن کی کار میں جا کر بیٹھے۔ اِس کار کو چلا چلا کر انہوں نے اِس کا پلیتھن نکال دیا ہے۔ اس کی گدیاں پھٹ گئی ہیں اور جگہ جگہ اس میں سہرے بدھیاں لٹکی ہوئی ہیں۔

"اماں اِس گاڑی کو تو بدلو۔ یہ کیا نیتی لگا رکھی ہے تم نے؟"

"جی ہاں، بدل رہا ہوں۔ چھوٹی کار مل رہی تھی مجھے کوٹے میں۔ میں نے لینے سے انکار کر دیا۔ غلطی کی۔ اب بڑی کار دو سال بعد ملے گی۔"

جب جلسہ گاہ میں پہونچے تو دیکھا کہ آدھا جلسہ ختم ہو چکا ہے۔

"کمال کر دیا اِن لوگوں نے! آج سب وقت پر آ گئے۔ اچھا یوں آ گئے ہوں گے کہ مہمانِ خصوصی غیر ملکی ہے۔ خیر آئیے یہیں بیٹھ جاتے ہیں پیچھے۔"

مگر اِن واقعات کے باوجود میں ان سے اور وہ مجھ سے خفّتی ہیں۔ جس شخص کے جھوٹ تک میں خلوص ہو اُس سے بھلا میں کیسے ناراض ہو سکتا ہوں؟

جمیل صاحب اور آج کل کے "دوستوں" میں یہ فرق ہے کہ جمیل صاحب میری بُرائی نہیں سُن سکتے۔ اپنے کسی دوست کی بُرائی نہیں سُن سکتے۔ اکثر احباب ایسے ہیں جو مجھ سے کہتے ہیں کہ فلاں شخص آپ کی بُرائی کر رہا تھا۔ میں کہتا ہوں "تو پھر آپ نے کیا کیا؟"

"کچھ نہیں، کیا کرتا؟"

"تو گویا آپ نے اُس کی باتوں پر صاد کر دیا؟"

لگے بغلیں جھانکنے۔ معلوم ہو گیا کہ یہ دوست کتنے پانی میں ہیں۔

حال ہی میں جمیل صاحب کے ساتھ بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔

ایک بڑے افسر کے دماغ میں یہ سمائی کہ گلڈ پر قبضہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ اُسنے اپنے ماتحتوں سے کہنا شروع کر دیا کہ "یہ شہاب، عالی، جالبی کیا ہیں؟ کیا گلڈ اِن کی میراث ہے؟"

ہوا خواہوں نے کہا "جی حضور ستیاناس کر رکھا ہے انہوں نے۔ اپنے باپ کی جاگیر سمجھ رکھا ہے گلڈ کو۔"

"ہم کیوں نہ چلائیں گلڈ کو؟"

"اگر ایسا ہو جائے تو سُبحان اللہ۔ گلڈ کے دن پھر جائیں گے۔"

"بس تو اب کے الیکشن لڑنے کی تیاری کی جائے۔"

حکمِ حاکم مرگِ مفاجات۔ تو صاحب پروپیگنڈا شروع ہو گیا۔ ایک صاحب میرے

پاس بھی تشریف لائے۔ وہ جانتے تھے کہ مجھے بھی گلڈ سے کچھ شکایتیں ہیں۔ مجلسِ عاملہ کے اجتماعوں میں وہ دیکھ چکے تھے کہ میں کس قدر بدلحاظی کے ساتھ عالی اور جمالی پر اعتراضات کرتا ہوں۔ اِسی سے شاید اُنہیں غلط فہمی ہوئی۔ بولے "اِن لوگوں نے گلڈ کو من چلی بنالیا ہے۔ فلاں افسر صاحب ہماری رہنمائی فرمائیں گے اور ہمارا سارا گروپ اِن کا ساتھ دے گا۔" یہ سنکر میرا پارہ چڑھ گیا۔ میں نے کہا "دیکھو جی، گلڈ بنانے والوں کے خلاف میں ایک لفظ بھی نہیں سُن سکتا۔ یہ تم نے کیا سازش پھیلائی ہے؟ رہ گئے تمہارے افسر، تو اُنہیں ادب اور ادیبوں سے کیا واسطہ؟ تمہیں شرم نہیں آتی کہ ادیب ہو کر ایک بے ادب کو گلڈ پر مُسلط کرنا چاہتے ہو۔" وہ صاحب شرمندہ ہو کر معذرت کرتے ہوئے چلے گئے اور جا کر افسر صاحب سے سارے موتی پرو دیئے۔ اس کے بعد یہ سُننے میں آیا کہ اِن حضرات نے الیکشن نہ لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے بلکہ الیکشن میں سرے سے شریک ہی نہیں ہوں گے۔ میں نے کہا کاش وہ شریک ہو جاتے تو انہیں اپنی وقعت تو معلوم ہو جاتی۔ بات آئی گئی ہوئی۔ میں بھی اس واقعہ کو بھول گیا۔ چند روز بعد ہوا یہ کہ ایک چھوٹی سی ادبی تقریب میں وہ افسر صاحب اور ان کے ہوا خواہ شریک ہوئے۔ جمیل صاحب بھی وہاں بُلائے گئے تھے۔ خبر نہیں کس سلسلے میں میرا ذکر نکال کر افسر صاحب نے کہا "وہ اوروں کو تو کہتے ہیں کہ اس کا ادب میں کنٹری بیوشن کیا ہے، مگر خود شاہد صاحب کا کنٹری بیوشن کیا ہے؟" ماتحتوں کی تو زبانیں کِلی ہوئی تھیں، بھلا کیسے بولتے۔ ایک صاحب نے سنبھیا ٹالنے کے لئے کہا "جمیل صاحب سے پوچھئے۔" جمیل صاحب ویسے تو ٹھنڈے مزاج کے آدمی ہیں مگر اُسوقت تاؤ کھا گئے۔ بولے "جن کے مُنہ پر آنکھیں نہیں ہوتیں انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔" افسر صاحب نے کہا "پھر بھی۔ آخر اُن کا کارنامہ کیا ہے؟" جمیل صاحب بولے "جو لوگ اُردو پڑھ سکتے ہیں وہ بھی جانتے ہیں کہ شاہد صاحب ۳۳ سال سے ساقی شائع کر رہے ہیں۔ انہوں نے سینکڑوں ادیب بنا ڈالے۔ آج کا شاید ہی کوئی ادیب ایسا

ہو جو اُن کا رہینِ منت نہ ہو۔"

"مگر خود انہوں نے کیا لکھا ہے؟"

"چالیس کے قریب تو اُنکی کتابیں اسوقت موجود ہیں۔ پانسو سے زیادہ اُنکے مضامین چھپ چکے ہیں۔ اتنی ہی چیزیں وہ ریڈیو کیلئے لکھ چکے ہیں۔ ترجمہ کرنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ رپورتاژ اور خاکہ لکھنے میں تو اُنکا جواب ہی نہیں ہے۔ اُن جیسی زبان لکھنے والا اب اور کوئی نہیں ہے۔ صاحبِ طرز ادیب ہیں۔ اب آپکو معلوم ہوا اُنکا کنٹری بیوشن کیا ہے؟ اپنی ادبی خدمات اور قابلیت ہی کی وجہ سے مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے ادبی اجتماعوں میں بُلائے جاتے ہیں، اور تو اور تھائی لینڈ اور فلپائنز میں ثقافتِ پاکستان پر لیکچرز دینے کیلئے پورے پاکستان کو شاہد صاحب ہی منتخب کر کے بھیجے گئے تھے۔ پورے پاکستان کے تمام زبانوں کے ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دینا اور گلڈ کی خشتِ اوّل رکھنا بھی شاہد صاحب ہی کا کارنامہ ہے۔ آپ تو اُنکی بھی مکّھی اور ٹوٹی جُوتی دیکھتے ہیں۔ آپکو وہ لعل کیسے دکھائی دے سکتا ہے جو اِس گدڑی میں چھپا ہوا ہے۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ✦ چشمۂ آفتاب را چہ گناہ؟

اجتماع بے مزہ ہو گیا۔ صاحبِ خانہ روکتے ہی رہے، جمیل صاحب اُٹھ کر چلے آئے مگر مجھ سے اس واقعہ کا ذکر جمیل صاحب نے نہیں کیا۔ دو ایک اور حضرات جو اس اجتماع میں شریک تھے انہوں نے مجھے ساری رُوداد سُنائی۔ میں نے کہا جمیل صاحب ناحق اُس کور باطن سے اُلجھے۔ یہ تو وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اور جنکے کانوں پر اور جنکی آنکھوں پر مُہریں لگی ہوئی ہیں۔" مجھے اِس واقعہ کو تفصیل سے یوں بیان کرنا پڑا کہ اِس سے جمیل صاحب کے کردار کا ایک خاص پہلو اُجاگر ہوتا ہے۔

جمیل صاحب اچھے کھانے اور اچھے لباس کے شوقین ہیں۔ وجیہہ اور جامہ زیب آدمی ہیں۔ ہر لباس اُن پر پھبتا ہے۔ مزاج میں نفاست ہے جو گفتگو میں شائستگی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ میں نے اُنکے مُنہ سے گالی کبھی نہیں سُنی۔ فحش گفتگو میں حصہ نہیں لیتے۔ بیٹھے جھینپتے رہیں گے۔ آدمی ہیں، آخر کوئی عیب تو ہو ورنہ فرشتے ہی کیا بُرے تھے؟ بھئی شراب نہ پیتا ہو سگرٹ تو پیئے، یہ بھی نہیں۔ ہاں پان البتہ

کھاتے ہیں، اور بہت کھاتے ہیں مگر خاص اہتمام سے۔ وہ دیسی پان تو خیر یہاں ہے ہی نہیں جو اگر ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرے تو چار ٹکڑے ہو جائے، ہاں سانچی اُس سے کچھ ملتا جلتا ہے، اسکی رگیں چھیل جاتی ہیں۔ گھر میں خوبصورت سی چاندی کی ٹپاری ہے۔ کتھا کسی خاص طریقے سے پکایا اور چھانا جاتا ہے۔ چُونے کی تیزی کم کرنے کیلئے دہی کی آمیزش کی جاتی ہے۔ چھالیا پُرانی ڈھونڈ کر لائی جاتی ہے۔ بھابی اِسے سڈول اور باریک کاٹ کر کے بھرے رکھتی ہیں۔ چوگھڑا الائچی، خوشبودار زردہ اور قوام موجود۔ جمیل صاحب گُٹّے بھر بھر کے زردہ کھاتے ہیں اور قوام چاٹتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر نے جب سے منع کیا ہے کچھ کم کر دیا ہے۔ پانوں کی ڈبیا پہلے ساتھ رکھتے تھے۔ جب چاروں طرف سے اس پر یورش ہونے لگی تو ڈبیا ساتھ رکھنی چھوڑ دی۔ کراچی کے تمام اچھے تنبولیوں کی دُوکانیں انہیں معلوم ہیں۔ لارنس روڈ پر ایک روپے تک کا پان انہوں نے ہمیں کھلوایا ہے۔ مگر وہ پان تھا؟ الائچی سے لیکر مُشک و عنبر تک اس میں موجود تھا اور "در ورقِ طلا پیچیدہ"۔ ایک دن راہ چلتے چلتے انہیں پان کھانے کی حاجت ہوگئی۔ جو پہلا پنواڑی ملا اُس سے دو پان بنوالئے۔ میں نے جو مُنہ میں رکھا تو مُنہ کے ٹکڑے اُڑ گئے۔ میں نے گھبرا کر پان والے سے کہا "دو ایک لونگیں تو دو۔" جمیل صاحب نے کہا "لونگ مت کھائیے۔ بہت گرم ہوتی ہے۔ ایک لونگ کھانا ایسا ہے جیسے ساٹھ بینگن کھالئے۔" مجھے اُن کے اِس بھولپن پر ہنسی چھوٹی۔ ضبط کر کے بولا "فی الحال تو میں نے ایک سو ساٹھ بینگن کھالئے۔" بچارے خفیف ہو کر رہ گئے۔ بھولے آدمی کی ہے بڑی مُشکل!

جمیل صاحب کا تذکرہ حسینوں کی زلف کی طرح دراز ہوتا چلا جا رہا ہے۔

ع لطیف بُود حکایت دراز تر گفتم

بڑی محبوب شخصیت ہے جمیل صاحب کی۔ جب صورت اور سیرت دونوں میں جمال ہی جمال ہو تو کیسے مجال دُوری ہو سکتی ہے؟

اللہ جمیلٌ و یحبُّ الجمال۔

شاہد احمد دہلوی

مُغل بادشاہوں کا آفتابِ جلال غروب ہو رہا تھا۔ دلّی کے لال قلعہ میں مغلوں کی آخری شمع جھلملا رہی تھی۔ بادشاہ کی حیثیت شاہِ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔ فرنگیوں سے ایک لاکھ روپیہ ماہانہ پنشن ملتی تھی، وہ بھی اِس شرط پر کہ ان کے بعد تاج و تخت کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور فرنگیوں کا اقتدار قائم ہو جائے گا۔ مگر ہاتھی مَرے پیچھے بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ اِس مُردہ حالت میں بھی تیموری جاہ و جلال کا دفتر بہت کچھ باقی تھا۔ لال حویلی تہذیب و شائستگی کی علامت سمجھی جاتی تھی، اور شہر بہت کچھ اُجڑ جانے پر بھی علوم و فنون کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ بھانت بھانت سے لوگ کھنچے چلے آتے اور اپنی مُرادیں پاتے۔ شہر آبادی کے یہی شب و روز تھے کہ سات سال کا ایک لڑکا تحصیلِ علم کے شوق میں بجنور سے دلّی آیا اور پنجابی کٹڑے کی مسجد کے طالب علموں میں شامل ہو گیا۔ دوسرے طالبِ علموں کی طرح یہ لڑکا بھی محلّے کے گھروں سے روٹی مانگ لاتا اور رُوکھی سُوکھی جو بھی میسر آتی خدا کا شُکر ادا کر کے کھالیتا۔ رات کو کڑکڑاتے جاڑوں میں مسجد کی صفوں میں لپٹ کر سو جاتا۔ اگر کسی دن جلدی آنکھ نہ کھلتی تو مسجد کا مُلّا ایک لات رسید کرتا اور لڑکا لُڑھکتا ہوا چلا جاتا اور ساتھ کے ساتھ صف بھی بچھ جاتی۔ دن بھر اور رات گئے تک اِس لڑکے کو بس پڑھنے سے کام تھا۔ علم کی لگن میں صبر و شُکر سے تمام سختیوں کو جھیلتا رہا۔ غریب کا بچّہ اور کر بھی کیا سکتا تھا؛ شوق اور ذہانت کے

پر اُسے اُڑائے لئے چلے گئے۔ مکتب سے نکل کر دلّی کالج میں پہونچا اور وہاں سے سند لینے کے بعد ترقی کی راہیں اُس پر کھل گئیں۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر جا پہونچا۔ اُس زمانے میں یہ آخری بڑا عہدہ تھا جو فرنگی راج میں کسی دیسی آدمی کو مل سکتا تھا۔ اتنے ہی میں سر سالار جنگ نے انہیں جا پکڑ کر حیدرآباد بُلا لیا اور یہ صاحب اپنی اعلیٰ کارکردگی کے باعث اُونچے سے اُونچے مرتبوں تک پہونچے۔ اللہ نے عزت بھی دی اور بے تحاشا دولت بھی۔ اخلاقی اور مذہبی کتابیں لکھنے کی وجہ سے نیکنامی اور شُہرت بھی ملی۔ آپ سمجھے بھی یہ کون بزرگ تھے؟ یہ تھے ڈپٹی نذیر احمدؔ جن کی کتابیں اور ترجمۂ قرآن گھر گھر پڑھا جاتا ہے۔

اِن ڈپٹی نذیر احمد کے اکلوتے بیٹے تھے بشیر الدین احمد جن کی ابتدائی تعلیم خود شفیق باپ کے سایہ میں ہوئی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد میاں بشیر بغرضِ ملازمت دکن چلے گئے اور اوّل تعلقداری سے وظیفہ یاب ہوئے۔ یہ بھی اپنے نامی گرامی والد کی طرح بہت بڑے مُصنّف اور مُورخ تھے۔ ادبی اور اخلاقی کتابوں کے علاوہ دو ضخیم جلدوں میں تاریخِ بیجاپور اور تین بڑی جلدوں میں تاریخِ دہلی لکھی۔ یہ اُن کے دو بڑے تحقیقی کارنامے ہیں۔ جب تک زندہ رہے اِن کے ہاتھ سے کبھی قلم نہیں چھوٹا۔

میاں بشیر کی شادی سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں دلّی کے ایک معزز خاندان میں ہو گئی تھی۔ اللہ کا دیا سب کچھ موجود تھا مگر پندرہ سال تک کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ میاں بیوی تو اِس محرومی پر بھی مطمئن و قانع تھے مگر خاندان میں کھلبلی مچ گئی اور مُنہ جُڑنے لگے۔ پھر مولوی نذیر احمد کے کان میں بھی صدائیں پڑنے لگیں۔ پہلی بیوی کی موجودگی میں نکاحِ ثانی کے وہ خلاف تھے مگر جب چاروں طرف سے اُن پر عزیزوں کا دباؤ پڑا اور انہوں نے خاندان کا چراغ گُل ہوتے دیکھا تو وہ بھی پسیج گئے۔ بیٹے اور بہو میں بڑا پیار دُلار تھا۔ بیٹے سے کیسے کہیں کہ اپنی چہیتی بیوی پر سوکن لے آ۔ میاں بشیر کی والدہ

سے کہا کہ تم سمجھاؤ۔ انہوں نے بیٹے کو چُمکار پُچکار کر رضامند کیا اور غریب مگر شریف خاندان کی ایک سیدانی سے چُپ چپاتے اُن کا نکاح پڑھوا دیا۔ اللہ کی شان کہ ان سیدانی سے بھی دس سال تک اولاد نہیں ہوئی۔ بڑی دلہن کی بن آئی اور انہوں نے طعنوں تشنوں سے جان ضیق میں کر دی۔ جب معاملہ تنت پر پہونچ گیا تو چھوٹی دُلہن کی کوکھ ہری ہوئی۔ خاندان کے سُوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا۔ اللہ نے چاند سا بیٹا دیا۔ دنوں اس کی خوشی منائی گئی۔ ڈپٹی صاحب نے پوتے کا نام منظور احمد رکھا۔ اس کے بعد تو خدا کی دین ایسی ہوئی کہ یکے بعد دیگرے تین لڑکے ہوئے۔ منجھلے کا نام مُبشّر احمد اور سنجھلے کا نام شاہد احمد رکھا گیا۔

اب ان سنجھلے صاحبزادے میاں شاہد احمد کی مختصر سی سرگزشتِ حیات سنئے اور خود انہی کی زبانی سُنئے۔

میں ۲۲ مئی سنہ ۱۹۰۶ء کو دلّی میں، اپنے آبائی مکان میں پیدا ہوا۔ چار سال کی عمر سے پہلے کی باتوں کا مجھے ہوش نہیں ہے۔ ایک خواب کا سا خیال ہے کہ ابّا جب حیدرآباد سے دلّی آتے تو سب سے پہلے ہمیں دادا ابّا کی خدمت میں لے جاتے۔ ابّا دادا ابّا سے بغلگیر ہو کر رونے لگتے اور ہم حیران ہو کر انہیں تکتے رہتے۔ پھر دادا ابّا ہمیں ایک ایک اشرفی دیتے اور ہم چُپکے سے وہاں سے کھسک لیتے۔ بس اور کچھ یاد نہیں ہے۔

جب میں چھ سال کا ہوا تو چھوٹی بہن صفیہ حیدرآباد میں پیدا ہوئی۔ انہی دنوں ابّا کو کسی ضروری کام سے دلّی جانا پڑا۔ اِدھر ابّا دلّی روانہ ہوئے اُدھر امّاں کی طبیعت ایکا ایکی خراب ہوئی۔ اس کی اطلاع فوراً بذریعۂ تار ابّا کو دی گئی۔ وہ اُلٹے قدموں دلّی سے لَوٹے۔ مگر جب حیدرآباد پہونچے تو امّاں کا جنازہ صحن میں رکھا پایا۔ اچھا بھلا چھوڑ کر گئے تھے، یہ کیا ہوا؟ چکرا کر گرنے ہی والے تھے کہ کسی نے لپک کر انہیں تھام لیا۔

ابا بڑے صبر و ضبط کے آدمی تھے۔ آنسو پیتے رہے۔ اماں کو سپردِ خاک کرنے کے بعد آنسوؤں کا سیلاب ضبط کے بند کو بہالے گیا، اور وہ ہم بچوں کو گلے لگا کر روتے رہے۔ اس سے اُن کے دل کی بھڑاس نکل گئی۔ مگر ساری عمر جب بھی انہیں اماں کا خیال آجاتا تھا رونے لگتے تھے۔

ماں کی کمی پوری کرنے کے لئے ابا نے ہم پر یورپین اور اینگلو انڈین گورنسیں رکھیں اور ہمیں اچھے سے اچھے کانونٹ اسکولوں میں تعلیم دلائی۔ گھر پر بھی ماسٹر پڑھانے آتے اور ابا خود بھی ہمیں انگریزی اور اُردو پڑھاتے تھے۔ پھر ایک دفعہ ابا دلّی آئے تو مطبع مجتبائی میں مولوی عبدالاحد کے ہاں ان کی ملاقات ڈاکٹر ضیاء الدین سے ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں مشورہ دیا کہ بچوں کو علی گڑھ میں داخل کر دیا جائے۔ ۱۶ء میں ہم تینوں بھائیوں کو ایم۔ اے۔ او اسکول علی گڑھ میں داخل کر دیا گیا۔ اُس زمانے میں بچوں کا بورڈنگ ظہور وارڈ تھا۔ تقریباً تین سال ہم نے علی گڑھ میں پڑھا۔ اس کے بعد عدم تعاون کی تحریک نے زور پکڑا، اور مولانا محمد علی نے جامعہ ملیہ علی گڑھ میں قائم کیا۔ ابا نے ہمیں علی گڑھ سے اُٹھا لیا۔ وہ حیدر آباد سے پنشن لے کر دلّی آگئے تھے۔ ہمیں عربک اسکول میں داخل کرا دیا۔

۲۳ء میں دلّی سے میٹرک پاس کرنے کے بعد میں نے لاہور جا کر ایف۔ سی کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں سے ایف۔ ایس۔ سی (میڈیکل) پاس کرنے کے بعد میڈیکل کالج میں داخل ہوا۔ سڑی ہوئی لاشوں پر کام کرنے سے طبیعت اس قدر مکدّر اور بیزار ہوئی کہ ایک سال ہی میں وہاں سے بھاگ لیا۔ دلّی آکر میں نے انگریزی ادبیات میں بی۔ اے (آنرز) کی ڈگری لی۔ اس سے ایک سال پہلے ابا کا انتقال فالج میں ہو گیا تھا۔ وہ ہمارے لئے پچاس ہزار روپیہ نقد اور دو دو سو روپے ماہانہ کی جائداد چھوڑ گئے تھے۔ اسی لئے کمانے دھمانے کا ہمیں کوئی فکر نہیں تھا۔ میں نے فارسی ادبیات میں ایم۔ اے میں داخلہ لیا۔ یہ ۲۹ء کا ذکر ہے۔ میرے ایک رشتے کے بھانجے ہیں

انصار ناصری، جو میر ناصر علی صاحب "صلائے عام" کے پوتے ہیں۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ دلّی سے ایک عمدہ ادبی ماہنامہ جاری کیا جائے۔ اپنی سمجھ میں بھی یہ بات آگئی اور بغیر کسی تجربے یا مشورے کے جنوری ۳۰ء میں ماہنامہ ساقی جاری کر دیا۔ کوئی چار پانچ سال کی اُلٹا پلٹی میں اس پرچے نے اپنی جگہ تو بنالی مگر میرے ماموں نے جو اس پرچے کا اہتمام کرتے تھے، مجھے بتایا کہ اس پرچے پر پچیس تیس ہزار روپیہ ضائع ہو چکا ہے، اور اگر یہی روش رہی تو باقی روپیہ بھی یونہی نکل جائے گا۔ اِدھر بھائیوں نے بھی لعنت ملامت کی تو آنکھیں کھُلیں۔ پرچے کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں لیا اور ہمعصر ادیبوں کی کتابیں چھاپنی شروع کیں۔ ڈوبتا ہوا کاروبار تر گیا اور ۴۷ء میں ساقی بک ڈپو کی مالی حیثیت دو لاکھ کی تھی، اور پندرہ ہزار روپیہ ادیبوں اور شاعروں کی طرف بطور پیشگی باقی تھا۔ محاسبۂ نفس بڑی مشکل چیز ہے اور میرے لئے خود ستائی اس سے بھی زیادہ مشکل۔ لہٰذا ایک کرم فرما کے دو خطوں کے اقتباسات درج کرتا ہوں تاکہ آپ کو میرے کچھ وہ حالات بھی معلوم ہو جائیں جنہیں میں خود بیان نہیں کر سکتا۔ یہ خطوط راجہ مہدی علی خاں کے ہیں، اور حال ہی میں موصول ہوئے ہیں۔

> "ہزاروں سال پہلے، جب آپ دلّی سے کھو گئے تھے، اور آپ کی زندگی کے بارے میں خدانخواستہ بُری بُری افواہیں پھیل رہی تھیں، یہاں کے بہت سے دوست آپ کے لئے بے حد مُتفکّر اور دست بدُعا تھے۔ بہت عرصے بعد ایک دن معلوم ہو گیا کہ آپ بفضلِ خدا خیریت سے ہیں اور پاکستان میں ہیں۔ اِس کے بعد مَیں سست اور بے فکر ہو کر فلمی دُنیا کی مصروفیات میں بہت بُری طرح کھو گیا۔ اور اُس وقت بھی کھویا ہوا تھا، جب مجھے عزیز دوست منٹو کی موت کی خبر موصول ہوئی۔ مجھے بیحد شرمندگی تھی کہ اِس دوران میں مَیں نے منٹو کو بھی صرف دو ایک خط لکھے، اور وہ بھی

اُس کے خطوں کے جواب میں۔ سالہا سال گذر گئے لیکن میں نے پاکستان یا ہندوستان کے کسی شاعر یا ادیب دوست کو کوئی خط نہ لکھا۔ آج سے تقریباً ڈیڑھ سال قبل "بسترِ مرگ" پہ میری ادبی زندگی کا دوبارہ آغاز ہوا۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ پچھلے پرچوں میں سے کون سے زندہ ہیں کون سے مر گئے۔ اسی جستجو اور تلاش کے سلسلے میں معلوم ہوا کہ کراچی سے ساقی شائع ہوتا ہے۔ میرا حافظہ ٹھیک نہیں رہا۔ میرا قیاس ہے کہ ایک خط میں نے آپ کو بھی لکھا تھا۔ اس کے بعد میں پھر بھول گیا۔ ایک مرتبہ ایڈیٹر نقوش کو بھی خط لکھا۔ نقوش میرے نام جاری ہو گیا، شاید آپ ہی نے جاری کرایا ہو۔ یہ پرچہ اب بھی باقاعدگی سے میرے نام موصول ہوتا ہے، اور اپنی عالی ظرفی اور میری کم ظرفی کا احساس مجھے دلاتا رہتا ہے۔ ایک دن نقوش میں نقوش کے سلسلے میں آپ کا مضمون پڑھا تو حافظہ مجھے کئی سال پیچھے کی طرف لے گیا۔ دلی کی دوسری پرانی یادیں تازہ ہونے کے علاوہ وہ گھڑیاں آنکھوں میں پھر گئیں جو کبھی آپ کے پاس گزری تھیں۔ اور یکایک خیال آ گیا کہ جس طرح بعض دوسرے شاعروں اور ادیبوں کے آپ کام آیا کرتے تھے، میری زندگی کا رُخ بدلنے میں بھی خدا کے بعد آپ ہی کا ہاتھ تھا — مجھے فلم انڈسٹری میں داخلہ آپ کے صرف ایک خط سے مل گیا، جو آپ نے میرے لئے منٹو مرحوم کو لکھا تھا۔ اسی قسم کے ایک سفارشی خط کی درخواست میں نے اپنے ماموں جناب حامد علی خاں صاحب سے بھی کی تھی۔ اگرچہ انہیں ریڈیو میں لانے والا میں ہی تھا، مگر انہوں نے مجھے سفارشی خط دینے سے انکار کر دیا تھا۔ آپ ہی میرے کام آئے۔ آج میں جو کچھ ہوں وہ سب کچھ آپ کے طفیل سے حاصل کیا ہے۔

آپ کے اس احسان کا بدلہ میں کبھی نہیں چکا سکتا۔"

. . . .

"اتنے عرصے کے بعد آپ کا گرامی نامہ موصول ہو کر بے حد مسرت کا باعث ہوا۔ لیکن جب آپ کے اور ساقی کے حالات معلوم ہوئے تو میری یہ تمام خوشی رنج و غم میں تبدیل ہو گئی۔ بہت دیر تک بلکہ بہت دنوں تک میں پریشان و مغموم رہا، اور اِس وقت بھی ہوں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب بھی کوئی ادیب کسی بہت بڑی مالی پریشانی میں مُبتلا ہوا، بھاگا ہوا آپ کے دروازے پر پہونچا اور ہنستا ہوا واپس آ گیا کہ میں اپنا مسودہ شاہد صاحب کو دے کر پیسے لے آیا ہوں۔ شاہد احمد کا دور ایک ایسا دور تھا جس سے ہر وقت ضرورتمند ادیبوں کی ضرورتیں خدا پوری کر دیا کرتا تھا۔ آہ وہ "بنک" لٹ گیا۔ وہ "خزانہ" پامال ہو گیا۔

مجھے وہ زمانہ بھی اچھی طرح یاد ہے جب میں دلی ریڈیو پر اسٹاف آرٹسٹ تھا۔ ایک مرتبہ میرے پاس کپڑے ختم ہو گئے تھے، کچھ مقروض بھی تھا۔ میں "مضراب" کا مسودہ لے کر آپ کے پاس پہونچا۔ آپ نے پوچھا۔ "کیا چاہئے؟" میں نے کہا "میری ضرورتیں اِس وقت تین سو روپے میں پوری ہو جائیں گی۔" ایک منٹ کے توقف کے بغیر آپ نے تین سو روپے لا کر مجھے دے دیئے۔ بحیثیت ایک پبلشر اور کاروباری آدمی کے آپ کو مجھ سے کہنا چاہئے تھا کہ بھائی دو سو لے لو، ڈھائی سو میں سودا ہو جائے لیکن آپ نے مجھے فوراً وہ رقم دے دی۔ جب میں نے کہا "رسید؟" آپ نے کہا "پھر دیکھا جائے گا۔" اور آپ نے مجھ سے کبھی اُس رقم کی رسید تک لینے کی ضرورت نہ سمجھی۔

آج سے تقریباً پندرہ سولہ برس پہلے تین سو کی رقم اتنی حقیر نہیں

سمجھی جاتی تھی جتنی آج کل۔ یہ رقم میرے بہت سے کاموں میں صرف ہوئی۔

غرض کہ سینکڑوں ادیبوں کے لئے شاہد احمد کا در برسہا برس تک درِ حاتم بنا رہا۔ وہی شاہد احمد آج خود ریڈیو میں اسٹاف آرٹسٹ ہے، اور صرف ساڑھے چار سو روپے ماہوار پا رہا ہے۔ حالانکہ ایسے کئی ساڑھے چار سو ہم لوگ اُس سے چھین کر لے جایا کرتے تھے۔ زندہ باد شاہد احمد! جو کبھی دلّی کی رونق تھا، دلّی کے ادب کا گہوارہ تھا، دلّی کا "دربار" تھا، دلّی کا بادشاہ تھا۔ ہر شاعر، ہر ادیب کے لبوں پر اُس کا نام تھا۔ اِس طرح رہتا تھا کہ نام لینے والے یہ کہے بغیر نہ رہ سکتے ؎

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

ہم لوگوں کی یہ بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ دونوں مُلکوں کا یہ صاحبِ طرز انشا پرداز، واحد زباں داں، آج اِس طرح "گوشہ نشینی" کی زندگی بسر کر رہا ہے، اور ہم لوگوں کے کان پر جُوں تک نہیں رینگتی۔ ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی کہ شاہد احمد کا "مشغلۂ روزگار" موسیقی کی تعلیم ہے۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے برنارڈ شا ریوڑیاں بیچ رہا ہو، یا شیکسپیئر نے "نان اور کباب" کی دُکان کھول لی ہو۔

میوزک کوئی گھٹیا چیز نہیں، نہ میوزک سے دلچسپی لینا گھٹیا پن ہے (میں خود میوزک ہی سے کماتا ہوں) لیکن میوزک کے جاننے والے تو مُلک میں اور لوگ بھی ہیں۔ شاہد احمد ہندوستان اور پاکستان میں صرف ایک ہے۔ اِس "صرف ایک" کی ہم صحیح قدر نہیں کر رہے، اِس "صرف ایک" کو ہم نے نہیں پہچانا۔ اِس "صرف ایک" سے ہم نے فائدہ نہیں اٹھایا، اِس "صرف ایک" کی عظمت سے ہم واقف نہیں۔

خیر، ہیرا یا موتی کسی بہت ہی خوبصورت الماری میں رکھا ہو یا کسی معمولی طاق میں، اس کی قدر و قیمت یا اس کی عظمت میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب بھی ہزاروں لوگ ایسے ہیں، جن میں خود راجہ مہدی علی خاں جیسی حقیر ہستی بھی شامل ہے، جو شاہد احمد سے مُصافحہ کر لینا بھی اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ بلکہ میری تو خدا سے دُعا ہے کہ اے خدا اگر تو مجھے شاہد احمد جیسے عظیم الشان، نیک دل، خدا ترس انسان کے قدموں کی خاک کا درجہ بھی عطا فرما دے تو میں سمجھوں گا مجھے عمر بھر کی عبادت کا حد سے زیادہ صلہ مل گیا۔

آپ میرے مُحسن ہیں۔ آپ کی وجہ سے میں فلم انڈسٹری میں آیا، موٹریں خریدیں، بے شمار دولت کمائی، نام پیدا کیا، اور مجھ خود غرض انسان نے کبھی آپ کا شُکریہ تک ادا نہ کیا۔ مجھ میں اور شاہد احمد میں کتنا فرق ہے!

میری خدا سے دُعا ہے کہ مرنے سے پہلے میں شاہد احمد جیسے بلند انسان کو پہلے سے بھی زیادہ "اُونچی بلندیوں" پر دیکھ لوں۔ "بلندیوں" سے میرا مطلب دُنیوی بلندیاں ہے۔

شاہد صاحب! میں آپ کے اُن دوستوں میں سے ایک ہوں جو آپ سے بہت کم ملے، جو آپ کی صحبتوں میں بہت کم mix ہوئے، لیکن ہمیشہ دل و جان سے آپ کے گرویدہ رہے۔

شاہد بھائی، یقین مانئے: آپ اپنی بہت سی قیمتی چیزیں تو یہاں چھوڑ گئے لیکن آپ کی ایک نہایت ادنیٰ سی چیز بھی یہاں رہ گئی جس کا شاید آپ کو خیال تک نہیں۔ وہ چیز ہے راجہ مہدی علی خاں۔ کاش اس آدمی

کو پھر آپکے قدموں کا قُرب حاصل ہو سکے۔

آپ کا گرامی نامہ پڑھ کر مجھ پر رقّت طاری ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اور کیا لکھوں۔

”مضراب“ کے حقوق لوٹانے پر اگر رسمی شکریہ ادا کروں گا تو آپکے عظیم الشان اخلاق کی توہین ہو جائے گی۔

آپ کے خط نے مجھے [illegible] اور مخبوط الحواس کر دیا ہے۔ خط لکھتے لکھتے بھی نروس ہوا جا رہا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ لکھتا ہی جاؤں، لیکن رقّت اور افسوس کے جذبات پریشان کئے دے رہے ہیں۔

یوں معلوم ہو رہا ہے جیسے ایک فقیر جلا وطن بہادر شاہ ظفر کو خط لکھ رہا ہے۔“

……

دلّی کا سارا کاروبار ۱۹۴۷ء کے کُشت و خون کی بھینٹ چڑھ گیا۔ آں دفتر را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب بُرد۔ ہمیں بیک بینی و دو گوش دلّی سے نکلنا پڑا۔ پُرانے قلعہ میں تین دن پناہ لینے کے بعد ریل سے لاہور روانہ ہوئے۔ رات کو پٹیالہ کے علاقے میں ریل پر حملہ ہوا۔ آدھی ریل کٹ گئی۔ ہم سخت جان تھے بچ گئے۔ بُرے حال بانکے دھیاڑے لاہور پہونچے۔ یہاں کی فضا راس نہ آئی۔ دس مہینے بعد کراچی آ گئے۔ ”ساقی“ دوبارہ جاری کیا، مگر اب اِس کا نقصان کہاں سے بھرا جاتا؟ اِسی تردّد میں تھا کہ ریڈیو پاکستان نے میوزک سپروائزر کی خدمت پیش کی۔ بشکریہ کے ساتھ اِسے قبول کیا۔ خدا جانے موسیقی کا شوق کہاں سے مجھے لگا۔ مولویوں کا خاندان، دُور دُور تک گانے بجانے کا چرچا نہیں۔ مگر سُنتے آئے ہیں کہ اولیا کے گھر بھوت پیدا ہو جاتے ہیں، شاید یہی بات ہو۔ سولہ سال کی عمر سے کلاسیکی موسیقی اچھے اُستادوں سے سیکھنی شروع کی تھی۔ خاندان والے

ناراض ہوتے کہ یہ کیا بیہودہ شوق لگ گیا ہے؟ میں خود بھی کبھی کبھی سوچتا تھا کہ موسیقی، اور وہ بھی کلاسیکی موسیقی سے آخر حاصل کیا ہوگا؟ اب اندازہ ہوتا ہے کہ اگر میرے پاس یہ موسیقی کا علم و فن نہ ہوتا تو خدا جانے یہاں میرا حشر کیا ہوتا۔ ہاں تو ۱۹۳۶ء سے آل انڈیا ریڈیو کے کئی اسٹیشنوں سے کلاسیکی موسیقی نشر بھی کرنی شروع کر دی تھی مگر ایس۔ احمد کے نام سے۔ پاکستان آنے کے بعد یہ راز بھی راز نہ رہا۔ ع

کجا مانند آں رازے کزو سازند محفلہا؟

اب ہمارا شمار ادب کے علاوہ موسیقی کے اُستادوں میں بھی ہوتا ہے ع

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا!

میری زندگی کے دو پہلو ہیں: ادب اور موسیقی۔ میں خوش ہوں کہ میں نے اپنی دونوں کے علم و فن کی بُری بھلی خدمت کی اور خدا کے فضل سے نیک نامی کے ساتھ۔ اِسی خدمت کی بُنیاد پر سیٹو نے جب اپنے ممبر مُلکوں کے لئے گشتی مقررین کی اسکیم منظور کی تو پاکستان کے دانشوروں میں سے سب سے پہلے مجھے ۱۹۵۹ء میں منتخب کیا کہ تھائی لینڈ اور فلپینز میں پاکستان کے کلچر پر ان ملکوں کے مشہور اداروں اور شہروں میں لکچر دوں۔ مجھے اس پر فخر ہے کہ میں نے اِس خدمت کو انجام دے کر اپنے ملک کی تہذیب و ثقافت سے دُور اُفتادہ مُلکوں کو مُتعارف کیا۔ ۱۹۶۱ء میں خیرسگالی کا ایک ثقافتی وفد ہندوستان گیا تھا۔ اس میں بھی میں نے پاکستانی ادب و موسیقی کی نمائندگی کرنے کا فخر حاصل کیا۔ لسانی، ادبی، اور موسیقی کے مذاکرات میں، مغربی اور مشرقی پاکستان دونوں جگہ، مجھے شریک ہونے کا موقع اکثر دیا جاتا ہے۔ میں اسے نہ صرف اپنے لئے باعثِ عزّت سمجھتا ہوں بلکہ اپنی قوم اور اپنے ملک کی خدمت حتی المقدور ان ذرائع سے کرنا اپنا فرض اور اپنے لئے سعادت سمجھتا ہوں۔

میری ساری عمر ادب اور ادیبوں کی خدمت کرتے گزری۔ ۱۹۵۹ء کے اوائل

ناراض ہوتے کہ یہ کیا بیہودہ شوق لگ گیا ہے! میں خود بھی کبھی کبھی سوچتا تھا کہ موسیقی، اور وہ بھی کلاسیکی موسیقی سے آخر حاصل کیا ہوگا؟ اب اندازہ ہوتا ہے کہ اگر میرے پاس یہ موسیقی کا علم و فن نہ ہوتا تو خدا جانے یہاں میرا حشر کیا ہوتا۔ ہاں تو ۱۹۳۶ء سے آل انڈیا ریڈیو کے کئی اسٹیشنوں سے کلاسیکی موسیقی نشر بھی کرنی شروع کر دی تھی مگر ایس۔ احمد کے نام سے۔ پاکستان آنے کے بعد یہ راز بھی راز نہ رہا۔ ع

کجا ماند آں رازے کزو سازند محفلہا؟

اب ہمارا شمار ادب کے علاوہ موسیقی کے اُستادوں میں بھی ہوتا ہے ع

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا!

میری زندگی کے دو پہلو ہیں: ادب اور موسیقی۔ میں خوش ہوں کہ میں نے اپنی دونوں کے علم و فن کی بُری بھلی خدمت کی اور خدا کے فضل سے نیک نامی کے ساتھ۔ اسی خدمت کی بُنیاد پر سیٹو نے جب اپنے ممبر ملکوں کے لئے گشتی مقررین کی اسکیم منظور کی تو پاکستان کے دانشوروں میں سے سب سے پہلے مجھے ۱۹۵۸ء میں مُنتخب کیا کہ تھائی لینڈ اور فلی پینز میں پاکستان کے کلچر پر ان ملکوں کے مشہور اداروں اور شہروں میں لکچر دوں۔ مجھے اس پر فخر ہے کہ میں نے اس خدمت کو انجام دے کر اپنے ملک کی تہذیب و ثقافت سے دُور اُفتادہ مُلکوں کو مُتعارف کیا۔ ۱۹۶۱ء میں خیرسگالی کا ایک ثقافتی وفد ہندوستان گیا تھا۔ اس میں بھی میں نے پاکستانی ادب و موسیقی کی نمائندگی کرنے کا فخر حاصل کیا۔ لسانی، ادبی، اور موسیقی کے مذاکرات میں، مغربی اور مشرقی پاکستان دونوں جگہ، مجھے شریک ہونے کا موقع اکثر دیا جاتا ہے۔ میں اسے نہ صرف اپنے لئے باعثِ عزت سمجھتا ہوں بلکہ اپنی قوم اور اپنے مُلک کی خدمت حتی المقدور ان ذرائع سے کرنا اپنا فرض اور اپنے لئے سعادت سمجھتا ہوں۔

میری ساری عمر ادب اور ادیبوں کی خدمت کرتے گزری۔ ۱۹۵۹ء کے اوائل

میں جن آٹھ ادیبوں نے پاکستان رائٹرز گلڈ کا سنگِ بُنیاد رکھا اُن میں سے ایک میں بھی ہوں۔ بلکہ مجھے کنونشن کے داعی اور صدر ہونے کی عزت بھی حاصل ہوئی۔

بیت گئی، تھوڑی رہی۔ اللہ توفیق دے کہ بقیہ عمر بھی اسی طرح بسر ہو جائے ع

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم